



دام لرو

پاکستان میں دہشت گردی کے پس منظر میں لکھا گیا ناول

PDFBOOKSFREE.PK

حفصہ ریحان



دام لہو

(پاکستان میں دہشت گردی کے پس منظر میں لکھا گیا ناول)

حفصہ ریحان

ناشر

پاکستان پوسٹ فاؤنڈیشن، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

اشاعت	۶
کتاب	دام ابو
مصنف	حفصہ رحمان
قیمت	روپے
مطبع	پاکستان پوسٹ فاؤنڈیشن، اسلام آباد

پیش لفظ

پشاور میں رہتے ہوئے اور دہشت گردی کا ایک المناک دور دیکھنے اور پھر سانحہ پشاور کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دل و دماغ پہ صرف وہ نازک کلیاں ہی چھائی رہنے لگیں۔ سانحہ پشاور سے کافی عرصہ پہلے ہی لکھنے لکھانے کی طرف توجہ تھی اور مختلف میگزینز وغیرہ میں چھوٹی کہانیاں لکھ چکی تھی لیکن دسمبر کے واقعہ کے بعد دل میں ایک خواہش تھی کہ اس موضوع پر لکھوں۔ ایک طرف طب کی تعلیم کا تھکا دینے والا سفر اور دوسری طرف ماول نگاری۔

بقول حسرت موہانی وہی معاملہ یہاں بھی ہوا

ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی

ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ہمارا قومی حافظہ کمزور ہے اور ہم اپنے اوپر گزرنے والے واقعات اور حوادث کو بلکہ احسانات کو بھی جلدی بھلا دیتے ہیں۔ بھلا دینا الگ بات، ہم ان سے سیکھتے بھی نہیں اور غلطیوں کو دہراتے پھرتے ہیں۔ میں وہ لڑکی ہوں جس نے اپنے سامنے کئی جوانوں کو بم دھماکوں اور دہشت گردی کی نظر ہوتے دیکھا اور میرا یقین کیجئے کہ دنیا میں اس سے زیادہ تکلیف دہ منظر کوئی ہو ہی نہیں سکتا جب ایک باپ اپنی بچہیں سال کی محنت کو کاندھے پر اٹھا کر قبرستان کا رخ کرتا ہے، جب ایک ماں اتنی تکلیف سے جنم دینے اور راتوں کو جاگ جاگ کر پالنے کے بعد اپنے لخت جگر کے بے جان جسم کو ہاتھ لگاتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی آسمان گر پڑے گا۔ جیسے اس ماں کی روح بھی، ساتھ ہی پرواز کر جائے گی۔ ہمارا دین اس دنیا کا سب سے بہترین دین ہے اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے جب اس خوبصورت اور پر امن دین کے

نام پر قتل و غارت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس ماول میں سانچہ آر می پبلک سکول اور اس کے کچھ کرداروں کی زندگی کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے کوشش کی ہے کہ دہشت گردی کا وہ پہلو بھی سامنے لے کر آوں جس کو بنیاد بنا کر باہر کی دنیا ہمارے مذہب کو برا سمجھتی ہے۔ نہ ہم بُرے ہیں نہ ہمارا مذہب اسلام بُرا ہے۔ بس بُرائی وہاں ہے جہاں مذہب کا نام استعمال کر کے اپنے ذاتی مفادات حاصل کئے جائیں۔ دسمبر ہم سب کے لئے قیامت صغریٰ تھی۔ اس دن ہمارے گھر نہ صرف اجڑے بلکہ ہمارا مستقبل بھی داؤ پہ لگا۔ جس قوم کے بچے، اپنے اساتذہ سمیت ایک ہی دن میں شہید کر دیئے جائیں وہ قوم کچھ بھی کر سکتی ہے لیکن اس سیاہ ترین دن کو بھلا نہیں سکتی۔ ہماری ماؤں کی آہ و بکا اور ان آنسوؤں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر کوئی قوم ایسا کرتی ہے تو پھر وہ قوم دنیا میں کوئی مقام تو کیا نام رکھنے کا بھی حق نہیں رکھتی۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر وسائل کی کمی کے باوجود قلم اٹھایا اور دام لہو کی تحریر کا آغاز کیا۔ کچھ لوگوں نے عنوان پر اعتراض کیا لیکن میں اتنا ہی کہوں گی کہ جہاں بے گناہ معصوم خون بہتا ہے وہاں عنوان دام لہو ہی رکھا جانا چاہئے۔ لکھنا بظاہر آسان مگر اصلاً بہت جان فشانی اور احتیاط کا متقاضی کام ہے اور پھر یہ موضوع جس پر قلم اٹھایا میرے جیسی نوجوان ماول نگار کے لئے یہ مشکل ترین عمل ثابت ہوا۔ اس ماول کے لکھنے میں مجھے دو سال کا عرصہ لگا اور اس موضوع پر لکھنے کے لئے یہ وقت بالکل زیادہ نہیں ہے۔ میں جہاں گئی اور جن والدین سے ملی مجھے ایسا لگا کہ ان کی کہانی لکھنی ضروری ہے۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتی کہ میں نے ساری کہانی حقیقت لکھی ہے لیکن اتنا یقین آپ کو ضرور دلا سکتی ہوں کہ میرے کردار آپ کو یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ آپ کوئی فکشن پڑھ رہے ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرے کردار وہی کردار ہیں جو ہمارے حقیقی ہیرو ہیں۔ وہ کردار جنہوں نے اس وطن اور اس وطن کے بایسویں سے محبت کی۔ میرے لئے ان سب کرداروں کو لکھنا بہت مشکل تھا اس لئے کہ جب آپ کسی کردار کو لکھتے ہوئے اس سے محبت کر بیٹھتے ہیں تو کہانی ختم ہونے پر دکھ ہوتا ہے اور اتنا میں یقین دلاتی ہوں کہ میرے کرداروں کو پڑھتے ہوئے میرا برقاری ان سے محبت کرے گا۔

یوں تو ہماری پوری قوم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ مل کر لڑی ہے۔ مگر میں اپنے قومی اداروں جن میں بالخصوص مسلح افواج، فرنٹیئر کور، رینجرز، پولیس اور اٹلی جنس کے ادارے شامل ہیں، کے

شہداء کا ناموں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں۔ ہم آئے دن یہ خبریں دیکھتے اور پڑھتے ہیں کہ پاکستانی فوج کے اتنے آفیسر زاور جوان دہشت گردی کی جنگ میں شہید ہو گئے ہیں۔ یوں تو یہ ایک خبر ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے بہت سی کہانیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ہمارے بہادر سپاہیوں اور ان کی فیملیز نے ہماری آزادی اور سلامتی کے لئے لہو کا بہت بڑا خراج دیا ہے۔ یہ چوڑے چکے سینوں والے، منہ بوط ارادوں کے حامل فرض کی راہ میں مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگانے والے ہی ہمارے قومی ہیروز ہیں۔ ان کی شہادتیں اور قربانیاں ہمارے آج اور کل کے تحفظ کی علامتیں اور ضمانتیں ہیں۔

لکھنے کے بعد پابشنگ کا عمل اس سے زیادہ محنت طلب اور مشکل تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ ایک نئے آنے والے لکھاری کا ہونا ہے۔ بہت سے مواقع پر حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے لیکن پھر اللہ کچھ نہ کچھ بہترین اسباب بھی فراہم کر دیتا ہے اور آج الحمد للہ میرا ناول شائع ہونے جا رہا ہے۔

مجھے امید ہے ہم اپنی ماضی سے سیکھ کر اپنے مستقبل کو تباہ بنانے کی سعی کریں گے۔ اپنے شہیدوں کے خون کو بھلانا ہمارے لئے موت کا پروانہ بن سکتا ہے۔ قوموں کی آبیاری جب خون سے کی جائے تو پھر قوموں پر وا جب ہوتا ہے کہ اسے تناور درخت بنائے۔

ہمارا خون بھی شامل ہے، تڑپیں گلستان میں

ہمیں بھی یاد کر لینا، چمن میں جب بہار آئے

اللہ سے دعا ہے ہمیں من حیث القوم اخلاقی، معاشی اور معاشرتی بلندیوں پر پہنچائے اور ہم نوجوانوں کو اس قوم کا مستقبل تباہ بنانے کی ہمت دے تاکہ ہم خود کو ناقابلِ تسخیر بنا سکیں۔

آپ سب کی دعاؤں کی طلبگار

ڈاکٹر حفصہ ربیعان

خیبر گریڈ میڈیکل کالج پشاور

جنوری ۲۰۱۸

دام لہو اور اردو ناول نگاری

ناول کی صنف اردو میں انگریزی زبان سے آئی۔ اردو میں پہلا ناول نذیر احمد کے *مراۃ العروس* کو قرار دیا گیا جو اصلاح حوال پر مبنی تھا۔ اس کے بعد اردو میں جس ناول نے دھوم مچائی۔ وہ *مراۃ جان ادا* تھا جو ایک طوائف کی کہانی تھی۔ یہ بھی سماج کے اس تاریک رخ پر قاری کو دعوت فکر دیتا تھا۔ اسی دوران مولوی عبدالعلیم شرر کو تاریخی ناول نگار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جس کے بعد اردو میں معاشرے کی دیگر کہانیوں کو ناول کے روپ میں ڈھال کر پیش کیا جانے لگا۔ ناول زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ یعنی ناول کی کہانی انسانی معاشرے کا عکس پیش کرتی ہے۔ چنانچہ اس تعریف کے تحت فارمولہ داستانوں کی جگہ ناول نے بڑی آسانی سے لے لی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو میں ناولوں کی اکثریت خواتین ناول نگاروں کی رہیں منت ہے مگر آگ کا دریا اور را جا گدھ، ٹیرھی لکیر اور دشت سوس کو چھوڑ کر خواتین کے حوالے سے کسی بڑے ناول کا ذکر نہیں ملتا۔ جس کی وجہا قدین نے خواتین کے محدود مشاہدہ اور تجزیاتی کوشش کا فقدان قرار دیا ہے۔ ان کی واقعیت نگاری پر جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ شاید یہی باعث ہے کہ ہماری خواتین ناول نگاروں نے زیادہ تر بند دروازوں کے پیچھے جنم لینے والی کہانیوں اور واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں محبت کی ٹکون بار بار، چولے بدل بدل کر سامنے آتی ہے۔ انسانی سوشل جذبوں اور رشتوں کے درمیان پائی جانے والی کشش، ذہنی کشش اور خاندانی چپقلش یا رنجشوں کا، محبت کی کہانیوں پر اثر انداز ہونے کا بیان زیادہ ملتا ہے۔

میرے پیش نظر ناول دام لہو کے چند ابواب ہیں جن کا میں ابھی مطالعہ کر کے لکھنے بیٹھا ہوں۔ ناول کے نام میں لفظ دام ذو معنی ہونے کے باعث دلکش اور تجسس آفریں ہے۔ دام کہ جس کے ایک معنی قیمت اور دوسرے معنی جال کے ہیں۔ ناول کے نفس مضمون کے اول الذکر معانی زیادہ صادق آتے ہیں۔ کیونکہ خود کش بمباروں کا لہو کہیں جنت کا لالچ دے کر خرید گیا تو کہیں غربت کے مارے والدین سے براہ راست ان کے یکے از پسران کا سودا کر لیا گیا۔ دام لہو کی ترکیب لہو کے جال کی تمہید بھی پیش کرتی ہے۔ وہ لہو جس کے جال میں انسانی جسم محصور ہے۔ خود کش بمباری کا میاب کاوش اس جسم کو دام لہو سے آزاد کر دیتی ہے۔ بہر حال ہر دو مغاہیم کے اعتبار سے یہ نام اس ناول پر موزوں آتا ہے۔ یہ ناول پاکستان

میں پچھلی صدی کی آخری دہائی سے شروع ہونے والی مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی، خاص طور پر جنت نظیر سوات وادی پر طالبانی استبداد کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ناول بھی ایک خاتون کے مؤقلم کا شاہکار ہے۔ میری معلومات کے مطابق حفصہ رحمان کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ جس کا اظہار ناول کے منظر نامے کی ہنت سے بار بار ہوتا ہے۔ حفصہ نے اس ناول کی کہانی کا انداز قلمی سکرپٹ کے انداز میں کیا ہے۔ شاید ان کے ذہن میں پلاٹ کی تشکیل کے وقت اس کو ڈراما نے کا خیال بھی پیش نظر رہا ہو۔ اسی لئے ناول میں ایک ہی وقت میں باری باری مختلف کرداروں کی تخلیق اور تعارف کے ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ یہ وہ چھوٹی چھوٹی نہریں ہیں جنہیں بالآخر اپنے بہاؤ کی مجبوری کے باعث ایک ہی دریا میں گرنا ہے۔ جن کی بدولت ڈاکٹر شکیل کا کردار جو شکیل آفریدی کی یاد دلانا ہے۔ مصنفہ نے ان حالات کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت بہت سے مجاہد اللہ اور شکیل شکار کر کے اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں نے بڑی آسانی سے اپنے گناہوں نے مقاصد کی تکمیل کی۔ اس ناول میں سماجی اور معاشرتی حوالے سے مختلف طبقات کے جذبوں اور مقاصد حیات کو بھی ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمن کس طرح معصوم اور محب الوطن نوجوانوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں اور اس آسانی کی وجہ ہماری معاشرتی زندگی کا مذہبی اور معاشی پہلو ہے جس کے باعث ہمارے نوجوان کبھی مجاہد اللہ اور کبھی شکیل بن کر اس دہشت گردی کا اہم نم بن جاتے ہیں۔ ناول نگار نے بڑے خوبصورت اور دلپذیر انداز میں اپنے عہد کی تاریخ کا نقشہ کھینچ کر اسے آنے والی نسلوں کے لیے ماضی کے ایک انتخاب اور سبق آموز کہانی کے طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ اس ناول کے مطالعے کے دوران مجھے مصنفہ کی جس تکنیک نے زیادہ متاثر کیا وہ ہے ان کی واقعاتی حقیقت اور حقیقت نگاری۔ ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے الگ الگ ابواب کا قیام ہر چند بعض موقعوں پر قاری کی توجہ کو تقسیم یا یکسوئی کو متاثر کرتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ اپنے قاری کو واقعات کے ساتھ ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب ہے۔ بہتر ہونا کہ ایک ساتھ مختلف خاندانوں کے تعارف اور ان کی تفصیل کو ایک دو ابواب میں سمو دیا جاتا۔ اس سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا۔ بہر حال اس پہلو کو اگر ہم نظر انداز کر دیں تو بھی اس ناول کا لکھا جانا اپنے تئیں ایک اہم واقعہ ہے۔ جیسا کہ شروع میں ہم نے کہا کہ شاید مصنفہ کے ذہن میں یا لاشعور میں کہیں اس ناول کے ڈرامائے جانے یا فلمائے جانے کی خواہش رہی ہو۔ لیکن یہ بات بہت خوش آئند اور ناول کے مجموعی تاثر کے لیے بہت مثبت و موثر ہے کہ واقعات کو آگے بڑھانے کے لیے ڈراما کی صنف سے مدد نہیں لی گئی۔ بلکہ ایک متوازن رفتار کے ساتھ کہانی آگے اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتی ہے۔ وہ بات کو گھما پھرا کر بیان کرنے کے بجائے حقائق کو جن سے کہ قاری بھی آشنا ہے، ان کا بیان اس سادگی سے کرتی ہیں کہ واقعات میں

تحرك اور كرداروں میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مصنفہ کا تعلق اسی علاقے سے ہے اور انھیں بات کہنا بھی آتی ہے۔ اس لیے اپنے زمان و مکان کے حوالے سے، رونما ہونے والے اس سانحے کی تصویر کشی بھی انھی کا فریضہ تھی۔ جسے مصنفہ نے بہت احسن طریقے سے ادا کیا ہے۔ تحریر کے تمہیدی پیرے میں جو میں نے ناقدین کی اس رائے کا ذکر کیا تھا جس کے مطابق خواتین کے محدود مشاہدہ اور تجرباتی کوشش کا فقدان ان کے اچھا ناول نگار ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ان کی واقعیت نگاری پر جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سلگتے ہوئے موضوع زماں پر لکھا گیا، حفصہ ریحان کا یہ ناول كردار و واقعات فرضی ہونے کے باوجود زمینی حقائق، مشاہدات اور تجربات کی گہری آمیزش سے متصف ہے۔ جو ناول نگار کا قابل ذکر ہنر اور ناول کی قابل بیان خوبی ہے۔ اس جرأت آمیز کاوش پر مصنفہ تحسین و آفرین کی حقدار ہیں۔ امید ہے کہ اس ناول کو خیر پختون خواہ کے علاوہ پاکستان بھر سے بہت سے قاری میسر آئیں گے۔

محمد ظہیر پور
ناول نگار، ماہر تعلیم
مقام دوست، لاہور

حفصہ ریحان کا دام لہو

حفصہ ریحان صاحبہ کا دام لہو کا میں مستقل قاری ہوں۔ افواج پاکستان کے ترجمان ہلال میگزین میں بڑی باقاعدگی سے اسے پڑھتا رہا ہوں، یہ بہت ہی زندہ تحریر ہے جو زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا محور انسانی حیات، سکون اور امن ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مفہوم اس تحریر کی اضافی خوبی ہے۔

دام لہو ایک فرد یا گھر کا نہیں پورے معاشرے کا نوحہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی خیال امن اور بھائی چارہ ہے، محبت اور خلوص کی سبیل ہے، خارزار حیات کو جنتِ نظیر سے بدل دینے کا عزم بھی۔ زیرِ نظر دام لہو کی مصنفہ حفصہ ریحان کا تعلق اس علاقے سے ہے جو براہِ راست دہشت گردی کے گرداب میں ہے۔ اس حوالے سے یہ ایک مشاہداتی تحریر ہے۔ تجربات اور حقائق کی آمیزش سے جنم لینے والی ایک ایسی کہانی ہے جس میں بڑی مہارت سے اور سادہ لفظوں میں آزادی جیسی نعمت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے باور کرایا گیا ہے کہ آزادیاں ثیرات میں نہیں ملتیں اور دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے والوں کی فکر اور سوچ بھی اپنی نہیں رہتی اور نہ ہی خود پر اختیار رہتا ہے۔ مثلاً ”وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن جتنی جلدی وہ جانا چاہ رہا تھا اتنی ہی اسے دیر ہو گئی تھی۔ وہ ہمز دور تھا اور مزدور اپنے فیصلے خود کہاں کرتا ہے۔ اس کی قسمت تو مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔“ ناول نگار کا مرکزی خیال کچھ یوں ہے کہ کس طرح نوجوان نسل کی برین واشنگ کر کے انہیں ملک اور قوم کے خلاف استعمال کرنے کی سازشیں کی جاتی ہیں جن کا تدارک کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔

جبار مرزا

صحافی، دانشور

اسلام آباد

دامِ لہو۔ ایک اہم موضوع پر لکھا گیا ناول

ناول 'دامِ لہو' حفصہ ریحان کی پہلی تصنیف ہے۔ انہوں نے اس ناول کے ذریعے دہشت گردی کے لئے نوجوانوں کو ورغلانے سے متعلق معاملے پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح سے بعض ملک دشمن عناصر مذہب کے نام پر نوجوان نسل کو انتہا پسندی کی جانب مائل کر کے انہیں اپنی ہی قوم اور وطن کے خلاف استعمال کرنے میں ملوث ہیں۔ یقیناً وہ مدارس اور تعلیمی ادارے جو خالصتاً مذہبی اور دینی تعلیمات دیتے ہیں، ان کی کاوشیں لائق تحسین ہیں، لیکن ایسے لوگ جو مذہب کی بنیاد پر دشمن کے آلہ کار بنتے ہیں ان کی نہ صرف نشاندہی ضروری ہے بلکہ عوام الناس کو بھی آگہی پہنچانا لازمی ہے تاکہ وہ خود اور ان کے بچے ایسے عناصر کا آلہ کار نہ بنیں۔

میں حفصہ ریحان کو ان کے ناول کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس تصنیف کے ذریعے انتہائی اہمیت کے حامل موضوع کو چننا اور لوگوں میں شعور پیدا کرنے میں کردار ادا کیا ہے، جو یقیناً قابل تعریف ہے۔ میری دعا ہے وہ آئندہ بھی ایسے قومی اور ملی موضوعات پر قلم اٹھاتی رہیں۔

یوسف عالمگیرین

مصنف، کالم نگار

راولپنڈی

کدھر کھوئے ہو مجاہد؟ حیدر نے پیچھے سے آکر پوچھا۔
ادھر ہی تو بیٹھا ہوا ہوں۔ اسنے مڑے بغیر جواب دیا۔
گھر میں سب کیسے تھے؟؟؟
گھر؟؟؟ اسنے حیرانگی سے حیدر کی طرف دیکھا۔
ہاں یا رگھر۔ تم گھر گئے تھے، آج پانچ دن بعد ہی تو آئے ہو۔ حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔
ہا۔۔۔ ہاں ہاں گھر گیا تھا میں۔۔۔ وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔
تو وہی پوچھ رہا ہوں، ماکہ گھر میں سب کیسے ہیں؟
سب ٹھیک تھے۔۔۔ ہاں ہاں سب ٹھیک تھے۔۔۔ وہ ٹھنڈے موسم میں بھی ماتھے سے پسینہ ہٹاتے ہوئے بولا۔

تمہیں کیا ہوا ہے مجاہد؟ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟
میں؟؟؟ نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ وہ بہت مشکل سے بولا۔
تم بتائے بغیر چلے گئے تھے اور وہ بھی رات کو۔۔۔ گھر میں خیریت تھی ماف؟؟؟ حیدر کو بھی اسکا رویہ پریشان کر رہا تھا۔ اسلئے وہ ادھر ادھر سے سوالات پوچھتا رہا۔
ہاں میں کہہ رہا ہوں، ماکہ سب خیریت تھی۔۔۔ بس میں ویسے ہی گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا غصہ آیا۔
اب تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں تھوڑی دیر میں آ جاؤنگا۔
لیکن کیوں یار؟؟؟ تم بھی چلو نامیرے ساتھ۔۔۔ ناشتے کا وقت بھی ہونے والا ہے۔۔۔ حیدر سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ لیکن وہ بتا نہیں رہا تھا
ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ بس تم جاؤ۔ میں ناشتے کے لیے آ جاؤنگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیدر اسکی پریشانی کے بارے میں اس سے کچھ پوچھے۔

اچھا ٹھیک ہے۔ حیدر جانے کیلئے اٹھ گیا۔ لیکن وہ جان چکا تھا کہ کوئی نہ کوئی پریشانی ضرور ہے لیکن یہ بات مجاہد کے لیے اطمینان کا باعث ضرور تھی۔ حیدر ناراض ہی سہی لیکن وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

اس نا حدنگاہ پھیلے ہوئے میدان کے اس کونے میں وہی ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا جس پر اس وقت وہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ اسکی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک تھی۔ لیکن آج وہ پانچ دن بعد یہاں آکر بیٹھا تھا۔ اور سب کی نظر میں وہ پانچ دن اپنے گھر گزرا کر آیا تھا پر یہ صرف وہی جانتا تھا کہ وہ پانچ دن کہاں گزرا کر آیا ہے لیکن ایک قفل تھا جو اسکی زبان پر لگا دیا گیا تھا۔ بہت بے بس کر دیا گیا تھا اسے۔ بے بسی کی

ایسی سلاخیں تھی جسکے پا ر ایک تہا ہی تھی۔ ہولناک تہا ہی۔ اسکے اپنے خاندان کے گیارہ افراد کی تہا ہی۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں یادوں کے دریچے وا ہوئے۔۔۔۔۔

وہ آج جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن جتنی جلدی وہ جانا چاہ رہا تھا اتنی ہی اسے دیر ہو گئی تھی۔ وہ مزدور تھا اور مزدور اپنے فیصلے خود کہاں کرتا ہے۔ اس کی قسمت تو مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ گھر پہنچ چکا تھا اور جانتا تھا کہ جیلہ اسی کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کیونکہ اس گھر کا چولہا فضل کی کمائی سے ہی چلتا تھا اور جس دن اسے کام نہ ملتا اس دن جیلہ بی بی کے لیے گھر کا چولہا جلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ظفر کے ابا!! رات کو جب وہ لوگ سونے کے لیے لیٹے تو اس نے جیلہ کی آواز سنی۔

کسا ہوا؟

میرا دل کرتا ہے کہ اس بار اللہ ہمیں بھی ایک میٹھ دے دے۔ چار بیٹوں کے بعد اب میرا بہت دل کرتا ہے کہ ہماری بھی ایک میٹھ ہو۔ اسکے لہجے میں ایک خواہش تھی میرا بھی۔ فضل آہستہ سے بولا

چار بیٹوں کے بعد اس بارجیلہ کے امید سے ہونے پر فضل بھی کہیں دل کے کسی کونے میں بیٹھ کی خواہش جگا بیٹھا تھا لیکن اس نے جیلہ سے اظہار نہیں کیا تھا پر آج جیلہ نے اس کے دل کی بات کر دی تھی۔

اللہ نے چاہا تو اس بار ہمیں ضرور میٹھ دے گا۔۔۔ جیلہ نے اپنی خواہش کو الفاظ کا روپ دیا اور اگر میٹھ نہ ہوئی تو؟؟؟ فضل نے بغیر کسی وجہ کے پوچھ لیا۔

تو مجھے اللہ کے کاموں میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں کون ہوتی ہوں اللہ کے کام کے بارے میں بولنے والی۔ اللہ جس کو جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔۔۔ وہ روانی سے بولی۔

اور وہ عورت ایک بار پھر اسے حیران کر گئی تھی۔ وہ عورت اکثر ہی اس کو حیران کر دیا کرتی تھی۔ عورت ہی تو تھی وہ اور عورت ہمیشہ حیران ہی کرتی ہے۔

ان دونوں کا ساتھ تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں کوئی بہت ہی زیادہ خوشگوار زندگی گزار رہے تھے لیکن اپنی زندگی میں ناخوش بھی نہیں تھے اور ویسے بھی خوشی کا تعلق دولت سے کہاں ہوتا ہے۔ ایک یہی توجہ دے جس میں غریب امیر سے زیادہ امیر ہے۔

پندرہ سال کے عرصے میں اللہ نے ان دونوں کو جانچ دیے۔ تمہارا اتفاق یا خوش قسمتی یا پھر

بدقسمتی سے وہ دونوں ابھی تک اللہ کی رحمت سے محروم تھے اگرچہ نعمت سے اللہ نے انکو خوب نوازا تھا اور اس بار امید سے ہونے پر جہاں جیلہ بی بی کے دل میں بیٹی کی خواہش جاگ اٹھی تھی وہاں فضل بھی چکے سے یہی دعا کر رہا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاپا آپ کب آئیں گے؟؟ مجھے آپ کی بہت یاد آ رہی ہے۔ وہ معصوم بچہ فون پر اپنے باپ سے پوچھ رہا تھا۔

بیٹا پاپا اتنی جلدی تو نہیں آ سکتے نا۔ ابھی ڈیڑھ مہینے پہلے ہی تو پاپا مل کر آئیں ہیں آپ سے۔ وہ اسے بہلاتے ہوئے بولے

لیکن پاپا میں آپکو مس کرتا ہوں۔ وہ معصوم لہجے میں بولا۔

تو یہ تو اچھی بات ہے بیٹا کہ میرے بیٹے کو پاپا یاد آ رہے ہیں۔ وہ ہنوز اسے بہلاتے رہے۔
تو پھر آپ آتے کیوں نہیں؟

آؤنگا بیٹا بہت جلدی آؤنگا اور آکر بہت سارے دن اپنے بیٹے کے ساتھ گزاروں گا۔ اب خوش؟؟
نہیں پاپا یہ تو آپ ہر بار فون پر کہتے ہیں لیکن آتے نہیں ہیں آپ۔ وہ انہیں پچھلے وعدے یا ددلا رہا تھا جو وہ ہر بار اس سے کر رہی اسے بہلا پاتے تھے۔

نہیں بیٹا اب مجھے جیسے ہی چھٹی ملے گی پاپا آپکے پاس آجائیں گے اور بہت سارے دن بھی گزاریں گے۔

پرؤس پاپا؟؟

ہاں بیٹا پکا پرؤس۔۔

اوکے پاپا۔ یہ لیس مانوویٹ کر رہی ہیں ان سے بات کر لیں اور ماما کچن میں ہیں میں انہیں دے دوں گا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ظفر کے بابا! میں نے ایک بات سوچتی ہے۔

کیا؟

اگر اس بار ہمیں اللہ نے بیٹا دیا تو میں نے اس کو قاری اور لیس کی طرح بنانا ہے۔

کیا مطلب؟ وہ حیران ہوا

مطلب یہی نا کہ میں نے اس کو قاری اور لیس کے پاس بٹھانا ہے، وہ قاری بنے گا، عالم بنے گا۔ دین

کی باتیں بتائے گا اور دین پھیلائے گا کیا پتہ اللہ ہمیں ایسے ہی بخش دے۔
لیکن اس دن تو تم کہہ رہی تھی کہ اللہ ہمیں میٹ دے دے۔۔۔
چاہتی تو میں یہی ہوں لیکن اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ کیا پتا وہ بیٹا ہی دے دے۔
ہاں یہ تو ہے لیکن خیر یہ تو اللہ کی مرضی ہے وہ جس کو چاہتا ہے میٹ دیتا ہے اور جس کو چاہے
بیٹا۔ جو ہماری قسمت میں ہوگا ہمیں دے دے گا چلو اب سو جاؤ مجھے صبح کام پر بھی جانا ہے۔ فضل لیٹتے
ہوئے بولا
ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ وہ بھی لیٹ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
مدرسے میں ناشتے کی گھنٹی بج گئی جو اسے سوچوں کی دنیا سے کھینچ کر اذیت بھری حقیقی دنیا میں
لے آئیں۔ کتنی تلخ ہوتی ہیں ماضی کی یادیں۔۔۔
قاری ادریس جیسا بناؤ گی، دین پھیلائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے ذہن میں الفاظ گونجتے رہے جو کسی
دن ماں نے اسے یہ ساری باتیں سنائی تھیں۔۔۔
اسکے چہرے پر ایک اذیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔۔۔۔۔۔

فضل اور جیلہ بی بی کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑا نظفر گیارہ برس کا اس کے بعد امان اللہ
ساڑھے آٹھ برس کا پھر چھ برس کا وحید علی اور پھر تین برس کا اصغر علی۔۔۔۔۔
ہر غریب کی طرح فضل کا خاندان بھی اس کی آمدنی سے بڑھ کر تھا۔ وہ غریب تھا ہمز دور تھا شاید اسی
لیے۔ اور غریب لوگ بچے سوچ سمجھ کر کہاں پیدا کرتے ہیں۔
نظفر نے گیارہ برس کی عمر سے کام پر جانا شروع کر دیا۔ گھر میں بڑھتے ہوئے اخراجات نے اسے
سکول کو چھٹی جماعت میں خیر باد کہہ کر مز دوری کرنے پر مجبور کر لیا تھا۔ وہ بہت حساس اور فرنیچر دار بچہ تھا اسی
لیے باپ کی پریشانی اور گھر میں تنگی کو سمجھ گیا تھا اور ایک گیارہ سال کے بچے کی سمجھ کی مطابق اس نے یہی
فیصلہ کیا کہ وہ سکول چھوڑ کر کام کرنا شروع کر دے۔
وہ گیارہ برس کا بچہ بہت سمجھدار تھا۔ اپنے گھر میں پھیلی غربت نے اسے اپنی عمر سے زیادہ سمجھ
اور سنجیدگی دی تھی۔ اور غربت ہی تو انسان کو عقل اور سمجھ دیتی ہے ورنہ بنگلوں میں رہنے والے یوکیمرز کھیلنے
والے بچے سمجھ کو کیا سمجھ سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاپا آپ کل جلدی گھر آ جائیں۔ عمران باپ سے فرمائش کرنے لگا
کیوں جی؟ کوئی خاص بات؟ وہ اس اچانک فرمائش پر حیران ہوئے۔
بس ویسے ہی۔

لیکن پتہ تو چلے کہ جلدی کی فرمائش کیوں کی جارہی ہے۔
پاپا میں نے اور طوبیٰ نے پلان بنایا ہے کہ ہم سب کل گھومنے جائیں گے آپ کے ساتھ۔ وہ
اپنے پلان میں طوبیٰ کا نام شامل کرتے ہوئے بولا
لیکن یہ پلان بنا کب اور کس کس نے بنایا؟؟؟
پاپا میں نے اور طوبیٰ نے۔۔

اور طوبیٰ کب اتنی بڑی ہوگئی کہ وہ پلان بنانے لگی؟؟؟ وہ جانتے تھے کہ اس پلان میں طوبیٰ شامل
نہیں تھی۔ طوبیٰ کو تو وہ پلان بنا کر بتاتا تھا اور وہ خوش ہو جاتی تھی۔۔
ارے پاپا وہ تو بہت بڑی ہوگئی ہے، مجھ سے بھی زیادہ بڑی، یہ پلان اسی کا ہے۔
چلیں طوبیٰ سے ابھی پوچھ لیتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر ٹک کر رہے تھے حالانکہ جانتے تھے کہ گھومنے
پھرنے کا شوق عمران سے زیادہ کسی کو نہیں ہے۔
نہیں پاپا۔۔ اس سے مت پوچھیں۔
کیوں؟؟؟

پاپا وہ جھوٹ بولتی ہے۔
ہا ہا ہا۔۔ اچھا چلو بیٹا نہیں پوچھتے جیسی تم لوگوں کی مرضی۔۔
تو آپ کل جلدی آئیں گے؟؟؟ انکی آنکھوں میں خوشی تھی
کوشش کرونگا بیٹا۔۔
کوشش نہیں پاپا آپ نے ضرور آنا ہے۔
اور نہ آ سکا تو؟؟

تو پھر میں آپ سے ناراض ہو جاؤنگا۔
تم یا طوبیٰ؟؟؟؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے حیرت سے پوچھا
پاپا ہم دونوں۔۔۔

لیکن یہ پلان تو طوبیٰ کا ہے تو ناراض بھی اسے ہی ہونا چاہئے۔ وہ اسے پھنساتے ہوئے بولے۔
پاپا! میں آپ سے ناراض ہوں۔ وہ انکے ٹک کرنے پر منہ بناتے ہوئے بولا

باہا۔۔۔ اچھا اچھا نہیں تھک کرتا۔ آ جاؤنگا کل جلدی انشاء اللہ۔۔۔
یا ہوووووو۔۔۔۔۔ تھینک یو پاپا۔۔۔ میں ابھی جا کر طوبیٰ اور ماما کو بتاتا ہوں۔ وہ خوشی سے
چلاتے ہوئے بھاگا
اچھا سنو تو۔۔۔۔۔ انہوں نے پیچھے سے بلایا
بیٹا۔۔۔۔۔
عمران۔۔۔۔۔
لیکن وہ چاچکا تھا۔
گھومنے پھرنے کی خبر سن کر وہ کہاں رکنے والا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تائی وجیہ۔۔۔ سے بات کرنی ہے مجھے۔ آپ کی اجازت چاہتا ہوں؟؟ وہ ہر جھکائے دھیمی آواز میں
بولا۔

لیکن بیٹا ابھی تھکے نہیں ہو تم لوگ؟؟ نصرت چچی حیرانگی سے مسکرائی۔
نہیں امی اب تو رومی بھیا نہیں تھک سکتے۔۔۔۔۔ عیسیٰ نے باور چچانے کے اندر سے آواز لگائی۔ وہ
بڑے ابا کیلئے چائے بنا رہی تھی۔
تائی زیر لب مسکراتے ہوئے وجیہ کو بلانے چلی گئی جو ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے دہن کے ان بھاری
بھرم کپڑوں سے جان چھڑا کر لیٹ گئی تھی۔
صارم صحن میں جا کر میز کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سراج علی کے دو بیٹے اور ایک مینی تھی۔ بڑا سفیر علی اس سے چھوٹی فاخرہ اور سب سے
چھوٹا شیر علی۔ سراج علی کو باپ کی طرف سے ترکے میں کچھ زمیں ملی تھی جس پر کھیتی کر کے وہ اپنا اور بچوں
کا پیٹ پالتے تھے لیکن پھر ایک دن انکی اچانک وفات کے بعد اس خاندان پر معاش کے لحاظ سے کافی
مشکل وقت پڑا۔ سفیر اس وقت بارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت کے حالات میں اس نے اپنی
ماں کے مشورے سے ملک سے باہر جا کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ شیر علی کو آگے پڑھانا اس کا خواب
تھا اور ابھی فاخرہ کی شادی بھی کرنی تھی۔ اپنے باپ کے ایک واقف کار کے ذریعے ایک ایجنٹ سے بات
کی اور کچھ زمین بیچ کر روزانہ حاصل کر لیا۔ محنتی تو وہ تھا ہی۔ وہاں جا کر محنت کی تو گھر کے حالات بھی
سدھرنے لگے۔ شیر علی کی پڑھائی بھی چلتی رہی اور فاخرہ کا جہیز بھی جمع ہونا رہا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب
شیر علی نے اپنی پڑھائی مکمل کر لی اور اچھی نوکری بھی حاصل کر لی۔ اور پھر جب فاخرہ بھی عزت سے اپنے

گھر سدھا رہی تو فضیلت بیگم کو سیر کی بہن بھی گھر لانے کی فکر ہوئی۔ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ماں کی ضد کے سامنے اسکی چل نہ سکی اور غزالہ اسکی زندگی میں شامل ہو گئی۔ شادی کے دو مہینے بعد وہ قطر اپنے کام پر واپس چلے گئے۔ غزالہ ایک بہت اچھی بہو ثابت ہوئی تھی۔ اپنی ساس کو اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا لیکن یہ قسمت ہی کی بات تھی کہ اس شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی فضیلت بیگم کو بھی اللہ نے اپنے پاس بلا لیا۔ غزالہ کی گود میں اسوقت چھ ماہ کی بچی سمیٹھ موجود تھی۔ ماں کی تدفین پر آیا تو سدا کے دردمند سیر کو اپنے چھوٹے بھائی شیر علی کی فکر ہوئی کیوں کہ اس بار وہ غزالہ اور بچی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ کافی صلاح مشورے کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ شیر علی کی شادی غزالہ کی چھوٹی بہن زبیدہ سے کر دی جائے۔ شیر علی نے تو اپنے سارے فیصلے پہلے ہی اپنے باپ جیسے بڑے بھائی کے ہاتھ میں ٹھما دیے تھے اور یوں زبیدہ شیر علی کی زندگی میں شامل ہو گئی۔

سیر علی کو اللہ نے چار اولاد دیں دی تھی۔ سب سے بڑی سمیٹھ اسکے چار سال بعد وجہ پھر دو سال بعد ہاشم اور اسکے ڈیڑھ سال بعد ملیم۔ شیر علی کو اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ بڑا صارم اور ساڑھے چار سال بعد ریحان۔ اسکے بعد اللہ نے انہیں مزید اولاد نہیں دی۔۔

شیر علی کی شادی کے چار سال بعد دونوں بھائیوں نے رقم جمع کی اور مشترکہ طور پر شہر پشاور میں گھر کیلئے ایک پلاٹ لیا اور اس پر اچھا سا گھر بنا لیا۔ بچھے والے پورشن میں شیر علی اپنے بیوی بچوں سمیت رہنے لگا اور اوپر والا پورشن کرائے پر چڑھا دیا گیا۔

سیر علی باہر رہتے ہوئے بھی اپنے بھائی اور وطن سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ ہر سال دو سال بعد وہ اپنے بیوی بچوں سمیت مہینہ ڈیڑھ مہینہ پاکستان گزارنے آتا۔ اس عرصے میں یہ گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوتا۔ سارے بچے بھی بہت خوش ہوتے اور بھائی تو آپس میں اتنے خوش ہوتے جیسے برسوں بعد مل رہے ہوں۔

شادی کے تقریباً پندرہ سال بعد جب صارم ابھی چودہ سال کا تھا اور نويس جماعت میں پڑھ رہا تھا ایک دن باپ کے دفتر سے اسکے گھر پر فون آیا کہ شیر علی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور ہسپتال پہنچایا گیا ہے انہیں۔ وہ اپنی ماں کو لے کر بھاگا بھاگا ہسپتال گیا۔ وہاں اسکے باپ کے دوست بھی تھے۔ اسکا باپ

انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل تھا۔ وہ اور اسکی ماں وارڈ کے باہر رو کر اللہ سے شیر علی کی صحت کی دعائیں مانگتی رہے اور اندر ڈاکٹر اپنی کوشش کرتے رہے لیکن فرشتہ اللہ کی طرف سے کچھ اور زمرہ داری لے کر آیا تھا۔

اور پھر چار گھنٹے کے طویل اور جان لیوا انتظار کے بعد انہیں وہ خبر سنا دی گئی جس کو سننے کے لیے نہ کان تیار تھے اور نہ ہی روح راضی تھی۔

شیر علی کی تدفین پر سفیر اور غزالہ اپنے چاروں بچوں سمیت آئے تھے۔ ڈیڑھ مہینہ یہاں رہے اور پھر چلے گئے۔ حیدر اور غزالہ کا دل بالکل نہیں کر رہا تھا زبیدہ اور دو بچوں کو چھوڑ کر جانے کا لیکن وہاں کاروبار کا مسئلہ تھا سو انہیں جانا ہی پڑا۔ لیکن انہیں تھوڑا سا اطمینان صارم کی طرف سے تھا کہ اس چودہ سالہ بچے نے جس طرح اپنے آپ کو منبو ط بنا کر اپنی ماں کے حوصلوں کو بڑھایا تھا وہاں اطمینان تھا۔

آپ نے بلایا؟؟ وجہ یہ بھی آکر رینگ کے پاس کر آہستہ آواز میں بولی۔ اسکی آواز صارم کو سوچوں کی دنیا سے واپس کھینچ لائی۔

وہ کچھ دیر وجہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ہمیشہ سنجیدگی کی دبیز چادر اوڑھے کیپٹن صارم شیر علی کے چہرے پر مسکراہٹوں ہی کے بسیرے تھے آج۔

ہاں بلایا تھا لیکن تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی کہ میں نے ایک بار اپنی گزشتہ زندگی کو چھان مارا ہے اور بھول گیا ہوں کہ تم سے کیا کہنا تھا۔ وہ اسکی طرف دیکھتے مسکرا رہا تھا۔ وہ سمٹ گئی۔ بھلا صارم بھی کبھی ایسے مسکرا سکتا ہے۔ وہ سوچتی رہی لیکن کچھ بولی نہیں۔

وجہ یہ تم مجھ سے اتنی دور دور کیوں رہتی ہو؟؟

وجہ یہ نے ایک لمحے کو حیرانگی سے اسکی طرف دیکھا۔ یہ کیسا سوال تھا۔۔

میرا مطلب ہے کہ ریحان کے ساتھ تمھاری اچھی دوستی ہے لیکن مجھ سے تم ہمیشہ اکڑی اکڑی رہتی ہو۔۔ اسنے اپنی بات کی وضاحت دی۔

ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔۔ وہ بدستور پیچھے دیکھتی رہی۔

یہ نکاح واقعی تمھاری مرضی سے ہوا ہے؟؟؟

وہ ایک بار پھر اسکی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگی۔ یہ بھی کچھ عجیب سا سوال تھا۔ وہ خاموش رہی۔

وجہ یہ مجھے امی نے کہا تھا کہ تم سے رشتے کے بارے میں رضامندی لی گئی ہے اور تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ایک بار خود تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اس لیے اول تو میرا اور تمھارا سامنا کم ہی ہوا ہے اور جب ہوا بھی ہے تو کبھی تم نے سلام سے آگے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جب ہم سب گھر والے

ایک ساتھ بیٹھے ہوتے تھے تب بھی تم اکثر مجھے اگنور کر رہی ہوتی تھی۔ اکثر میری طرف سے رخ موڑ کر بیٹھ جاتی۔ ایسی ہی باتوں کے بعد مجھے لگا کہ تم شاید مجھے پسند نہیں کرتی۔ میں تمہیں پسند کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ تب سے کرتا ہوں جب ہم چھوٹے تھے اور تم لوگ تائی یا تائی کے ساتھ یہاں چھٹیوں میں آیا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نہ جب ابو اور تائی گاؤں جاتے تھے تو تم بہت رویا کرتی تھی اور تب میں تمہیں قریبی پارک میں اپنی سائیکل پر لے جایا کرتا تھا اور تمہیں وہاں جھولے دیا کرتا تھا۔ میری پسندیدگی تب کی ہے لیکن جب سے تم لوگ یہاں آئے ہو تمہارے رویے سے مجھے لگتا رہا کہ تم مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔ جب امی نے مجھے تمہاری رضامندی کے بارے میں بتایا تو مجھے لگا کہ تم سے پوچھے بغیر تائی نے ہاں کر دی ہوگی اس لیے میں نے امی سے ضد کی کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اور خود ایک بار پوچھنا چاہتا ہوں تم سے لیکن تائی نے ایسی کسی بات سے منع کر دیا تھا مجھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سب کچھ تمہاری رضامندی سے ہو رہا ہے اور ویسے بھی اس بات کا یقین تو مجھے اس لیے بھی تھا کہ تائی تم لوگوں سے اتنا پیار کرتے ہیں وہ زبردستی تو نہیں کریں گے تمہارے ساتھ لیکن پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتی تو۔۔۔۔۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھ سے مرضی پوچھی گئی تھی۔ وجہ۔۔۔ نے اسکی بات کاٹ کر کہا۔

اور تمہاری رضا سے ہوا ہمارا نکاح؟؟؟

جی۔۔۔ ایک لفظی جواب آیا۔ صادم کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ذخیرے مزید گہرے ہو گئے۔ اس نے ایک گہری سانس لی جیسے اسکے دل سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔ مسکراتا تو وہ اکثر تھا اور اسکی مسکراہٹ ہمیشہ اچھی بھی لگتی تھی لیکن آج مسکان کے ساتھ خوشی بھی جھلک رہی تھی۔

پھر میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھتی تھی کہ مجھے لگتا رہا کہ میں تمہیں نا پسند ہوں؟؟؟

ایسی کوئی بات نہیں ہے بس آپ ہر وقت سنجیدہ سے رہتے تھے اور باتیں بھی اتنی کم کرتے ہیں کہ میں آپ سے کیسے بات کرتی۔ ریمان تو بہت باتیں کرتا ہے بچپن سے ہی اس لیے اسکے ساتھ کافی دوستی ہے۔ اسنے اپنے رویے کی وضاحت دی جو صادم کو پریشان کر رہا تھا۔

باتیں کم کرتا ہوں تو اسکا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے اگنور ہی کر دیا جائے اور یا پھر میں کسی کو پسند نہیں کر سکتا۔

پسند؟؟؟؟ وہ حیران ہوئی

ہاں پسند۔۔۔۔۔ بلکہ صرف پسند نہیں شدید پسند یا پھر۔۔۔۔۔ وہ مسکرایا۔

آپ نے کبھی بتایا نہیں۔ وجہ۔۔۔ حیران ہو رہی تھی۔

صرف تمہیں نہیں بتایا۔ امی جانتی تھیں اور انہوں نے تانا یا تائی کو بھی بتایا تھا۔ ریحان بھی اکثر تمہارے حوالے سے ٹک کرنا تھا مجھے۔ اور تانا یا سے تو امی نے تب بات کی تھی جب تم لوگ یہاں شفٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ بات کچھ زیادہ اہم بات نہیں تھی۔ امی جانتی تھیں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن میں نے انہیں منع کیا تھا کہ کسی سے اس حوالے سے بات نہ کریں۔ اگر تانا یا سے بات کرنی بھی ہے تو وہ یہی کر دیں کہ جب تمہاری شادی کیلئے سوچا جائے اور اگر تم تانا یا تائی کی مرضی سے کرنا چاہو تو میرے حوالے سے بھی سوچا جائے۔ ایسا میں نے اسیلے کہا تھا کہ اگر تم کسی کو پسند کرو تو پھر میرے رشتے کو چھوڑ کر تمہاری مرضی کو دیکھا جائے۔ وجہ۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور جب بھی گزشتہ زندگی میں اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچا تو صرف تمہارے حوالے سے سوچا لیکن اسکا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم پر مجھے مسلط کر دیا جائے۔ تمہاری خوشی زیادہ اہم تھی۔۔۔ ہمیشہ اپنی زندگی میں مگن رہنے والا صارم شیر علی آج برملا اپنی پسند کا اظہار کر رہا تھا اور وہ دل کے کانوں سے سن رہی تھی۔ وہ مرد تھا تو برملا کہہ رہا تھا وہ تو لڑکی تھی کیسے بتاتی کہ اسکے احراز اور گریز کی وجہ صارم کیلئے اسکی پسندیدگی تھی۔ سنجیدگی کے خول میں لپٹا صارم کب اسکے دل میں اتر گیا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اسنے تو کبھی زیادہ باتیں بھی نہیں کی تھی اس سے۔ اور پھر وہ اسکی طرف سے صرف 'منہ موڑ کر بیٹھتی تھی' کان تو اسکی آواز پر ہی ہوتے تھے۔ اور اسکی پسنداتی پرانی نہیں تھی جتنی صارم کی تھی۔ دو سال پہلے ہی سفیر علی اپنا کاروبار وہاں سے ختم کر کے پاکستان واپس آ گئے تھے اور اسی گھر میں اوپر والے پورشن میں رہنے لگے تھے۔ سمیچہ کی شادی تو انہوں نے پہلے ہی اپنے دوست کے بیٹے سے کر دی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ابو-----

امی-----

نعمان-----

شاہو-----

اس کی چیخ و پکار پر باورچی خانے میں مصروف شاہدہ اور دونوں بچے نعمان اور شاہد بھاگتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ وہ سب جانتے تھے کہ آج اسکا آٹھویں کے امتحان کا نتیجہ آتا تھا۔ کیا ہوا بیٹا نتیجہ کیسا آیا؟؟ ماں نے جلدی سے پوچھا۔ جواب میں اس نے کچھ کہنے کی بجائے بھاگ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دی۔ اور شاہدہ سمجھ گئی کہ اس کا فیصلہ آج پھر اسے فخر دے گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پانی کے قطرے

جھللا نے لگے جسے اس نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ خوشی کے آنسو ہی تو تھے۔
وہ ایسا ہی تھا۔ ہر خوشی کے موقع پر کچھ کہے بغیر بھاگ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال لیتا تھا۔ آج
بھی اس نے یہی کیا۔ ماں سمجھ گئی تھی۔

بھیا اب بتا بھی دیں کہ رزلٹ کیسا آیا آپ کا؟؟؟
نخعی شائلہ نے معصوم آواز میں پوچھا۔

ارے شائلہ تمہارا بھیا فرسٹ آیا ہے۔۔۔ فیصل نے اسے اٹھا کر کول کول گھماتے ہوئے کہا۔۔
لوجی تو اس میں کوئی نئی بات ہے؟؟ آپ تو روزی فرسٹ آتے ہیں۔ نعمان منہ بناتے ہوئے بولا
لیکن امی بھیا تو فرسٹ آئے ہیں پھر آپ روکیوں رہی ہیں؟؟ نخعی شائلہ حیران ہوئی تھی کیوں کہ
آج تک اس نے کسی کو فرسٹ آنے پر روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اچھا تم دونوں جاؤ اندر۔ کھیلو جا کے۔ فیصل نے ان دونوں کو اندر بھیج دیا کیونکہ اس کے یا شائد
دونوں میں سے کسی کے پاس انکے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ کیونکہ سات سالہ نعمان اور پانچ سالہ شائلہ
خوشی کے آنسو نہیں جانتے تھے۔

شائلہ مجھے لگتا ہے کہ بھیا نے ہم سے جھوٹ بولا کہ وہ فرسٹ آئے ہیں اگر وہ فرسٹ آتے تو امی
کیا ایسے روتی؟؟ سات سالہ نعمان نے جیمز بانڈ کے ہیرو کی طرح کول کول آنکھیں ادھر ادھر گھماتے
ہوئے مشکوکانہ انداز میں کہا۔

ہاں مجھے بھی لگتا ہے کہ بھیا فیل ہو گئے ہیں اس لیے امی رو رہی تھی۔۔۔ شائلہ اپنی سمجھ کے مطابق
دور کی کوڑی لائی تھی۔

بس پھر تو مزا آئے گا۔ آج ابو آکر بھیا کو بھی بیٹیس گے جیسے مجھے روز مارتے ہیں۔ نعمان خوش
ہوتے ہوئے بولا۔

لیکن تم تو سکول نہیں جاتے ماں لیے تمہیں مار پڑتی ہے ابو سے۔ بھیا تو روز سکول جاتے ہیں۔
شائلہ کو اپنے بھیا کے بارے میں نعمان کی بات بری لگی تھی اور احتجاجاً اس نے کھیلنا بند کر دیا تھا اس
کے ساتھ۔

اور چھوٹا نعمان اس بات پر دل ہی دل میں خوش تھا کہ بھیا بھی آج ابو سے مار کھائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجاہد اللہ

مجاہد

حزہ نے اسے ہلایا۔ وہ جواتنی دیر سے سوچوں میں مگن تھا ایک دم سے جاگ اٹھا۔

ہن۔۔۔ ہاں کیا ہوا؟؟؟

مجھے تو کچھ نہیں ہوا لیکن تمہیں ضرور کچھ بڑا ہو گیا ہے۔ اتنی دیر سے ماشتہ تمہارے سامنے پڑا ہے اور پڑے پڑے ٹھنڈا بھی ہو گیا ہے اور تم ہو کہ پتا نہیں کہاں گم ہو۔۔۔۔۔

نہیں کچھ نہیں۔۔۔ میں کرتا ہوں ماشتہ۔۔۔ اور وہ ماشتہ کرنے لگا۔

مجاہد۔۔۔۔۔ اسنے آہستہ سے اسے پکارا۔ وہ سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھنے لگا

تم ٹھیک ہو؟؟؟

ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔

اچھا ٹھیک ہے۔

حزہ کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ ماشتہ کرتے ہوئے ایک بار پھر سوچنے لگا۔

حزہ کے منہ سے نکلنے والا نام مجاہد اسکی دماغ میں تیر کی طرح لگا تھا۔۔۔۔

ظفر کے ابا! رات سونے کیلئے لیٹتے ہوئے جمیلہ نے فضل سے کہا۔

ہمم۔۔۔۔۔

بچے کا نام کیا رکھیں گے؟؟؟

جو تمہاری مرضی ہو۔ مختصر سا جواب آیا۔

لیکن پہلے بچوں کے نام تو تم نے رکھے ہیں۔

تو ٹھیک ہے اس بچے کا نام تم رکھ لو۔ ویسے کچھ سوچا ہے تم نے؟؟؟ وہ الٹا اسی سے پوچھ بیٹھا تھا۔

ظفر کے ابا۔ مجھے تو رحمت اللہ نام بہت پسند ہے۔

ہمم۔۔۔۔۔ اچھا ہے۔ فضل کا جواب ایک بار پھر مختصر سا تھا۔

ہم نے اللہ سے مٹی کی دعا کی تھی کہ وہ ہمیں مٹی دے دے، اپنی رحمت دے دے ہمیں لیکن اللہ

نے ہمیں اگر بیٹا دے دیا ہے تو ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

ہاں ظاہر ہے بڑا شکر ہے اس ذات کا۔

اب اللہ انشاء اللہ اسی بچے کو ہمارے لیے رحمت بنائے گا۔

انشاء اللہ۔۔۔۔۔ ایک بار پھر مختصر جواب تھا۔

بچے بھی تو بہت خوش ہیں چھوٹے کو دیکھ کر۔ جمیلہ کا اثنا رہ ان دونوں کے باقی چار بچوں کی طرف

تھا جو اس وقت دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔
بُس ٹھیک ہے ہمارے بیٹے کا نام رحمت اللہ ہے۔۔ جیلہ نے مسرت سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

ٹھیک ہے۔ فضل نے بھی تائید کی۔۔۔
اور یوں اس کا نام رحمت اللہ رکھ دیا گیا۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تمہارا نام کیا ہے؟؟؟؟
سیف اللہ۔۔۔۔۔ اور تمہارا؟؟؟؟
مجاہد اللہ۔۔۔۔
کب سے ہو یہاں پر؟؟؟؟ اس نے پھر پوچھا۔۔
پچھلے دو مہینے سے۔ وہ مختصر سے جواب دیتا رہا۔
اچھا۔ دراصل مجھے بھی تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہنا ہے۔ منتظم نے مجھے اسی کمرے کا کہا ہے۔

تو ٹھیک ہے نا۔ رکھو اپنا سامان اور جب چار پائی آجائے تو لے لینا۔ وہ تو بہت غصے میں لگ رہا تھا پتا نہیں کیوں۔

اور کتنے لوگ ہیں اس کمرے میں؟؟؟ اس نے پھر پوچھا۔

تین۔۔۔۔۔۔۔

ہمم۔۔ تو مطلب چار لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ اس نے اپنے ساتھ ہی سرکوشی کی۔

مجھ سے کچھ کہا؟؟؟ سیف اللہ نے سراٹھا کر پوچھا۔ وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

نہیں نہیں۔۔ کچھ بھی نہیں کہا۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں جب تک میری چار پائی نہیں آ جاتی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

سیف اللہ نے کچھ کہنے کی بجائے اپنے پھیلے ہوئے ہیر سکیئر لیے۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

وہ کچھ کہے بغیر چار پائی پر پاؤں کی طرف بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کب منتظم آ کر اسے چار پائی لانے کے لیے بلاتا ہے۔ اسے کہا گیا تھا کہ اس کے لیے چار پائی کا انتظام کیا جا رہا ہے اور کچھ ہی دیر میں

اسے اطلاع کر دی جائے گی۔ پھر وہ آکر چار پائی اپنے کمرے میں لے جائے۔ اسے سب سے پہلا سبق یہ دیا گیا کہ یہاں پر اسے اپنے سارے کام خود کرنے پڑیں گے۔ وہ کسی سے کوئی سہارا نہیں مانگے گا۔

وہ جہاں سے آیا تھا یہی سب اس نے وہاں بھی سیکھا تھا اور اب تک اسے جن قواعد و قوانین کے بارے میں بتایا گیا وہ اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ اپنے سارے کام وہ پہلے سے ہی خود کرنے کا قائل تھا۔ اور کسی بھی کام کے لیے سہارا لینے کا بھی وہ قائل نہیں تھا۔ وہ انیس سال کا جوان لڑکا تھا۔ اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سنبھال سکتا تھا۔ صحت کے لحاظ سے بھی وہ ایک بھرپور جوان تھا۔

اس کے انتظار کا عرصہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ تقریباً دس منٹ ہی گزرے ہوئے کہ منتظم نے آکر اسے بتایا کہ وہ اپنے لیے چار پائی لے آئے۔ ان دس منٹ کے اندر اندر وہ سارے کمرے کا ایک بھرپور جائزہ لے چکا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے اپنی چار پائی کہاں رکھنی ہے۔ وہ اٹھ کر منتظم کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جو اسے عمارت کے پیچھے سے گھماتا ہوا ایک بڑے اور خالی کمرے میں لے آیا۔ وہاں پر کچھ چارپائیاں پڑی تھیں۔

ان میں سے ایک لے جاؤا اپنے کمرے میں۔ منتظم نے کہا۔
وہ چپ چاپ آگے بڑھا اور ایک چار پائی کو سیدھا کر کے اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔

کھانے کے وقت آجانا اور سکون سے رہنا اپنے کمرے میں۔ کوئی جھگڑا نہیں ہونا چاہیے اور یہ بھی یاد رکھو کہ بڑے مولانا صاحب آپس میں لڑائی جھگڑے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

ایک بار پھر اسے وہی باتیں سمجھائی جانے لگیں۔ لڑائی نہ کرنا تو اسے ایسے سمجھایا جاتا ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑا جھگڑالو ہے اور جھگڑا کرنا ہی اس کا پیشہ ہے۔ وہ جی بھر کے بد مزہ ہوا۔ کچھ بولا نہیں لیکن ناک بھوں چڑھا کر چار پائی اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ چار پائی اس نے اسی کونے میں رکھی جہاں اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ ویسے کمرے میں اس کے علاوہ چار پائی رکھنے کی اور کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ چار چارپائیاں پہلے سے کمرے میں موجود تھیں اور یہ پانچویں رکھنے کے بعد تو کمرے میں صرف اتنی جگہ رہ گئی جتنی ان پانچ چارپائیوں کے بیچ میں ضروری تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی جگہ نہیں بچی۔

بڑے مولانا صاحب کی ہدایات یہاں کتنی اہمیت رکھتی ہیں یہ اسے مدد سے کی دیوار کے اندر قدم رکھتے ہی پتہ چل گیا تھا۔ آج پہلی بار جب وہ مولوی ثناء اللہ سے ملا تو اسے کچھ اندازہ تو اس بات کا ہو گیا۔ ان کے کمرے سے نکل کر وہ جس جس سے ملا سب کی زبان سے کسی نہ کسی حوالے سے بڑے مولانا صاحب کا ذکر سن رہا۔ اسے پتہ چل گیا کہ یہاں پر سب بڑے مولانا صاحب سے کتنے متاثر ہیں۔

یقیناً وہ کوئی بہت ہی پیچی ہوئی بستی ہوگی جن سے سب اتنے متاثر ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔
اس نے کمرے کے کونے میں چار پائی پر چادر اور تکیہ بچھا دیا اور وہ لیٹ گیا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اتنا
سفر کر کے آیا تھا وہ آج۔۔۔ سیف اللہ ابھی تک وہی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس سے کوئی بات نہیں کی۔ پتا
نہیں وہ مصروف تھا یا اسے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا لیکن لگ تو بہت مصروف رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا تھا تو لیٹتے
ہی نیند کی وادی میں چلا گیا۔ نیند کا وہ شوقین تھا اور یہ اس کی فطرت تھی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے
اسے کندھے سے ہلایا۔

اٹھ جاؤ مجاہد جماعت کا وقت نکلا جا رہا ہے۔
وہ گہری نیند میں تھا۔ اسے تو سمجھ بھی نہیں آئی کہ کس نے اسے ہلایا ہے۔ اس نے کروٹ لے کر دوبارہ
آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اسے پھر کسی نے کندھے سے ہلایا اور اس بار پہلے سے زیادہ شدت
سے ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کہاں موجود ہے۔ وہ
آنکھیں مسلنے لگا۔ کچھ ساعت بعد جب حواس بحال ہوئے تو یہاں اپنا آنا یاد آ گیا۔
جلدی سے اٹھ جاؤ مجاہد۔ جماعت کھڑی ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے اور تم نے تو وضو بھی کرنا
ہے۔

کتنا وقت رہتا ہے؟؟؟؟؟ یہ اس نے اس لیے پوچھا کہ وہ ہمیشہ وضو وقت دیکھ کر کرتا تھا۔ اگر
جماعت میں وقت زیادہ ہوتا تھا تو وہ آرام سے کرتا۔ دوسری صورت میں وہ پانچ منٹ کے اندر بھی
تیار ہو جاتا تھا۔

بہت کم وقت ہے۔ شاید پانچ منٹ سے بھی کم۔ سیف اللہ نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔
وہ چھلانگ لگا کر بستر سے اتر آیا۔ کمرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اسے تو یہ
بھی نہیں پتا کہ نماز اس وسیع مدرسے میں کس جگہ پڑھی جائے گی۔
سیف اللہ۔۔۔۔۔ اس نے پیچھے سے ہلایا۔ وہ رک گیا۔
نماز کے لیے میں کس جگہ آؤں؟؟؟؟
وہ جو سامنے مینار نظر آ رہا ہے۔۔۔ اسی جگہ آنا۔

اس نے مینار کی طرف دیکھا۔ اسے مسجد کا مینار نظر آ گیا لیکن وہ آتے ہوئے مدرسے کے سامنے
والے دروازے سے آیا تھا اور یہ مسجد مدرسے کے پیچھے کی طرف بنی ہوئی تھی اس لیے آتے ہوئے اس
نے نہیں دیکھی تھی۔

جلدی سے آ جانا مجاہد۔ دیر کر دی اور بڑے مولانا صاحب کو پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہونگے۔۔۔ غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے آواز سنی۔

مجاہد۔۔۔۔۔؟؟؟؟؟ اور ایک مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اچھا نام تھا اس کا وہ جلدی سے کمروں کی قطار کے آخر میں بنے ہوئے غسل خانوں میں سے ایک میں گھس گیا اور چند لمحوں میں وہاں سے نکل کر پاس میں لگے ہوئے نلکے پر ہاتھ منہ دھویا اور جلدی سے مسجد کی طرف بھاگا۔

وہ مسجد میں داخل ہوا تو نماز کھڑی ہونے والی تھی۔ وہ بھی جلدی سے آخری صف میں کھڑا ہو

کتاب

_____مجاهد اللہ

اسنے آہستہ سے اپنا نام دہرایا اور ایک ٹھنڈی سانس لی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہاں ہاں کھینچ لو اور کھینچ لو۔ نکال لومیرے سارے بال۔ لیکن مجھے کوئی پر اہم نہیں ہے، لوگ تمہیں ہی گنچے کی بیوی کہیں گے۔ بائیکا پر گنچے کے پیچھے تم پر ہنسیں گے لوگ۔

ارے بابا میں نے کھینچے کب ہیں۔ میں مساج ہی تو کر رہی ہوں۔ وہ کافی حیران ہوئی اسکی بات

-4-

ارے واہ! یہ مساجد ہے تو پھر رسیاں تڑوانا کیا ہوتا ہے؟؟؟

ارسل۔۔۔ میں اتنے آرام سے ہی تو کر رہی ہوں۔ آپ تو خوش ہی نہیں ہوتے۔ وہ بہت

معصومیت سے پولی۔

ارے واہ! میں خوش نہیں ہوتا یا تمہیں مجھ پر رحم ہی نہیں آتا۔ ایسے کھینچ رہی ہو جیسے کوئی بھینس بندھی

ہوان کے ساتھ۔۔ وہ بھونڈی مثال دیتے ہوئے بولا۔

بابا بابا۔۔۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی اس کی بے تکی تھپہہ پر۔ وہ ایسی ہی بے تکی مثالیں دیا کرتا تھا۔

آج بختے کا دن تھا اور گھر پر ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ رضا حسین اور شمیم عصر کی نماز پڑھ

کر رضا کے بہنوئی کی عیادت کو گئے۔ تھے جو پچھلے دو مہینوں سے علیل تھے اور اب انکی واپسی عشاء سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ کامران اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے نکلا ہوا تھا اور گھر میں بس وہی دونوں رہ گئے تھے۔ ارسلان نہانے کے لیے جا ہی رہا تھا کہ صبا نے پیچھے سے آواز دے کر روک لیا۔ اور تیل لا کر اس

کے بالوں میں مساج کرنے لگی۔ اب یہ اس کا معمول بن چکا تھا۔ ہر بار نہ سہی لیکن کبھی کبھی وہ اس کے بالوں میں سرسوں کے تیل کا مساج کر ہی دیتی۔ ارسلان کے بال پیارے تو پہلے بھی تھے۔ چھوٹے چھوٹے لٹبال ماتھے پر آتے ہوئے بہت اچھے لگتے اس پر لیکن مساج کروا کے دھونے کے بعد تو صبا کو سب کچھ چھوڑ کر اس کے بالوں پر ہی پیار آتا تھا۔ گیلے ہو کر وہ لگتے بھی تو بہت پیارے تھے۔ وہ مساج کرتی جا رہی تھی اور ساتھ میں انکی ہلکی ہلکی نوک جھونک بھی چل رہی تھی۔

اب میں نے ایسا بھی نہیں کھینچا اور اتنے برے اور روکھے بال ہونگے تو کچھتے ہوئے تو لگے گے۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ نہانے سے پہلے تیل لگایا کریں لیکن آپ بھلا کیوں سنیں گے۔۔

محترمہ میرے بال بہت پیارے ہیں لیکن جو تم کر رہی ہو وہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چھیڑ رہا تھا خود ہی تو کہا آپ نے کہ مساج کر دوں اور اب خود ہی شکایت بھی ہے۔ وہ ناراض ہو رہی تھی۔ تو میں نے مساج کرنے کا کہا تھا یہ کب کہا تھا کہ جڑ سے ہی اکھاڑ دو، کچھ چھوڑو ہی نہ میرے سر پر۔ میں نے کب اکھاڑا ہے؟ اتنے آرام سے تو کر رہی ہوں۔

ہاں ہاں۔ اکھاڑ دو۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شرم سے تو تم ڈوبو گی جب لوگ تمہیں کٹھیلے کی بیوی کہیں گے۔۔

اس کی شرارت عروج پر تھی۔ وہ ایسے ہی اسے چھیڑتا تھا اور اسے چھیڑنے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا شخص نہیں تھا لیکن اس کے سامنے آتے ہی پتا نہیں کیوں اسے شرارتیں ہی سوچتی تھی۔ اسے تنگ کر کے وہ بہت مزالینا تھا۔ اکثر صبح بائیک پر ساتھ جاتے ہوئے وہ بائیک کو ادھر ادھر مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر اسے ڈراتا رہتا تھا۔ اور وہ ڈر بھی جاتی تھی۔ اور پھر اوپر سے صبا کا ریکشن اتنا معصومانہ اور مزے کا ہوتا تھا کہ اسکا اور دل کرتا اسے تنگ کرنے کو۔ وہ اکثر ناراض ہو جاتی اور سکول کے پاس بائیک سے اتر کر روز نہیں تو ہر دوسرے دن اسے یہ دھمکی بھی دیتی کہ اب وہ سارا دن اس سے بات نہیں کرے گی اور اسے کوئی مہیج بھی نہیں کرے گی۔ اور کبھی کبھی تو یہ دھمکی بھی ملتی کہ اب وہ کبھی اس کے ساتھ نہیں آئے گی بائیک پر۔ وہ آج ہی ٹرانسپورٹ میں بات کر کے اپنے لیے سکول کی بس لگوا لے گی اور آئندہ اسی میں آیا کرے گی لیکن اس کے ساتھ کبھی نہیں آئے گی۔

لیکن یہ دھمکی ہمیشہ دھمکی ہی رہتی۔ سکول کے دروازے سے داخل ہونے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد سے وہ انتظار کرنا شروع کر دیتی کہ کب اسکا سوری کا مہیج آئے گا۔ کیوں کہ اسکا آفس مشکل سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہی تھا اور ہر بار جب وہ سکول کی اسمبلی سے فارغ ہو کر سٹاف روم میں آتی تھی تو اس کا مہیج آیا ہوتا تھا۔ ایک لمبا سا سوری اور ایک اداس سا کانٹون۔ اور اس کی ساری ناراضگی بھک کر کے

اڑ جاتی۔ وہ ایک میچ اسکے لبوں پر مسکان بکھیر دیتا۔ وہ اسے ٹک کرنا تھا اور جانتا ہوتا کہ وہنا راض ہو گئی سو ہر بار بنک کے دروازے پر بانیک کھڑی کرتے یہ اسے میچ کر دیتا اور یہ کام وہ کبھی بھی نہ بھولتا۔ دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی وہ ایک لڑکی اسے۔

مجھے تو کوئی پر اہلم نہیں ہے اگر کوئی مجھے کھیلے کی بیوی کہے یا پھر مجھے کھیلے کے پیچھے بانیک پر بیٹھے ہوئے دیکھے بلکہ مجھے تو بہت مزائے گا جب لوگ افسوس سے میری طرف دیکھیں گے۔ اب چڑانے کی باری اس کی تھی۔

افسوس سے کیوں؟؟؟؟؟

تو ظاہر ہے لوگ مجھے آپکے ساتھ دیکھ کر بہت افسوس کریں گے ماکہ دیکھو بیچاری لڑکی کی قسمت پھوٹ گئی ہے اتنی پیاری ہے اور ایک سگنے کے ساتھ بیاہ دی گئی۔۔۔ چچی چچی۔ وہ مصنوعی اداسی اپنے چہرے پر چڑھا کر بولی۔

اب ایسی بھی کوئی جنت سے اتری ہوئی حور نہیں ہو تم جو میں تمہارے ساتھ لنگور لگوں گا۔ خود کو ذرا شیشے میں جا کر دیکھ لو تم۔ اسکا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ اسے چڑانے میں آج کامیاب ہوئی گئی تھی ورنہ اکثر وہ ہی جیتتا تھا۔

بابا بابا۔۔ میں نے ایسا کب کہا کہ میں حور ہوں اور آپ لنگور ہیں؟؟؟؟ میں تو لوگوں کی بات کر رہی تھی نا۔

تو تم اسی لیے کھینچ رہی ہو میرے بال تاکہ سارے نکال دو اور پھر سب کی ہمدردیاں سمیٹ سکو۔ وہ واقعی چڑ گیا تھا۔

بلکل۔ سو فیصد سہی اندازہ لگایا ہے آپ نے۔ میرا مقصد یہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لیکن وہ انجان تھا۔

اچھا بس چھوڑ دو۔ میں نہانے جا رہا ہوں۔ بہت اکیٹھڑ لیے میرے بال۔

ارے رکیں نا ابھی تو پوری طرح اکھاڑے نہیں ہیں۔ مجھے اور بھی اکھاڑنے ہیں۔ وہ ہنسے جا رہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مساج ہو گیا تھا لیکن وہ ویسے ہی آہستہ آہستہ اسکے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا اور ساتھ میں اسے غصہ بھی دلا رہی تھی۔

اچھا اچھا۔ ابھی مت نہائیں۔ کم سے کم آدھا گھنٹہ تو صبر کر لیں۔ ابھی تو تیل لگایا ہے۔

وہ بھی تیل کی بوتل اٹھا کر اٹھ گئی۔ اسے رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ تیار کرنا تھا۔ میرا لوگ نہیں

تھے۔ کچھ رضا حسین کی پنشن تھی اور کچھ ارسلان کی تنخواہ۔ گھر کا گزارا اچھا چل رہا تھا۔ آج بینک سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ مچھلی لایا تھا۔ اور رات کے کھانے میں صبا کو اسی مچھلی کو ملنا تھا سو وہ تیل کی بوتل رکھ کر کچن کی طرف گئی۔ ابھی اسے مصالحہ تیار کرنا تھا۔ ملنا تو سب کے واپس آنے پر ہی تھا۔۔۔۔

پاپا میں آپ سے سخت مامروض ہوں۔۔۔

کیوں بیٹا؟ اب پاپا نے کیا کیا ہے؟

پاپا آپ نے کہا تھا کہ آپ بہت جلدی آئیں گے گھر۔۔۔ لیکن آج پورا ہفتہ ہو گیا ہے آپ نہیں آئے۔

میجر شہنواز بٹ نے آج گھر فون کیا تھا اور فون اٹھایا ہی اس کے بیٹے شہر نے۔۔۔ وہ شہر جو اپنے باپ سے ہر فون پر لڑتا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کا پاپا اس سے اور اس کی ماما سے پیار نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہوتا تو اتنے مہینوں بعد گھر نہ آتا بلکہ جلدی جلدی آتا جیسا کہ اس کے سب دوستوں کے پاپا آتے تھے۔ وہ تو اپنی دانست میں سمجھتا تھا کہ اس کے دوست عبداللہ اور کامران کے پاپا ان سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں جو روز شام کو گھر آ جاتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر اس نے حسن سلطان کو رکھا تھا جس کے پاپا ہر ہفتے کے دن اسلام آباد سے ان سے ملنے آتے تھے۔۔۔ اپنے پاپا میجر شہنواز بٹ کو اس نے آخری نمبر دیا تھا۔ اور اس نمبر کے مطابق اس کے پاپا یعنی میجر شہنواز بٹ کو اپنے بیٹے شہر نواز اور اس کی ماما عائشہ سے کوئی پیار نہیں تھا۔ جو وہ مہینوں تک ان سے ملنے گھر نہیں آتے۔ اگر ان کو پیار ہوتا تو وہ اس کے دوستوں کے پاپا کی طرح ان سے ملنے ضرور آتے۔

بیٹا میں نے آپ سے پرمس کیا تھا کہ جیسے ہی مجھے مائٹلے گا میں بھاگتا ہوا اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جاؤں گا۔۔۔ شہنواز کو اپنا وعدہ یاد تھا۔

لیکن پاپا آپ کو پچھلے دو مہینوں سے مائٹلے نہیں ملا۔ آپ آئے تھے تو بھی اتنی جلدی چلے گئے تھے۔۔۔ وہ بھی اسی کا بیٹا تھا۔

بیٹا وہ تو ایمر جنسی کال آئے تھی مائٹلے لیے جلدی آنا پڑا تھا۔۔۔۔۔ باپ وضاحت دے رہا تھا

پاپا صرف آپ کو ایمر جنسی میں کیوں بلاتے ہیں۔ عبداللہ کے پاپا کو تو کبھی کسی نے نہیں بلایا۔

عائشہ جو کافی دیر سے صوفے پر بیٹھی ان باپ کے بیٹے کے گلے شکوے سن رہی تھی دھیرے سے اس بات پر ہنس دی۔ پانچ سال کا شہر نواز نہیں جانتا تھا کہ اس کے پاپا کو اس سے اور اس کی ماما سے کیوں پیار نہیں ہے۔ عائشہ جانتی تھی کہ اپنے بیٹے شہر اور بیوی عائشہ پر جان بچھاؤ کرنے والا شہنواز اتنے مہینے

گھر کیوں نہیں آتا۔ اور یہ بات وہ اپنے بیٹے کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن وہ بچہ تھا۔ اور بچے سمجھتے نہیں صرف دیکھتے ہیں۔ اور اس کا شہر بھی دوستوں کو دیکھ کر اپنے پاپا سے لڑ رہا تھا۔

لیکن اس نے روکا نہیں اسے۔ بلکہ اسے لڑنے دیا۔ آخر باپ تھا اس کا۔۔۔۔۔۔

بیٹا عبداللہ کے پاپا آرمی میں نہیں ہیں سنا ہنوار نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

تو پاپا آپ بھی آرمی چھوڑ کر آجائیں۔ وہ بھی آج پورا حساب لے رہا تھا

بیٹا ابھی تو نصیحتیں چھوڑ سکتا۔۔۔

کیوں؟؟؟

وہ لا جواب ہو گیا تھا۔ اور وہ ہمیشہ ہی لا جواب ہو جاتا تھا۔ اولاد چیز ہی ایسی ہے کہ بڑے بڑوں کو لا جواب کر دیتی ہے۔ اور عائشہ جانتی تھی کہ بحث میں اپنے سامنے والے کو ہمیشہ لا جواب کر دینے والا شاہنواز اپنے پانچ سالہ بیٹے کے سامنے ہر بار لا جواب ہو جاتا ہے۔ سو وہ مسکراتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کو بھانے آئی تھی۔

شہرہ میاں پاپا سے اتنا لڑتے نہیں ہیں۔۔۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں جیہا۔۔۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔
نہیں ماما پاپا جان بوجھ کر نہیں آتے۔ ڈیوٹی پر تو کامران کے پاپا بھی ہوتے ہیں۔ وہ آج بہت غصے میں تھا۔

اچھا چلو بیٹا مجھے فون دو اب۔۔۔ کتنی دیر سے پاپا سے لڑ رہے ہو آپ۔ اب مجھے بات کرنے دیں۔ آپ جا کے کارٹون دیکھ لو۔
 رہ لیں ماما۔۔۔ آپ بات کر لیں۔

اور وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ وہ غصے میں تھا ناراض تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اٹھ جانے پر ہی شاہنواز نے دل ہی دل میں شکرا دیا کیا تھا۔ وہ اپنے پاپا سے سخت ناراض تھا۔ لیکن جیران وہ اس بات پر تھا کہ اس کی ماما اس کے پاپا سے کیوں ناراض نہیں ہوتی۔ کمرے کے دروازے میں سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا تھا اور جی بھر کے بد مزہ ہوا تھا۔ اس کی ماما فون پہ ہنس رہی تھی۔ جانے کیوں۔ اس لمحے اپنی ماما بھی اسے اچھی نہیں لگی۔ وہ پاپا سے اتنی خوشی سے بات کیوں کر رہی تھی۔ جب کہ پاپا کو تو ان دونوں کا احساس بھی نہیں ہیں۔ اور اس خراب موڈ کے ساتھ وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجاہد اللہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟؟؟ انہوں نے اپنی ازلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا
تھکیل بھائی اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ چلا جاؤنگا میں یہاں سے۔ مزید اب بے گناہوں کی جان

نہیں لوٹتا میں۔۔۔ وہ بہت غصے میں تھا

ایسا کیا ہوا ہے مجاہد جو تم ایسے کہہ رہے ہو اور مولانا صاحب نے مجھے اتنی جلدی میں بلا یا تم سے بات کرنے کیلئے۔۔۔ ٹھیکل حیران تھا

میں جان گیا ہوں سب حقیقت۔ ایسی باتیں جو آپ نہیں جانتے۔۔۔ مولانا صاحب صرف ایک دھوکہ ہیں اور۔۔۔۔۔ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جانے کیوں رک گیا

اس سے کیا فرق پڑتا ہے جیسا کہ آپ کیا جان گئے ہو اور کون کیا ہے۔ کرنا تو سب کو وہی ہوتا ہے جسکا فیصلہ ہوا ہوتا ہے۔۔۔ وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کیساتھ بولے

آپ نہیں جانتے ٹھیکل بھائی آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔۔۔ مجاہد کے لہجے میں کافی ڈر تھا

ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتا اور تم جان گئے ہو؟؟؟ انہیں نے چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے پوچھا
ٹھیکل بھائی میں اس رات ویسے ہی کمرے سے نکلا۔ نیند نہیں آرہی تھی مجھے۔ میں قسمت سے مولانا صاحب کے کمرے کے پیچھے کی طرف سے مڑ کر آیا۔ وہاں روشنی جل رہی تھی۔ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اندر جھانکا تو مجھے کچھ انجان لوگ نظر آئے۔ بالکل انجانے جن کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں وہی کھڑے ہو کر انکی باتیں سننا رہا اور جیسے جیسے میں سننا رہا مجھے لگا میں زمین میں دھنستا جا رہا ہوں۔ وہاں کپڑے کا ایک تھیلا بھی پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ کہیں پر کچھ دھماکہ کرنے کی بات کر رہے تھے اور پیسوں کی کچھ بات کر رہے تھے لیکن مولانا صاحب نہیں مان رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن بس یہ سمجھ پایا کہ مولانا صاحب نہیں مان رہے۔ بھلا وہ اللہ اور رسول ﷺ کے غلام ہیں پیسے لے کر کیسے دھماکہ کر سکتے تھے لیکن یہ میری سوچ تھی جو بالکل غلط ثابت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب کے سامنے وہ تھیلا اور اس جیسا ایک اور تھیلا انڈیلا گیا اور ان دونوں تھیلوں میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکلی۔ مولانا صاحب کے چہرے پر اس وقت ایک ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے پیسوں کے عوض دھماکہ کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ اب آپ بتائیں ٹھیکل بھائی جب مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ مجھے ہی نہیں مجھ جیسے ہزاروں لڑکوں کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا گیا ہے اور دیا جا رہا ہے تو میں یہاں کیسے رہوں گا۔۔۔

جو تم نے کہا وہ سب میں جانتا ہوں اور اگر تم اس کے علاوہ بھی کچھ جانتے ہو تو مجھے بتادو۔ وہ

بدستور اب بھی مسکرا رہے تھے۔

کیا؟؟؟؟؟؟؟؟ وہ چیخا

آپ یہ سب جانتے ہیں؟؟؟؟

ہاں۔۔۔ جواب مختصر تھا۔

اور آپ پھر بھی یہاں ہیں؟؟؟؟ کیوں؟؟؟؟

کیونکہ تم بھی یہاں ہو۔۔۔

لیکن میں یہاں نہیں رہونگا۔ بھاگ جاؤنگا یہاں سے۔ وہ قریب چلا تے ہوئے بولا
یہ میں نے بھی سوچا تھا لیکن صرف سوچ ہی پایا تھا۔ کر نہیں پایا مجاہد۔۔۔ کلیل زمین پر نظریں جتاتے
ہوئے بولے

کیوں؟؟؟؟

زندگی میں کبھی کبھی سوچ اور عمل کے درمیان اتنا فاصلہ آ جاتا ہے مجاہد کہ سوچنا تو آپ کے بس میں
رہ جاتا ہے لیکن عمل کرنا نہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں بھی صرف سوچ ہی پایا۔ تمہارے ساتھ
بھی ایسا ہی ہے تم بھی صرف سوچ پا رہے ہو۔ سوچ اور عمل کے بیچ کا فاصلہ پانا تمہارے بس میں بھی نہیں
ہے۔ اکی مسکرا ہٹا اب ختم ہو چکی تھی

کلیل بھائی میں اگر غلط رستے پر چلا تھا اور اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے اور میں اس رستے کو ترک
کرنا چاہ رہا ہوں تو یہ اتنا مشکل کیوں ہے۔ وہ کافی پریشان تھا۔

مشکل نہیں ہے بیٹا ناممکن ہے۔۔۔

لیکن کیوں؟؟؟

کیوں کہ کبھی کبھی غلط رستے پر چلتے چلتے ہم ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں سے صرف آگے جانے
کا رستہ ملتا ہے۔ پیچھے کا رستہ تو وہاں کوئی ہوتا ہی نہیں ہے اور وہ آگے کا رستہ مزید غلطی اور تباہی کا ہوتا ہے
لیکن اس پر چلنا بھی ہماری مجبوری ہوتی ہے۔

وہ خاموش رہا

مجاہد بیٹا کبھی کبھی زندگی میں کی جانے والی ایک غلطی کی قیمت ہم ساری زندگی نہیں چکا پاتے۔ وہ
غلطی ہماری زندگی تو لے سکتی ہے لیکن سدھر نہیں سکتی ہوتی۔ اور اس غلطی کی قیمت کے آگے ہماری اپنی
زندگی کی قیمت بہت معمولی ہوتی ہے۔ سمجھ لو کہ تم بھی اپنے حصے کی وہ غلطی کر چکے ہو اور میں بھی
کر چکا ہوں۔ اب ہمارے پاس واپسی کا کوئی رستہ نہیں۔۔۔۔

آپ کیوں نہیں چلے جاتے یہاں سے کلیل بھائی۔ آپ تو بھاگ جائیں م۔۔۔ ویسے بھی آپ کبھی
ہفتے ڈیڑھ ہفتے میں ایک چکر لگاتے ہیں یہاں کا تو نہ آئیں یہاں۔ آپ کیلئے تو یہاں سے نکلنے کا مسئلہ بھی
نہیں ہے۔ اس نے اپنی طرف سے تجویز دی۔

اگر یہ میرے لیے ممکن ہوتا تو میں کرب کا ایسا کرچکا ہوتا۔۔۔ وہ چائے کی سسکی بھرتے ہوئے بولے
 آپ کیلئے ممکن کیوں نہیں ہے؟؟؟
 کیونکہ میں بھی اپنی وہ غلطی کرچکا ہوں جسکے بعد واپسی کا کوئی رستہ نہیں بچتا۔۔
 میں سمجھا نہیں۔ وہ واقعی بالکل نہیں سمجھا تھا۔ بھلا انکے لیے کیا مشکل تھا یہاں سے جانا۔
 وہ کچھ دیر خاموشی سے چائے کے سپ پھرتے رہے اور پھر گویا ہوئے
 مجاہد بیٹا تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟؟
 کچھ خاص نہیں۔

میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ بیوی اور ماں باپ بھی زندہ ہیں۔ بہنوں کی شادی ہو چکی ہے
 اور میرے ماں باپ، بیوی اور اولاد باہر کے ملک میں رہ رہے ہیں۔ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہیں وہ
 وہاں۔ بہت آسائشوں والی لیکن تب تک جب تک میں یہاں یہی کام کرتا رہوں جو ابھی کر رہا ہوں۔ مجھ
 پر اور میرے گھر والوں پر لمحہ لمحہ کی نظر رکھی جاتی ہے۔ ادھر میں نے کوئی ایسی کوشش کی جو تم کہہ رہے
 ہو یا انکی بات ماننے سے انکار کر دیا تو میرے خاندان کا نام و نشان مٹنے میں ایک سے دوسرے لمحے کی
 دیر نہیں لگے گی۔ میں جب یہاں آیا تھا تو تم سب کی طرح دین کی خدمت کے جذبے سے آیا تھا۔ اور میں
 تب بھی ڈاکٹر تھا اور یہی کام کرتا تھا جواب کر رہا ہوں۔ پھر ایک دن مجھے بھی پتا چلا کہ میرے ساتھ دھوکہ
 ہو رہا ہے اور مجھے دین کی خدمت نہیں بلکہ ذاتی مفادات کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے اور پھر میں نے بالکل
 تمہاری طرح سوچا۔ یہاں سے نکلنے کی ٹھان لی۔ لیکن مجھے فون ملا کر دیا گیا جس میں میری سترہ سال کی
 بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا اور اس سے میری بات کروائی گئی۔
 وہ چند لمحے چپ رہے۔ شاید اپنی سوچوں کو مجتمع کر رہے تھے۔

اور اسی لمحے میری ہمت دم توڑ گئی اور میں نے یہاں کے لوگوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ میں
 مجبور تھا کیا کرتا۔ میں تو شاید یہاں سے بھاگ جاتا لیکن اپنے ساتھ جڑے چھ لوگوں کی موت سہنے کی
 ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ اور یہ ہمت تم میں بھی نہیں ہوگی۔ جیسا لوگ کہتے ہیں کہ مرد کبھی بھی مجبور نہیں
 ہوتا لیکن میں نہیں مانتا۔ مرد بھی مجبور ہوتا ہے۔ باقی کسی چیز یا کسی رشتے سے نہ بھی ہوتا ہوا اپنی اولاد سے
 ضرور مجبور ہو جاتا تھا۔ میں بھی اپنی بیٹی اور بیوی کی بے حرمتی اور اسکے بعد دردناک موت اور اپنے بیٹوں کی
 حسرتناک موت اور اپنے ماں باپ کی آنکھوں کے دیے نہیں بچھا سکتا تھا۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔
 وہ خاموش ہو گیا۔ اس کمرے میں تھوڑی دیر گھمبیر خاموشی رہی۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جس
 تشکیل بھائی کو وہ سب بہت خوش قسمت اور خوش باش سمجھتے تھے وہ قسمت، حالات اور مجبوری کی ایسی بھٹی

میں جل رہے ہیں جسکے ختم ہونے کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی اندھیری رات انکی زندگی کو بھی مکمل طور پر گھیرے ہوئے ہے۔

بڑے مولانا صاحب نے مجھے کہا کہ اگر میں اگلے مشن میں انکا ساتھ دوں گا اور انکا کام کروں گا تو وہ مجھے اسکے بعد آزاد کر دیں گے بشرط یہ کہ میں قرآن پر حلف اٹھاؤں کہ پوری زندگی یہ سارے راز اپنے سینے میں ہی رکھوں گا۔۔۔

انہوں نے گھور کر اسکی طرف دیکھا۔ ایسے جیسے اچنبھے کی بات کی ہوا سنے۔

ایسے کہا انہوں نے؟؟؟

ہاں ایسے ہی۔۔۔

پھر کیا جواب دیا تم نے؟؟؟

میں نے وہی کہا کہ اب میں کسی بے گناہ کی جان نہیں لوں گا۔۔۔ وہ اپنی بات پر اب بھی اٹکا ہوا تھا تو کیا کرو گے؟؟؟

میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ کچھ بھی کر لوں گا اور چلا جاؤں گا یہاں سے لیکن اب مولانا صاحب کی بات نہیں مانوں گا۔ بہت جانیں لے لی میں نے انکے لیے۔ لیکن جاؤ گے کہاں؟؟؟

یہاں سے بھاگ جاؤں گا تو کسی بڑے فوجی یا پولیس والوں سے یا پھر کسی بڑے آدمی سے مل کر یہاں کی ساری سچائی بتا دوں گا اور اپنے اور اپنے خاندان کیلئے پناہ بھی مانگ لوں گا۔ اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ لوگ تمہاری مدد کریں گے؟؟؟ کیوں نہیں کریں گے۔۔۔

وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنسے اور اتنا ہنسے کہ انکی پلکیں بھیگ گئی ایسے جیسے اس نے کوئی بہت ہی اچھا لطیفہ سنایا ہو۔ جب ہنستے ہنستے تھک گئے تو اسکی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ وہ بھی کافی اچنبھے سے انکی طرف دیکھتا رہا۔ ایسے قہقہے مار مار کر تو وہ کبھی نہیں ہنسے تھے۔

بہت معصوم ہو تم مجاہد اللہ۔۔۔ تم نے گھر بدر سے اور یہاں کے لوگوں کے علاوہ دنیا کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ مولانا صاحب اور ہزاروں پر مشتمل انکا گروہ جو کرتا ہے وہ ان بڑے لوگوں سے چھپ کر کرتا ہے؟؟؟ ایسا نہیں ہے۔ اس ملک کی ایجنسیوں کو یہاں کے پل پل کے بارے میں پتا ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں کہ کوئی وزیر، مشیر کبھی نہیں مراا سطرچ کے دھماکوں میں۔ کیونکہ تمہارے مولانا صاحب کے پاس آنے سے پہلے اسی طرح کے کئی تھیلے انکے ہاں بھی پہنچا دیے

جاتے ہیں۔ وہ پہلے سے باخبر ہوتے ہیں کہ آج فلاں جگہ دھماکہ ہونا ہے یا آج فلاں چوک پر معصوموں پر فائرنگ ہونی ہے اسلیے کبھی سننے میں نہیں آیا کہ ایسا کوئی بندہ مرا ہے اور ہمارے نام کے مجاہدوں کو ایسے بندوں کو نہیں بلکہ معصوموں کی موت کا حکم نامہ ملتا ہے۔ اور تم جانتے ہو مجاہد اس سب میں سب سے زیادہ فائدے میں وہ لوگ رہتے ہیں جو مذہب کے نام پر سیاست کرتے ہیں۔ جو داڑھی رکھ کر وہاں لوگوں کے پیر بنے ہوتے ہیں اور یہاں سے ان معصوموں کی موت کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ اور تم یہ مت سمجھو کہ یہ صرف مولانا صاحب ہیں جو یہ سب کر رہے ہیں۔ انکے پیچھے مختلف ممالک کے لوگ ہیں جو پیسے دے کر ان سے یہ کام کرواتے ہیں اور مولانا صاحب تم اور مجھ جیسے لوگوں سے مذہب کے نام پر وہی کام کرواتے ہیں جس کیلئے انہوں نے پیسوں کے تھیلے لیے ہوتے ہیں۔ اور جس کام کیلئے ابھی تمہیں مولانا صاحب کہہ رہے ہیں تم جانتے ہو اس میں کیا ہوگا؟؟؟

کیا؟؟؟؟ وہ مزید انکشافات کا منتظر ہو گیا

اس کام میں فوجی وردی استعمال ہوگی اور فوجی تمغے بھی۔ اور نقلی فوجی وردی نہیں بلکہ بالکل اصلی وردی۔ اور تم لوگ وردی پہن کر یہ کام کرو گے۔ اور تم جانتے نہیں ہو مجاہد کہ وہ وردی کہاں سے آئے گی۔۔۔ میں بتاتا ہوں۔۔۔

وہ چند لمحے رکے۔۔۔

اس کام کیلئے پہلے سے لوگوں کو خریداجاتا ہے اور اس دنیا میں ہر مسلمان کے ایمان کی ایک قیمت ہے آج اور جب مولانا صاحب کے بڑے وہ قیمت دے دیتے ہیں تو کوئی بھی بک جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور کسی کی تھوڑی کم۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سچے ہوتے ہیں اور کسی قیمت پر ایمان نہیں بیچتے۔ اللہ کے بعد ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ ملک چل رہا ہے ورنہ اس ملک نے کب کا ختم ہو جانا تھا۔ فوج ایسا ادارہ ہے جو مخلص ہے اس وطن کے ساتھ۔ لیکن اس پوری فوج کے اندر کوئی ایک آدھا ایسا آدمی ہوگا جس کی ایمان کی قیمت ہوگی۔ وہ بھی اپنی قیمت وصول کر کے یہ وردی اور تمغے فراہم کر دے گا۔ اور یہ فوجی وردی وہیں سے آئے گی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سارے ہی فوجی چاہے وہ افسر ہو یا سپاہی وطن پر جان دینا اعزاز سمجھتے ہیں اور جان دیتے بھی ہیں لیکن مولانا صاحب اور انکے نیٹ ورک کو اپنے کام کیلئے پورے دارے میں ایک بھی بندہ مل جائے تو انکا کام ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ ہر جگہ ایسے ہی ایک آدھ بندے کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ سیکنگ کی حالت میں انہیں دیکھتا رہا اور وہ انکشاف پر انکشاف کرتے رہے۔۔۔

مرتا وہی ہے مجاہد جو بے خبر ہوتا ہے۔ جو کسی بازار میں سبزی بیچنے والا ہوتا ہے یا ریڑھی سجائے

چوڑیاں بیچنے والا یا پھر وہ خریدار جسکی بد قسمتی اسے اس وقت وہاں لے کر آئی تھی۔ جسے پہلے سے دھما کے کا وقت اور جگہ پتا ہوتی ہے وہ وہاں کیوں آئے گا۔ اب تم ہی مجھے بتا دو کہ جو دین راستے سے پتھر ہٹانے پر بخشش کی نوید دیتا ہوا اور کسی یتیم کو کھانا کھلانے پر جنت کا حقدار نہرانا ہو وہ بھلا دھما کہ کر کے کئی معصوم بچوں کو یتیم کر دینے والے کو کیسے جنت دے سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی ابھی یہ باتیں سمجھ آ گئی ہیں لیکن اب وقت نہیں ہے۔ دیر تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ تمہارے لیے اب بہتر یہ ہے کہ تم انکی اس پیشکش پر غور کر لو جو انہوں نے تمہیں دی ہے کیونکہ تم بھی کسی اور چیز سے مجبور ہونہ ہوا اپنی اولاد سے ضرور مجبور ہو گئے۔ تمہارا بھی تو ایک بیٹا ہے جو تم کو ابھی پہچانتا بھی نہیں ہے۔ جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اسکا باپ کس مجبوری کی سلاخوں میں جکڑا گیا ہے۔

آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شکیل بھائی۔ آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ مولانا صاحب خون بہانے کے پیسے لیتے ہیں؟؟؟

ہاں میرا یہی مطلب ہے۔ انہیں ہی کیا انکے گروہ کے سرغنوں میں سے کسی کو بھی نہ دین کی کوئی خدمت کرنی ہے اور نہ ہی انہیں دین سے کوئی لگاؤ ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو وہ کسی بے گناہ کی جان کا سودا کیوں کرتے؟؟؟ تمہیں شاید یہ نہ ہو کہ آج سے پندرہ سال پہلے یہاں ایک مدرسے پر بم پھینک دیے گئے اور سینکڑوں معصوم بے گناہوں کی جان چلی گئی اور کہا گیا کہ وہاں اسلحہ تھا۔ وہاں واقعی اسلحہ تھا لیکن وہ کسی معصوم بچے نے نہیں رکھا تھا۔ انکو تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہاں اسلحہ کی کوئی چیز تھی۔ جنہوں نے حملہ کیا انہوں نے پہلے مولانا صاحب جیسے کسی بندے سے وہ رکھوایا اور پھر اسی کا بہانا بنا کر ان معصوموں پر بمباری کر دی۔

مولانا صاحب جیسے یا مولانا صاحب؟؟؟ اسے معنی خیز لہجے میں پوچھا

مولانا صاحب نے۔۔

مجاہد نے ایک لمبی سانس خارج کی۔ شکیل کے اعترافات اسے لیے قبول کرنا آسان نہیں تھے۔

مجاہد اللہ مولانا صاحب کو جب وہاں کا کام دیا گیا تو وہ کچھ عرصہ وہاں پڑھانے جانے لگے اور تم جانتے ہو کہ دلوں اور دماغوں کو اپنے قابو میں کرنے کے فن میں انہیں بہت مہارت حاصل ہے سوانہوں نے یہی کیا اور کچھ ہی عرصے میں جہاد میں استعمال ہونے والے اسلحے کی حفاظت کے نام پر کچھ اسلحہ وہاں منتقل کر دیا۔ اور جب انکا کام ختم ہوا تو اسی اسلحے کے نام پر مدرسے میں پڑھنے والے معصوموں پر ایسی بمباری کر دی گئی کہ انکے اعضا کا بھی پتا نہیں چل سکا۔ اور ایسے ہی نوٹوں سے بھرے ہوئے تھیلے تب بھی انہوں نے لیے تھے۔ اور میں تب بھی جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں لیکن تب بھی کچھ نہیں

کر سکتا تھا اور اب بھی بے بس ہوں۔۔۔

وہ ہلکل خاموش تھا۔ ایسے جیسے سانپ سوگھ گیا ہو۔

جانتے ہو مجاہد میں نے ایک باریہ بھی سوچا کہ اپنے خاندان کی قربانی دے دوں گا لیکن مزید معصوموں کا گنہگار نہیں بنوں گا لیکن جانتے ہو تب کیا ہوا؟؟ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔۔

تب میں نے بہت رازداری سے کھونچ لگایا کہ میں جا کر کس سے بات کروں اور کس سے مدد مانگوں۔ لیکن مجھے مکمل طور پر نا کامی ہوئی۔ ہر شاخ پر الو بیٹھا تھا جس کے سامنے کسی کی جان کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ پھر میں نے مذہبی لوگوں کا سراغ لگایا جو زیروں اور مشیروں اور بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور رسول ﷺ کے رستے اور احکامات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ لوگ میری کسی طرح سے مدد کر دیں گے لیکن یہاں پر تو میں ہلکل ہی مایوس ہو گیا۔ انکے سامنے صرف پیسے کی اہمیت تھی۔ وہ لوگ تو داڑھی رکھ کر پیسے کو خدا سمجھ بیٹھے تھے اور وہی سب کر رہے تھے جو یہاں پر مولانا صاحب کر رہے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے تھے اور مولانا صاحب یہاں رہتے ہیں۔ باقی کوئی فرق نہیں تھا۔ مذہب کی فکر نہ یہاں کسی کو ہے اور نہ وہاں۔ یہاں بھی مذہب کے سوداگر اور وہاں بھی اسی کے نام پر لوگوں کی بے وقوفی۔ یہاں سے میں نے مایوسی ہو کر وہی رستہ دوبارہ پکڑ لیا جسکو چھوڑنا چاہتا تھا۔ اگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا تو اپنے چھ پیاروں کو اپنے ساتھ مروا کر میں کیا حاصل کر لیتا؟؟

وہ اب بھی انہیں اسی طرح حیرت سے ہنک ہنکے جارہا تھا۔ اسکے پاس پڑی چائے کی پیلی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

تو میں سمجھ جاؤں کہ میرے پاس واپسی کا کوئی رستہ نہیں ہے۔ اب ساری زندگی مجھے بے گناہوں کی جانیں ہی لینی ہیں۔۔۔ اسکے لہجے میں ایک لٹا ہوا مسافر بولا تھا۔

لیکن تم نے تو ابھی کہا ہے کہ مولانا صاحب نے تم سے کہا ہے کہ اگر تم اگلا ایک مشن انکی مرضی سے کر لو تو وہ تمہیں جانے دے سکتے ہیں۔۔۔

آپ کو لگتا ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں؟؟ انکی مسکراہٹ بہت تھکی ہوئی تھی

اگر انہوں نے کہا ہے تو وہ ضرور ایسا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ کچھ بھی ہے ایک بات کی گواہی میں ضرور دوں گا کہ مولانا صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ زبردستی بھی تم سے کوئی کام کروا سکتے ہیں اور وہ واقعی ایسا کر بھی سکتے ہیں لیکن اگر انہوں نے تمہیں پیشکش کی ہے تو میرا خیال ہے کہ تم غور کر لو اس پر۔۔۔ پہلے

اچھی طرح سے حالات کا جائزہ لے لو۔ ہر زاویے سے۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا۔۔۔
مجاہد وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسکے حالات تو بالکل ہاروں جیسے ہو گئے تھے۔ کسی نے اس سے
کہا تھا کہ ہاروں جیسا مت بننا چاہیے
لیکن وہ ہاروں جیسا ہی بن گیا تھا۔۔۔۔۔

جیلہ اسے عالم دین ہی بنانا چاہتی تھی سوان دونوں نے اسے سکول داخل کرنے سے پہلے قاری
ادریس کے پاس بٹھانا چاہا۔۔۔ رات کو انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے قاری صاحب کے پاس
بھیجنا شروع کر دیا جائے اور سکول میں جب داخلوں کا موسم آئے گا تو اس بار اسے داخل کر دیں گے لیکن اس
میں ابھی سات مہینے کا عرصہ رہتا تھا۔۔۔

اور اگلے دن تو نہیں ہو سکا البتہ اس سے اگلے دن فضل نے ٹھیکیدار سے جلدی چھٹی لے لی تھی
اور گھر آ کر رحمت کو گھر کے قریب والی مسجد میں لے گیا تھا جس کی امامت قاری ادریس کرتے تھے۔
بہت ہی بردبار اور عزت دار انسان تھے۔ گاؤں کے لوگ انکو قاری صاحب ہی بولتے تھے۔ فضل اور بچے
اسی مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے۔

یہ اصل میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کو نماز کے اوقات کے علاوہ مدرسے کے طور پر استعمال
کیا جاتا تھا۔ محلے کے اکثر بچے قاری ادریس سے قرآن کا سبق پڑھنے آتے تھے اور قاری ادریس ایک
بار صبح اور ایک بار عصر میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ جو بچے سکول جاتے تھے وہ عصر کی نماز کے بعد پڑھ
لیتے تھے اور جو سکول نہیں جاتے وہ صبح پڑھ لیتے۔ اس طرح سے مسجد کا صحن بھی تنگ نہ پڑتا اور محلے کے
سارے بچے پڑھ بھی جاتے۔

گاؤں کے لوگ قاری صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ تھے ہی اتنے اچھے۔ ہر کسی سے
عزت سے ملتے تھے۔ کبھی فضول بات نہ کرتے۔ نہ کبھی کسی سے کچھ مانگتے تھے۔ ان کا تعلق اس گاؤں
سے نہیں تھا لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا کہ انکا خاندان کہاں ہے۔ وہ بس پچھلے چھ سال سے محلہ جھنگلی کی مسجد میں
آباد تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے کبھی ان کے منہ سے اپنے خاندان کے کسی فرد کے بارے میں نہیں
سنا اگر کبھی کسی نے کوشش کی بھی تو قاری صاحب نال دیتے۔ خوداری ان میں بہت تھی۔ بھوکا رہ لیتے لیکن
خود کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ گاؤں کے کچھ مالی طور پر مستحکم لوگوں نے آپس میں انکے کھانے
کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اب وہی لوگ ایک ایک دن کا کھانا قاری صاحب کو بھیجتے تھے۔ قاری صاحب
گاؤں کے بچوں کو بغیر اجرت کے پڑھاتے تھے۔ پڑھانے کی اجرت انہوں نے کبھی نہیں مانگی اگر کسی

نے کبھی دینے کی کوشش کی بھی تو قاری صاحب یہ کہہ کر منع کر دیتے کہ وہ یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کر رہے ہیں اور اللہ کیلئے کیے جانے والے کام کی اجر تہ نہیں لی جاتی رہا کھانے، کپڑوں کا تو وہ گاؤں میں کوئی نہ کوئی قاری صاحب کو دے ہی دیتا۔ لیکن قاری صاحب کی عجیب بات تھی کہ وہ پورے سال میں دو سے زیادہ جوڑے قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ جب انکو سال میں دو جوڑے مل جاتے تھے تو تیسرا وہ اصرار پر بھی نہیں لیتے تھے۔

جب فضل رحمت کی انگلی تھامے مسجد میں داخل ہوا تو بچے ابھی سبق ختم کر کے اٹھ گئے تھے۔ جب کہ قاری صاحب دھری صحن میں چادر بچھا کر بیٹھے تھے۔

السلام وعلیکم قاری صاحب۔۔۔ فضلہ نے عقیدت سے سلام کیا
وعلیکم السلام فضل اللہ کیسے ہو۔ آؤ بیٹھو۔۔۔ قاری صاحب نے بچھی ہوئی چادر کے ایک طرف فضل کیلئے جگہ خالی کی۔
کہو اس وقت کیسے آنا ہوا۔۔۔

قاری صاحب یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے رحمت اللہ۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ آپ کی طرح بنے۔ دنیا اور آخرت میں واقعی ہمارے لیے رحمت بن جائے۔۔۔ فضل نے مدعا بیان کیا۔

قاری ادریس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزرا تھا۔ کچھ سیکنڈ کے لیے انہوں نے آنکھیں موندھ لی تھیں جیسے کوئی تکلیف پہنچی ہو انکو یا پھر کسی مراقبے میں چلے گئے ہوں لیکن پھر جلدی سے انہوں نے آنکھیں کھول دی۔

فضل اللہ باللہ اس بچے کو تمہارے اور خاندان کے لیے واقعی رحمت بنا دے لیکن میری طرح نہ بنائے۔ فضلہ کے کانوں میں قاری صاحب کی دکھ بھری آواز گونجی تھی۔ وہ یکدم سے چونکا تھا۔

کیا ہوا قاری صاحب؟؟ میں نے کچھ غلط کہا کیا؟

نہیں نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ قاری صاحب کو اندازا ہو گیا تھا کہ فضل بری طرح چونکا ہے اور کچھ کھوجنا چاہتا ہے۔ اس لیے جلدی سے انہوں نے موضوع بدل دیا۔

اچھا ٹھیک ہے فضل اللہ تم جب چاہو بچے کو بھیج سکتے ہو۔ اور چاہو تو آج شام سے ہی۔۔۔ قاری صاحب مسکرائے تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ مسکراتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ پرفرشتوں کا گمان ہوتا تھا۔

اچھا ٹھیک ہے قاری صاحب۔ میں اسکو بھیج دوں گا۔ آج یا کل میں۔ اب چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔

اللہ حافظ۔۔۔ قاری صاحب آہستہ سے بولے تھے۔

وہ دونوں باپ بیٹا گھر آ گئے تھے۔ لیکن فضلہ کے دل میں پھانس سی چھ گئی تھی۔ بار بار قاری

صاحب کا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔۔۔ جانے ایسی کیا بات تھی جس سے قاری صاحب کو اتنی تکلیف پہنچی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی فضلو کو یاد تھے لیکن اسے وجہ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

لیکن بات زیادہ دیر تک اس کے ذہن میں نہ رہ سکی۔ شام تک وہ بھول ہی گیا۔ اس غریب کی زندگی میں تو مسائل کے اور بھی انبار تھے ایسے میں وہ قاری ادریس کے دکھ کو کتنی دیر یاد رکھ پاتا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رحمت اللہ نے قاری ادریس سے سبق پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ روز صبح بھی جاتا تھا اور شام کو بھی۔ قاری ادریس نے ایک بار کوشش کی کہ فضل رحمۃ اللہ کو سکول بھی بھیج دیا کرے۔ لیکن اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔

فضل تم اس بچے کو سکول بھی بھیج دیا کرو۔ اور رہی پڑھانے کی بات تو وہ میں شام کو باقی بچوں کے ساتھ پڑھا دیا کروں گا۔ شام کو بھی تو بچے آتے ہیں ما۔ اس دن قاری صاحب نے جمعے کی نماز اور خطبے کے بعد فضل کو بٹھا کر کہا

ارے نہیں قاری صاحب! میں غریب آدمی ہوں۔ میرے بچوں نے کونسا پڑھ کر افسر بن جانا ہے۔ جو میرے باقی بچے پڑھ رہے ہیں اس سے تو بہتر ہے کہ نہ ہی پڑھے کوئی۔۔۔ فضل کے لہجے میں دکھ تھا لیکن سچائی تھی۔

کیا مطلب؟؟؟

اب دیکھیں ما قاری صاحب۔ میرے بیٹے امان اللہ نے دس جماعتیں پڑھ لی۔ اس سے آگے میری اوقات نہیں تھی۔ آج وہ بھی مزدوری کر رہا ہے۔ اس کے بعد جو بچے پڑھ رہے ہیں انکو بھی دس جماعتوں سے زیادہ پڑھانے کی ہمت نہیں ہے میری۔ دس جماعتیں پڑھ کر وہ کیا کر لیں گے قاری صاحب؟؟؟ اور میں اسکو بھی داخل کروں گا لیکن غلظت نے پتا کیا ہے ابھی داخل ہونے میں سات مہینے رہتے ہیں۔

اچھا ٹھیک ہے لیکن وقت پر داخل کر دینا اسے۔ ایسا نہ ہو کہ رہ جائے۔۔۔

جی قاری صاحب داخل کر دوں گا۔ اور وہ دونوں باپ بیٹا وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ صبح کی نماز پڑھ کر سیر کیلئے اس میدان میں آ گیا جہاں وہ روز آیا کرتا تھا لیکن آج اسکی ہمت گھومنے پھرنے کی نہیں تھی۔ وہ جا کر کھلی فضا میں بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن آج کل ماضی خود ہی اسکے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ یہاں بھی نہ چاہتے ہوئے ماضی نے ایک بار پھر اسکے دماغ میں جھانکا۔

مجاہد جلدی آجنا آجنا شتے کے بعد درس ہوگا۔۔ حیدر نے اسے نکلتے ہوئے یاد دلایا
کونسا درس؟؟؟؟ اسنے مڑ کر پوچھا

جو ہر جمعے کے دن ہوتا ہے اور جس میں ہم لوگ مدرسے کے نئے آنے والوں بچوں کو اسلام کی
تعلیمات دیتے ہیں؟؟؟

لیکن میں کیسے دے سکتا ہوں؟؟؟ اس نے سرکوشی کی۔

جیسے ہر ہفتے کرتے ہو۔۔۔ بس جلدی آجنا۔ حیدر نے دوبارہ سے تنبیہ کی۔

اچھا۔۔ اور وہ نکل گیا۔

اور اب اس وسیع میدان میں کھلے آسمان تلے وہ سوچنے لگا کہ اس نے کس سے اور کہاں اسلامی
تعلیمات لی؟؟؟ اور وہ کیا اس قابل ہے کہ وہ کسی کو تعلیمات دے سکے۔۔ ماضی ایک بار پھر اپنی پوری
شدت سے حملہ آور ہوا۔۔

اب وہ صبح شام قاری اور یس کے پاس جایا کرتا۔ وہ بچہ تھا۔ قاری صاحب کو فکرتھی کہ پانچ سال
کا بچہ صبح شام کا یا دکروایا ہوا سبق یا نہیں رکھ پائے گا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ صبح اسکو باقی ترجمہ
پڑھنے والے بچوں کے ساتھ بٹھاتے اور شام کو اسکو سبق یاد کرواتے۔۔ قاری صاحب چاہتے تھے کہ
ترجمہ بے شک وہ یاد نہ کرے لیکن چلو اسی بہانے کچھ سیکھ ہی جائے گا۔

اے پروردگار!

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ ان
لوگوں کے رستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔ نہ کہ انکے رستے پر جن پر تو غصہ ہوتا رہا۔ اور نہ گمراہوں
کے رستے پر۔

(الفاتحہ -)

اے اللہ ہم پر رحم کر۔ ہمیں بخش دے۔ ہم پر اپنا کرم کر۔ ہم اس قابل نہیں ہیں۔ لیکن تیرا فضل
بے انتہا ہے۔ ہم کم ظرف ہیں لیکن تیرا ظرف بہت بڑا ہے۔ ہمیں ہمارے اعمال کے مطابق نہ دے۔
کیونکہ ہمارے اعمال صرف تیرے عذاب کے قابل ہیں لیکن اپنے رسول کے صدقے ہمیں بخش دے
ہمیں قوم عاد کے انجام سے بچالے۔ ہمیں قوم ثمود بننے سے بچالے، ہمارا حال قوم لوط جیسا نہ کر۔ ہمیں
ایسے کاموں سے بچالے کہ ہمارا انجام قوم شعیب جیسا ہو۔ ہمارے اعمال کو نہ دیکھ۔ اپنی بادشاہی کے
صدقے ہمیں آگ سے بچالے۔ اے میرے مالک تیرے غصے کی تاب نہیں ہے ہم میں۔ ہم پر اپنی

رحمت کی چادر ڈال دے۔ وہ رحمت جسکے سائے ہم پر ہمیشہ رہے۔ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلا دے۔ اس راستے پر جس پر تیرے برگزیدہ بندے چلے۔ وہ بندے جو تجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور وہ بندے جن سے تو محبت کرتا ہے اور وہ رستہ جو تیرا رستہ ہے۔ وہ رستہ جس پر تیرا نئی چلا جس پر صحابہ کرام چلے۔ یا اللہ! ہمارے بچوں کو نیکی کی توفیق دے ان کو اچھا انسان بنا دے۔ ان کو اچھا مسلمان بنا دے۔ یا میرے رب ہماری دعا قبول فرما۔

آمین ثم آمین -----

سب نے با آواز بلند کہا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ محلے کے سارے مرد جمعہ پڑھنے آئے تھے۔ یہ قاری ادریس کے الفاظ تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد دعا کی تھی انھوں نے۔ ہمیشہ جمعہ کی نماز کے بعد وہ دعا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ہی یہی دعا مانگتے تھے۔

قاری صاحب! صراطِ مستقیم کیا ہے؟؟

قاری ادریس نے چونک کر عزیز کی طرف دیکھا۔ جو سوالیہ نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ سارے بچے قاری صاحب سے قرآن کا سبق پڑھنے آئے تھے۔ رحمت اللہ بھی باقی بچوں کے سچ میں بیٹھ کر سبق یاد کر رہا تھا۔ وہ بھی رک کر قاری صاحب کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ عزیز بیٹا صراطِ مستقیم کا مطلب ہے سیدھا راستہ۔

لیکن قاری صاحب سیدھے راستے کا مطلب کیا ہے؟؟

اس تیرا سال کے بچے کی طرف سے پھر سوال آیا۔ وہ بھی آج جمعہ کی نماز میں موجود تھا۔ اور قاری صاحب کا پورا خطبہ اور دعائیں چکا تھا

دیکھو بیٹا۔ تمہارے گھر کی طرف ایک راستہ جاتا ہے۔ تم یہاں سے نکل کر اسی راستے پر چلو گے تو سیدھا اپنے گھر پہنچو گے لیکن اگر اس رستے کو چھوڑ دو گے تو اپنے گھر کا رستہ نہیں پاسکو گے۔ بلکہ کہیں اور ہی نکل جاؤ گے۔ یہی حال صراطِ مستقیم کا بھی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو اللہ کو پسند ہے اور جس پر چلنے کا ہم مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔ جس پر اللہ کے رسول اور برگزیدہ بزرگ چلے ہیں۔ اور اسی رستے پر چل کر ہم اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اس رستے کو چھوڑ دیں گے تو جس طرح تم اپنے گھر نہیں پہنچ سکتے بلکہ اسی طرح ہم اللہ کو خوش نہیں کر سکتے۔

قاری صاحب نے بچوں کی سمجھ کے مطابق بہت آسان الفاظ میں جواب دیا تھا۔

تو قاری صاحب ہم اس رستے پر نہیں چلتے کیا؟؟

یہ سوال ارشاد کی طرف سے آیا تھا جو قاری صاحب کے مکمل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔
 بیٹا کوشش تو ہم سب ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں اکثر اوقات ہمیں ناکامی ہو جاتی ہے
 اور ہم اللہ کے راستے کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ناکامی کیوں ہوتی ہے قاری صاحب؟؟
 بیٹا صراطِ مستقیم پر چلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے انسان کے سامنے بہت
 مشکلات آتی ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے آزمایا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ ان مشکلات سے صبر کے ساتھ
 گزر جائے اور اپنے رب کی رضا پر چلے تو وہ اللہ کے نزدیک کامیاب کہلاتا ہے لیکن ایسا بہت کم لوگ ہی
 کر پاتے ہیں ہم جیسے کمزور ایمان کے لوگ تو مشکلات کے آغاز پر ہی ہمت ہار جاتے ہیں۔ پھر اللہ ہمیں
 آزمانا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ رہی آپ کی بات کہ ہم ناکام کیوں ہوتے ہیں تو بیٹا اس کا جواب یہ ہے کہ
 ہمارے اندر صدق اور منبوطی نہیں ہوتی ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی مسلمان صراطِ مستقیم پر چلنا چاہے
 اور اللہ اس کی مدد نہ کرے۔ بس بیٹا ارادے کی منبوطی چاہیے ہوتی ہے۔
 قاری صاحب ہم لوگ چھٹی کر لیں؟؟ کون سے آواز آئی۔

ہاں بیٹا چلو چھٹی کر لو۔ شام ہونے والی ہے۔ اور سب بچوں نے سپارے بند کر کے گھروں کی راہ
 لی۔

پانچ سالہ رحمت اللہ سارا راستہ یہ سوچتا رہا کہ آخر صراطِ مستقیم پر کیسے چلا جاتا ہے؟ اور اگر کوئی
 چلتا ہے تو اللہ اسے آزمانا کیوں ہے؟؟ اسکی معصوم سی سمجھ میں قاری ادریس کی باتیں نہیں آئی تھی۔ اسے
 قاری ادریس کا سارا خطبہ بھی یاد تھا۔ جیسے ہر بچے کے سامنے دہرائے گئے الفاظ اسے یاد ہو جاتے ہیں۔ یا
 پھر شاید اس لیے کہ وہ اس کی زندگی کا سب سے پہلے سنا جانے والا خطبہ تھا۔ لیکن اسے بھی کچھ سمجھ نہیں
 آیا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ قوم عا د کون تھے۔ قوم خود کا کیا قصور اور کیا انجام تھا اور یہ کہ قاری صاحب
 نے قوم لوط جیسا نہ بننے کی دعا کیوں مانگی تھی۔ بس وہ پورے خطبے اور آج قاری صاحب کے درس میں
 اسکو اتنی سی سمجھ آئی تھی کہ اللہ کے نبی اور صحابہ ضرور کوئی بہت اچھے لوگ ہونگے جو قاری صاحب نے ان
 جیسا بننے کی دعا کی۔ یہ سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچ چکا تھا اور پھر وہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

طوبی آج جلدی سے ہوم ورک کر لو۔ پاپا آئیں گے تو گھومنے جائیں گے۔ یہ عمران تھا۔
 بھائی کہاں جائیں گے؟؟ طوبی حیران ہوئی
 پتہ نہیں۔ بس کہیں بھی چلیں گے۔ لیکن خوب مزے کریں گے۔ کافی خوش لگ رہا تھا۔

لیکن پاپا نے تو کچھ بھی نہیں کہا بھائی۔

ارے پاپا نے کچھ نہیں کہا لیکن انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔

پاپا نے نہیں تم نے پاپا سے کہا ہوگا۔ ورنہ پھر پاپا کل ضرور بتاتے ماما کو۔ وہ بھی طوبی تھی۔ سیدنا اور حسین شاہ کی بیٹی۔ اپنے بھائی کی فطرت کو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

ہاں میں نے پاپا سے کہا تھا اور وہ مان بھی گئے تھے۔

تو ماننا تو تھا۔ پاپا تمہاری بات مالتے ہی کب ہیں۔

اچھا چلو اب جلو مت۔ جلدی سے ہوم ورک ختم کرو پھر پاپا آ جائیں گے۔

رکو میں ماما کو بتا کے آتی ہوں۔

ارے نہیں۔ پہلے ہوم ورک تو ختم کرلو۔ پھر بتا دینا۔ ابھی اٹھ کر جاؤ گی تو ماما غصہ کریں گی۔

اچھا چلو ٹھیک ہے۔ میں جلدی جلدی کام ختم کرتی ہوں۔ وہ بھی طوبی تھی۔ اپنے بھائی کی کچھ نہ کچھ فطرت تو اس نے بھی لی تھی۔ عی جتنی شوقین نہ سہی لیکن گھومنے پھرنے کا شوق اسے بھی تھا۔ اپنے بھائی کی زبانی اس پر وگرام کا سن کر اسے پہلے تو حیرت ہوئی تھی لیکن اس کے بعد خوشی کی بھی ایک لہر اس کے اندر اٹھ گئی تھی۔ وہ ماں کو خبر دینے سے زیادہ اسی لیے ماں کے پاس بھاگنا چاہ رہی تھی کہ اس خبر کی سچائی جانچ سکے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عی نے اسے بیوقوف بنایا ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آج پھر جمعہ کا دن تھا۔ قاری صاحب چاہتے تھے کہ محلہ جھنگلی کے لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک درس کا اہتمام کیا جائے۔ جس میں گاؤں کے غریب اور ان پڑھ لوگوں کو اسلام کے بنیادی عقائد سے روشناس کروایا جائے۔ آج اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ عصر کی نماز کے بعد آج محلے کے مرد مسجد میں جمع تھے۔ قاری صاحب نے بولنا شروع کیا۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

دوستوں آج ہم ارکان اسلام کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

تو دوستوں سب سے پہلے آتا ہے توحید۔ ہم کلمہ پڑھتے ہیں۔ دل سے کواہی دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے سوا کسی کی پرستش یا پوجا نہیں ہونی چاہیے۔ یا بھی یوں کہ اس کے ذات کی صفت ہی واحد ہے۔ اب اگر کوئی ذات میں یا صفات میں شریک مانا جائے تو یہ شرک ہوگا۔ لیکن یہاں پر سوال اٹھتا ہے کہ صفات میں شرک کا تو سیدھا مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ غفور ہے رحیم ہے۔ سمیع ہے بصیر ہے۔ قہار ہے اور جبار ہے۔ تو اگر ہم کسی اور کو چاہے وہ انسان ہو یا حیوان اگر ہم اس

میں یہی صفات تصور کریں گے تو ہم مشرک ہیں۔ یہاں تک تو بات سمجھ آتی ہے۔ اس کے بعد آتا ہے۔ ذات میں شرک۔ اب اس میں ہم لوگ بہت غلطی کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا رب نہیں مانا تو ہم اچھے مسلمان ہیں۔ ہم نے کسی دیوتا یا دیوی سے دعا نہیں کی تو ہم نیک ہیں۔ ہم نے کسی جانور کو اپنا خدا نہیں مانا تو ہم مشرک نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی نہ کسی موڑ پر ہم سب ہی شرک کرتے ہیں۔ ہم اس کی ذات میں بھی شریک مہر اتے ہیں اور صفات میں بھی۔ دانستہ تو نہیں لیکن نادانستہ ہم دل کھول کر شرک کرتے ہیں۔ ہم دولت کو خدا مانتے ہیں۔ رشتوں سے وہ امیدیں لگائے رکھتے ہیں جن کو پورا کرنا صرف ہمارے رب کا خاصا ہے۔ انسانوں سے مانگتے ہیں۔ اپنی ضرورتوں کے لیے انسانوں کے آگے جھکتے ہیں۔ کیا ہوا اگر ہم بتوں کے آگے نہیں جھکتے تو۔۔ انسانوں کے آگے تو ہم جھکتے ہیں۔ اور پھر امیدیں پورا نہ ہونے پر گلہ اسی رب سے کرتے ہیں۔ یہ کھلا شرک نہیں تو کیا ہے؟؟؟ اور رب فرماتا ہے

”اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے۔ اسکے سوا سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جس کو وہ معاف کرنا چاہے۔ تو جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مہر ایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔“
النساء: ۶۱۱

اس کے بعد ہم آتے ہیں نماز پر۔ جو اسلام کا دوسرا رکن ہے۔
اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔
صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ تعالیٰ) سے مدد طلب کرو۔ یہ (نماز) بہت بھاری ہوتی ہے سوائے ان کے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

البقرہ: ۳۵

ہمارے نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو بھی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتا ہے تو اللہ اس کے بدلے اس کے لیے ایک نیکی لکھتا ہے۔ اور اس کے بدلے ایک گناہ مٹاتا ہے۔ اور اس کے درجے بلند کرتا ہے۔ پس زیادہ سجدے کیا کرو۔ ہم مسلمان دن میں پانچ بار نماز پڑھتے ہیں۔ پانچ بار اللہ کے دربار میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اس سے راضی ہونے کی التجا کرتے ہیں۔ لیکن گناہ سے کنارہ نہیں کرتے۔ عجیب بات ہے نا۔ غور فرمائیے کہ ہم معافی تو مانگتے ہیں لیکن کنارہ کبھی نہیں کرتے۔ ہم جھوٹ بول لیتے ہیں۔ غیبت کر لیتے ہیں۔ ملاوٹ کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد اللہ کے دربار میں کھڑے ہو کر معافی مانگتے ہیں۔ تو ایسے میں ہمیں معافی کیسے ملے گی۔ اگر ہم واقعی میں معافی چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں خود کو کٹھن سے

کھڑا کرنا پڑے گا۔

ارسل!

کیا ہوا جناب؟؟ ارسل کو اتنے پیار سے کیوں بلایا جا رہا ہے؟؟
میری چھٹی ختم ہو گئی ہے۔ کل سے میں دوبارہ سکول جانا شروع کر رہی ہوں۔
ہاں وہ تو میں جانتا ہوں۔ وودو بار فائل پر نظریں جتاتے ہوئے بولا۔

صبا اور ارسلان کی سنا دی کو ابھی دو مہینے ہوئے تھے۔ اٹھائیس سالہ ارسلان ایک بینک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اور پچیس سالہ صبا سکول میں ٹیچر تھی۔ صبا نے سنا دی کے لیے دو مہینے کی چھٹی لی تھی۔ جو آج ختم ہو گئی تھی۔ اب اسے اپنے آنے جانے کی ٹنشن تھی کہ وہ سکول کیسے جائے گی۔ اور واپسی پر اسے کون لائے گا۔ اور یہی بات آج اس نے اپنے سسر اور ساس سے بھی کی تھی۔
امی میں سکول کیسے جاؤ گی؟ اور واپسی پر کیسے آؤ گی۔

ارے بیٹا اس میں کیا ہے۔ صبح تمہیں ارسلان چھوڑ دیا کرے گا۔ اور واپسی پر تم کامران کے ساتھ اسکی یونیورسٹی کی وین میں آ جایا کرنا۔ وہ بھی تو یونیورسٹی سے ڈھائی بجے ہی آتا ہے نا۔ جواب اس کے سسر نے دیا تھا۔ مشکل منٹوں میں آسان ہو گئی تھی۔

ہاں ابوجی یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح ارسلان کو بھی پریشانی نہیں ہو گی۔ اور میرا آنا جانا بھی آسان ہو جائے گا۔ یہ تجویز اسے پسند آ گئی تھی۔

اور ابھی رات کو اپنے کمرے میں آ کر اس نے ارسلان سے یہی بات چھیڑی تھی۔ وہ اس کی سُن تو رہا تھا لیکن ساتھ میں کسی فائل پر بھی نظریں جتائے ہوئے تھا۔
اگر آپ جانتے ہیں تو پھر حل کیوں نہیں نکالا آپ نے؟
کیا حل؟

کہ میں کس کے ساتھ جاؤ گی اور واپس کس کے ساتھ آؤ گی۔

تو حل کے لیے تم اور امی ابو ہیں نا۔ ترک کر جواب آیا

باہا با۔۔ غصہ کیوں کر رہے ہیں؟ جل رہے ہیں آپ۔ اس نے ہبہ لگایا۔

محترمہ میں جل بھی رہا ہوں اور سڑ بھی رہا ہوں۔ تم نے دو مہینے میں گھر میں سب کو اپنا گرویدہ جو بنا لیا ہے۔ مجھ غریب کی تو اب کوئی سنا بھی نہیں ہے۔ سارے گھر میں تمہاری سکرانی چلتی ہے۔ ہر کام تم سے پوچھ کر ہوتا ہے۔ وہ آج جی بھر کر گلے کر رہا تھا۔

ارے ارے ارے۔ یہ قریب میں کہیں سے چلنے کی بو آرہی ہے۔ اس نے فائل اس کے ہاتھ سے اچکائی تھی۔

تو میں کہہ رہا ہوں ماکہ میں جل سڑ رہا ہوں تو ظاہر ہے بو بھی مجھ سے ہی آرہی ہے۔ کہیں ادھر ادھر اپنا معصوم دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اچھا تو آپ مجھے صبح سکول چھوڑ کے آفس جائیں گے۔

نہیں جی۔ میں تو کوئی نہیں چھوڑ رہا خود ہی چلی جاؤ۔

لیکن ابو جی تو کہہ رہے تھے کہ آپ سے بات کرنی ہے انھوں نے اور آپ نے حامی بھی بھرنی ہے مجھے روز صبح چھوڑنے کی۔

مجھ سے تو کسی نے پوچھا ہی نہیں بس فیصلہ سنا دیا کہ ارسلان صبح صبا کو چھوڑتے ہوئے جانا۔ اب مجھ سے کسی نے مرضی پوچھی ہوتی تو میں بتاتا۔ وہ اچھا خاصا چڑا ہوا لگ رہا تھا۔

تو کیا آپ انکار کرتے؟؟؟ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

ارے بی بی مجھنا چیز کی مجال جو انکار کرتا۔

تو؟؟؟؟ اس نے معصومیت سے پوچھا

تو یہ کہ میں ارسلان بہ رضا باقاعی ہوش و حواس کہتا ہوں کہ مجھے صبح اپنی زوجہ محترمہ صبا کو اس کے سکول چھوڑنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ جب وہ بانیک پر ہمارے ساتھ بیٹھی ہوگی تو ہمیں فخر ہو گا۔ اور ہم خود کو اس دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھیں گے۔ اس نے باقاعدہ ہر جھکا کے کہا۔ جیسے کوئی حلف لے رہا ہو۔

اسے جی بھر کر پیار آیا تھا اس پر۔ وہ تھا ہی اس قابل کہ اس پر پیار آئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑ جاتا تھا۔ اور منہ بنانے لگ جاتا تھا۔ معصومیت کی اس پر انتہا تھی۔ ایسے وقت میں کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی اٹھائیس سالہ جوان ارسلان رضا ہے جس نے سارے خاندان کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔

اس گھر میں کل چار افراد تھے جو دو مہینے پہلے صبا کے آنے سے پانچ ہو گئے تھے۔ رضا حسین اس کی بیوی شمیم اور دو بیٹے ارسلان اور کامران۔ اور اب وہ پانچ لوگ تھے۔ بلکہ جب سے صبا آئی تھی اس گھر میں وہ لوگ پانچ کی بجائے خود کو دس محسوس کرنے لگے تھے۔ صبا کے آنے سے تو گھر بہت بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی ہر کسی کا خیال رکھنے والی۔ رضا حسین اور شمیم کو تو صبا کی شکل میں مٹی مل گئی تھی۔ وہ لوگ اکثر مٹی نہ ہونے کا افسوس کرتے تھے لیکن اب صبا کے آنے سے ان کے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ رہی کامران کی بات تو اس کی تو جان صبا میں تھی۔ اس نے تو کبھی اسے بھائی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اسے

آپنی ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ اور صرف بلاتا ہی نہیں تھا بڑی بہن سمجھتا بھی تھا۔ اور اس کے بعد نمبر آتا ہے ارسلان رضا کا۔ جو شادی سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب سے شادی ہوئی تھی ہر روز اس کو احساس ہوتا تھا کہ اس کے ماں باپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک اور بالکل بروقت تھا۔

دوستوں!

روزِ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اسلام کے اس رکن کی اہمیت ہم لوگ قرآن کی اس آیت سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تمہارا تم پر ہیزار گارہن جاؤ۔

البقرہ: ۸۱

ایک اور جگہ فرمایا۔

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کیلئے ہدایت ہے اور جس میں حق و باطل میں امتیاز کرنے والی واضح نشانیاں ہیں۔ پس تم میں سے جو اس مہینے کو پالے تو اس کے روزے ضرور رکھے۔

البقرہ: ۸۱

اور اسی مہینے کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں۔

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور شیطان زنجیروں میں جکڑ دئے جاتے ہیں۔

اب جو آیت آپ نے سنی اس میں فرمایا گیا ہے کہ روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ ہم پر ہیزار گارہن جائیں۔ اب اس کا مطلب سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کہ بھلا بھوکا رہنے سے کوئی پرہیز گار کیسے بنے گا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مبارک مہینے میں جہاں اللہ نے ہمیں ایک خاص وقت تک بھوکا رہنے کا پابند کیا ہے وہاں اس بات کی بھی ترغیب دی ہے کہ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرو۔ نفل عبادت کرو گے تو فرض کا ثواب ملے گا اور فرض عبادت کرو گے تو فرض کے سترگنا ملے گا۔ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ صدقہ خیرات کرو۔ زکوٰۃ اگر اس مہینے میں دو گے تو افضل ہوگا۔ عمرہ اگر اس مہینے میں کرو گے تو حج جتنا ثواب ملے گا۔ غرض جو بھی نیکی اس مہینے میں کرو گے تو اس کے اصل ثواب کا سترگنا ملے گا۔ دوسری طرف غور کریں تو اس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے ہر غلط کام سے سختی سے منع بھی کیا ہے۔ اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ باقی مہینوں میں غلط کام جائز ہیں۔ یہاں پر غلط کاموں سے مراد میرا وہ سارے کام ہیں جو غلط تو

ہیں لیکن کچھ خاص حالات میں جائز ہیں۔ جیسے کہ قصاص کا قتل۔ اب قصاص کا قتل عام حالات میں جائز ہے۔ جیسے کہ اگر کسی نے آپ کے بھائی بیٹے کو قتل کیا ہو تو اسلام آپ کو اس شخص کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر کسی نے آپ کو کوئی اور نقصان پہنچایا ہو تو اسلام اس حد تک اجازت دیتا ہے کہ آپ اس شخص کو اتنا ہی نقصان پہنچا سکتے ہو لیکن رمضان کے مہینے میں اللہ نے بدلہ لینے سے بھی منع کر دیا ہے۔

دوسری آیت جو آپ نے سنی اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اللہ کی کتاب جس میں ہم سب کیلئے ہدایت ہے اور جس میں حق و باطل میں امتیاز کرنے والی نشانیاں ہیں وہ اسی مہینے میں نازل کی گئی ہے۔ اب آپ اس بات پر غور کریں کہ جو کتاب سارے جہان کے لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ جو ہر انسان کو صحیح اور غلط میں تیز کرنا سکھاتی ہے وہ اس مہینے میں نازل ہوئی۔

اب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر غور کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس مہینے میں رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور شیطان جکڑ دیے جاتے ہیں۔ اب اس ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں آسمان کے کسی کونے میں ساری دنیا کے شیطان جمع کر دیے جاتے ہیں اور ان کو رسیوں سے جکڑ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر تو اس مہینے میں پوری دنیا میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں کسی گناہ یا غلط کام کا وجود ہی نہ ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس مہینے میں بھی ہم سب گناہ کرتے ہیں۔ تو پھر اس بات کا یہ مطلب ہے کیا کہ ہمارے شیطان کو رسیوں سے نہیں جکڑا گیا۔ یا نعوذ باللہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان جھوٹا ہے یا پھر فرشتے ہم سب کے شیطانوں کو جکڑنا ہی بھول گئے۔ بے شک ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شیطان کے جکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ہمیں اچھے کاموں کی ترغیب دی گئی ہے اور غلط لیکن جائز کاموں سے بھی روکا گیا ہے وہاں بھوکا رہنے کا پابند بھی کیا گیا ہے تاکہ ہم نفس کی خواہشات کے سرپٹ گھوڑے کو بھی لگام دے سکیں اور ایسے لوگوں کو بھی سمجھ سکیں جو غریب ہیں اور ہم سب کی بے حسی کی وجہ سے سارا سال بھوکے رہتے ہیں۔ تو اگر ہم نے نفس پہ قابو پا لیا تو سمجھ لیں کہ ہمارا شیطان جکڑ دیا گیا ہے اور اگر اللہ کے فرمان کو رد کر کے صرف بھوکے رہے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارا شیطان ابھی بھی آزاد ہے اور نہ صرف آزاد ہے بلکہ ہمارا رہنما بھی ہے۔

اب ہم اسلام کے چوتھے رکن کی بات کر لیتے ہیں جو کہ زکوٰۃ ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں زکوٰۃ کے حوالے سے۔ تو دو سنتوں اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ۔ اور جو لوگ اس مال میں سے جو اللہ نے ان کو اپنے فضل و کرم سے عطا کیا ہے بخل کرتے ہیں (اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ مال ان کے حق میں بہتر نہیں بلکہ یہ ان کے لیے شر ہے۔ اور عنقریب ان کے گلے میں بخل سے جمع کیے ہوئے مال کا طوق پہنا دیا جائے گا۔

آل عمران: ۸۱

اور اللہ کے نبی ﷺ زکوٰۃ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ دی تو تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

اب قرآن مجید کی اس آیت پر اگر ہم غور کریں تو کچھ بہت اہم باتیں اس ایک آیت میں واضح کی گئی ہیں۔ جیسے کہ وہ مال جس کو ہم سب اپنی محنت کا ثمر مانتے ہیں اور اسی کی وجہ سے غرور کے آسمان پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے تو سب سے پہلے تو ہم پر واضح کیا گیا کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ کا عطا کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد بندے کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر وہ زکوٰۃ نہیں دیتا اور مال جمع کرتا رہتا ہے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے اس کا مال جو بڑھ رہا ہے تو یہ اسے کوئی فائدہ دے گا۔ عام طور پر ہم میں سے جس کے پاس مال زیادہ ہوتا ہے تو ہم سب اس پر رشک کھاتے ہیں کہ فلاں کے پاس دو گاڑیاں ہیں یا فلاں کے پاس تین بھنگے ہیں۔ تو اگر اس شخص کے پاس زیادہ مال ہے اور وہ اس کو پاک نہیں کرتا تو اللہ کی طرف سے سزا کا مستحق ہے۔ یہاں پر یہ واضح کر دوں کہ یہاں پر پاک کرنے کا مطلب صرف گندی چیز کو صاف کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اگر آپ کا مال صاف ستھرا ہے، آپ نے اپنی محنت سے کمایا ہے تب بھی اگر آپ نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تو وہ آپ کے لیے صاف نہیں بلکہ گندا ہے اور اس کے استعمال پر آپ کو گناہ ہوگا۔ اب کچھ لوگ اکثر اعتراض کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اگر ہم مال اپنی محنت سے کما رہے ہیں تو اس میں دوسروں کو دینے کا پابند کیوں کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب اللہ نے اپنی آیت میں دیا ہے کہ جو مال تمہارے پاس ہے وہ سب اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس میں سے اللہ کی مقرر کردہ مقدار میں زکوٰۃ دے کر اپنے مال کو پاک کر لو ورنہ جو مال تمہارے پاس جمع ہوگا اور جس کو تم اپنے لیے بہتر سمجھتے ہو وہ ہرگز تمہارے لیے بہتر نہیں ہے بلکہ وہ تمہارے لیے شر ہے۔ اب یہاں پر مال کو طوق بنانے کا مطلب دو طرح سے لیا جاسکتا ہے۔ ایک تو بالکل صاف اور سیدھا ہے کہ جس نے زکوٰۃ نہیں دی ہوگی قیامت کے دن اللہ اسی مال کا طوق بنا کے اس کے گلے میں ڈالے گا اور دوسرا مطلب اس بات کا یہ بھی ہے کہ ہم انسانوں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے حالات آجاتے ہیں کہ مال ہمیں اپنے گلے کا پھندا لگتا ہے۔ کبھی کوئی مال کے لیے اغوا ہو رہا ہے اور وہ اسی مال کو اپنے لیے عذاب سمجھتا ہے کہیں کوئی مال دولت کی وجہ سے اپنے رشتے اور محبتیں کھورہا ہے اور پھر پچھتا تا ہے کہ کاش اس کے پاس یہ دولت نہ ہوتی لیکن محبتیں ہوتی۔ کہیں پر دولت کی وجہ سے عزتیں لوٹی جارہی ہیں تو کہیں پر اسی مال کی بدولت لوگ اپنے ایمان کھورہے ہیں۔ ان سب حالات میں مال اور دولت گلے میں طوق کی طرح ہی لگتی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ اللہ قیامت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی زکوٰۃ نہ دینے والوں کے مال کو گلے کا طوق بنا دینے

پر قادر ہے۔

اب آتے ہیں حدیث شریف کی طرف۔ کہ جب کوئی شخص اپنے مال میں سے زکوٰۃ دے دیتا ہے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ اب یہاں پر اس چیز کا مطلب کچھ لوگ اس طرح لیتے ہیں کہ وہ حرام حلال کی تمیز کیے بغیر دولت کماتے جاتے ہیں۔ اور پھر اس میں سے زکوٰۃ اور صدقہ وغیرہ دیتے رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ان کا مال پاک ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے مال کے حوالے سے اللہ نے ہم پر دفرانض عائد کیے ہیں۔ اب جب ہم ان فرائض کو پورا کریں گے تو اسکے بعد ہمارا مال ہم پر اور ہمارے آل و عیال پر خرچ کرنے میں گناہ نہیں ہے۔ پہلا فرض تو یہ ہے کہ ہمارا مال حلال طریقے سے کمایا گیا ہو اور دوسرا یہ کہ ہم نے اس میں سے زکوٰۃ دی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے زکوٰۃ دینے کا پابند کیوں کیا ہے۔ تو دوستوں! اپنے ارد گرد دیکھ لو۔ کافی لوگ ایسے مل جائیں گے جو خود کمانے کے لائق نہیں ہوتے۔ پیارہ ہوتے ہیں تو کوئی معذور کوئی مسافر اپنے گھر سے دور ہوتا ہے تو کوئی مسکین ہوتا ہے۔ اب جب اللہ نے اپنی مخلوق میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں تو اپنے وعدے کے مطابق اسے ان کی روزی روٹی کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ اور اس کا بندوبست اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ نے اپنے ان بندوں پر جو استطاعت رکھتے ہیں زکوٰۃ فرض کر دی ہے۔ کہ۔

بے شک اللہ بڑا کارساز ہے۔

اب ہم آتے ہیں اسلام کے پانچویں اور آخری رکن یعنی حج پر۔ حج سال میں ایک بار پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہے لیکن ہم مسلمانوں کے لیے اس کی اہمیت صرف ایک اجتماع جیسی نہیں ہے بلکہ اللہ سے محبت کی ایک نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔
بیت اللہ کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اسکے راستے کی استطاعت رکھتا ہو۔

آل عمران: ۹۷

اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو واقعی محتاجی نہیں اور بیمار بھی نہیں اور کسی ظالم حکمران کی طرف سے رکاوٹ بھی نہیں اور پھر بھی وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے یا نصرانی۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

اے لوگوں!

جب تم پر حج فرض ہو جائے تو اس کی ادائیگی میں تاخیر مت کرو اس لیے کہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کب کوئی رکاوٹ آجائے۔

اپنے حدیث میں نبی ﷺ نے کچھ حالات کا ذکر کیا ہے جن کے ہوتے ہوئے اگر کوئی مسلمان مالی لحاظ سے استطاعت رکھنے کے باوجود بھی حج نہ کرے تب بھی اسے کوئی گناہ نہیں ہے۔ جیسے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو یا معذور ہو یا پھر اسے کسی ظالم شخص یا حکمران نے روک رکھا ہو اور اس سے بغاوت کی صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہو تو اسے حج پر نہ جانے پر کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اب اگر کسی شخص کو ان میں سے کوئی عذر نہیں ہے اور اس کے باوجود بھی اس نے حج نہیں کیا تو اس کے ایمان کو خطرہ ہے۔ یہودی یا نصرانی مرنے کا مطلب یہاں یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے بغیر کسی سخت عذر کے حج نہیں کیا اور اسی حالت میں اسے موت آگئی تو اس کی موت ایمان پر نہیں ہوگی کہ اس نے اللہ کا حق ادا نہیں کیا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اس سے راضی رہے۔

دوسری حدیث میں اسی خطرے سے خبردار کیا گیا ہے کہ کوئی انسان اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں جانتا۔ اپنی موت کا کسی ذی روح کو علم نہیں ہے لہذا جیسے ہی حج کرنے کی استطاعت پالو تو فوراً حج کی تیاری کرلو۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت موت آکر ہمیں اپنی آغوش میں لیتی ہے یا کوئی اور رکاوٹ کھڑی ہوتی ہے۔ لہذا جلد سے جلد اس فریضے کو انجام دے دو کہ جب اللہ کے سامنے جاؤ تو کم از کم اس کے گھر کی زیارت تو کی ہوئی ہو۔

وہ بچوں کو اسلام کی بنیادی ارکان کے بارے میں بتا رہا تھا اور ذہن کے کسی گوشے میں کوئی اور بول رہا تھا۔ وہ جس نے اسے بہت پیار سے روکا تھا اس سے جس پر اب وہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے اسلام کے سارے ارکان سمجھا دیے اور دو گھنٹے کے اس درس میں آدھے سے زیادہ وقت وہ اپنے دھیان میں تھا۔ ماضی کا ایک ایسا اڑدھا تھا جو کسی پل اسے اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیتا تھا۔ جو باتیں اور جو تعلیمات اسے کسی نے سمجھائی تھیں آج وہ کسی اور کو دے رہا تھا۔ لیکن دونوں وقتوں میں فرق تھا اور دونوں نیتوں میں بھی۔ الفاظ شاید وہی تھے جو کسی اور کے منہ سے اس نے سنے تھے لیکن اثر وہ نہیں تھا۔

آخر ماضی کسی کو بھولتا کیوں نہیں۔۔۔۔۔ درس ختم ہونے اور بچوں کے اٹھ جانے کے بعد اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے تلخی سے سوچا۔

وجی ناشتہ کر لیا؟؟؟ انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔

جی خالہ کر لیا ہے۔۔۔ وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولی۔

منگنی اور نکاح سے پہلے جب کبھی اس کا دل نہیں کرتا تھا ناشتہ بنانے کا تو وہ پیچھے آکر خالہ کے ساتھ

کر لیتی تھی۔ زبیدہ خالہ صارم کے مٹا شے کیلئے ہمیشہ جلدی اٹھتی تھی اور صارم کے ساتھ ہی مٹا شے کر لیتی تھی۔ بعد میں ریحان کیلئے ہلکا سا مٹا شہ اور کبھی کبھی وجیہ کیلئے بھی مٹا شہ بناتی تھی۔ لیکن جب سے منگنی ہوئی تھی آج بارہواں دن تھا اور وجیہ نے ایک بار بھی انکے پاس مٹا شہ نہیں کیا تھا۔ وہ روز پوچھتیں اور روز وہ ایک ہی جواب دیتی۔

وجی۔۔۔۔۔ انہوں نے پیچھے سے ایک بار پھر بلایا۔

جی خالہ۔۔۔۔۔ وہ مڑی

تمھاری ایک امانت ہے میرے پاس۔۔۔۔۔

امانت؟؟؟ کوئی امانت خالہ؟؟ وہ کافی حیران ہوئی

آ جاؤ بتاتی ہوں۔۔۔ وہ یکن کی طرف گئی۔ پیچھے وجیہ تھی۔

انہوں نے اوپر کی الماری کھولی اور اس میں سے ایک چھوٹا سا کالے رنگ کا پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھ میں دیا۔

یہ کیا ہے خالہ؟؟

دیکھ لو خود ہی۔۔۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

اسے حیران ہوتے ہوئے لفافہ کھولا۔ اور اسے حیرت کا ایک اور شٹ لگا۔

لفافے کے اندر سے سرخ رنگ کا ایک خوبصورت گلاب کا پھول جو ابھی پورا کھلا بھی نہیں تھا نکلا۔ وہ حیران نظروں سے خالہ کو دیکھنے لگی جو اسکی حالت سے محفوظ ہو رہیں تھیں۔۔۔

صارم نے دیا ہے تمہیں دینے کیلئے۔۔۔۔۔

کیا؟؟؟؟؟ وہ حیرت کے سمندر میں تھی۔

وہ رات کو بھی آج کل تھوڑا دیر سے آتا ہے اور صبح بھی تمھارے جاگنے سے پہلے چلا جاتا ہے اور پھر اسکا کچھ بھی تو چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے۔ اس کے ہر جذبے سے آگاہ ہوں۔ صبح جاتے ہوئے اسے مجھے دیا کہ تمہیں دے دوں۔

اس نے حیران نظروں سے خالہ کو دیکھا اور پھر ادھ کھلے پھول کو۔

اب جاؤ نہیں تو بس نکل جائے گی تمھاری۔ خالہ نے اسے یاد دلایا۔

جی۔۔۔ اس نے ہلکے سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ منگنی کے بعد تو دونوں کا ایک بار بھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ صبح کا نکلا رات گئے گھر آتا تھا اور اس کے بیچ میں ہمیشہ کی طرح کبھی اوپر سے پچھے اور کبھی پچھے سے اوپر لوگ آتے جاتے

رہتے تھے لیکن یہ سلسلہ صائم کے آنے سے پہلے ختم ہو جاتا تھا اس لیے آج بارہ دن گزرنے کے باوجود ایک بار بھی انکا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن آج ایک خوبصورت سا پھول دے کر اس نے گویا اپنی موجودگی کا احساس دلا یا تھا۔

مین گیٹ سے نکلتے ہوئے ایک بار پھر رک کر اس نے لفافہ کھولا اور پھول نکال کر ایک بھر پور بھری نظر اس پر ڈالی اور لفافہ بند کر کے اپنے پرس میں ڈالا۔

مجاہد تجھے کب لگا کہ تیرا نسا نہ اتنا چھا ہے یا پھر کسی اور کو کب لگا کہ تجھ میں اللہ نے یہ صلاحیت رکھی ہے۔۔۔ آجکل جب وہ پریشان سا رہنے لگا تھا تو اسکے دوست اکثر اسکی دلجوئی کیلئے کوئی نہ کوئی ایسی بات کر لیتے تھے۔۔۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور بتانے لگا۔۔۔

رحمتے! میں منہ توڑ دو ٹکا تمہارا۔ رشید چیخا۔

جواب میں رحمت اللہ نے صحن میں پڑا ہوا ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اسے مارا جو سیدھا جا کر اس کے سر پر لگا۔ وہ تلملا کر ادھر ہی بیٹھ گیا۔

رحمت اللہ اور رشید گل کے گھر پاس پاس ہی تھے۔ آج مسجد آتے ہوئے رستے میں کسی بات پر دونوں میں ان بن ہوئی تھی اور مسجد میں داخل ہوئے تو دونوں ہی غصے میں تھے۔ اب پتہ نہیں کہ اس نے قصداً ایسا کیا تھا یا غلطی سے ایسا ہوا تھا لیکن اچانک سے رشید کا پاؤں پیچھے آتے ہوئے رحمت کے پیروں کے سامنے آ گیا۔ اور وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے آؤدیکھا نہ تاؤ اور رشید کے مڑنے سے پہلے ہی اس کی کمر پر ایک زور کا چرمانا مارا۔ وہ بلبلا تا ہوا آگے جھکا اور فوراً سے مڑ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ رحمت اللہ کو اس تھپڑ کی امید نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور دانتوں سے اس پر کاٹ لیا۔ اس کی کاٹ اتنی تیز تھی کہ رشید کی چیخ نکل گئی۔ بہت مشکل سے اس نے اپنی کلائی کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ اس ساری جدوجہد میں رحمت اللہ کو ایک دھکا لگا اور وہ پیچھے جا کر گر گیا۔

میں منہ توڑ دو ٹکا تمہارا۔

رشید نے درد سے کراہتے ہوئے دھمکی دی۔ اور اس دھمکی اور وہ دھکا جو رحمت کو لگا تھا کا اثر یہ ہوا کہ رحمت نے صحن میں پڑا ہوا پتھر اٹھا یا اور تاک کر نسا نہ لیتے ہوئے رشید کو دے مارا جو سیدھا اس کے سر پر جا کے لگا۔ وہ جو پہلے ہی درد سے بلبلا رہا تھا اس اچانک حملے پر تلملا اٹھا۔ پتھر لگنے سے اس کا سر پکرا گیا تھا۔

اور وہ ایک ہاتھ سے سر تھا۔ مے زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ لڑائی سات سالہ رحمت اللہ اور اس سے پورے چار سال بڑے رشید کے بیچ میں ہو رہی تھی۔ رحمت نے اپنی عمر کے سات سالوں میں کافی قد کا ٹھٹھ نکال لیا تھا۔ دوسری اس کی عادت تھی کہ گھر میں جو بھی بنا ہوتا تھا وہ پیٹ بھر کے کھاتا تھا۔ اسے کھانے سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے وہ کسی بھی لحاظ سے رشید گل سے کم نہیں لگتا تھا۔ پہلی بار دیکھنے والا اکثر اسے اسی کے بھائی اصغر علی سے بڑا سمجھتے۔ جبکہ درحقیقت ان دونوں کی عمروں میں ساڑھے تین سال کا فرق تھا۔

تھوڑی طبیعت سنبھل جانے پر رشید اٹھا۔ اس بار وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کو رحمت کو ڈر لگا لیکن اگلے لمحے جب وہ رحمت کی کلائی پکڑ رہا تھا عین اسی وقت قاری صاحب کمرے سے نکلے۔ رشید ان کو دیکھ کر رک گیا اور پھر اچانک کوئی خیال آنے پر وہی پتھر اٹھا کر ان کی طرف مڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ رشید قاری صاحب کو اس کی شکایت لگانے گیا ہے۔

بزدل کہیں کا۔۔۔ میں نے مار مار کر کچھ مر نکال دیا تو اب قاری صاحب کو شکایت لگانے چل پڑا۔ خود اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجھ سے مقابلہ کرتا۔ وہ بڑبڑایا۔ لیکن اس کی آواز صرف اسی نے خود ہی سنی تھی۔ وہ امید کر رہا تھا کہ ابھی قاری صاحب اسے بلا کر ڈانٹیں گے۔ اور اس نے اپنے ذہن میں رشید کی شکایتوں کے انبار بنالے تھے جو اس نے قاری صاحب کے سامنے دہرانے تھے۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے رشید کی پوری بات سن کر بھی اسے نہیں بلایا۔ بلکہ اسے اندر بھیج دیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اسکے ہاتھ میں اس کی قرآن مجید تھی۔ مسجد کے کونے میں کچھ لڑکے بیٹھے تھے اور وہ اپنا پچھلا سبق دہرا رہے تھے۔ رشید بھی جا کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رحمت وہی کھڑا رہا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ قاری صاحب اسے بلا کر جھڑکیں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ اس کی بجائے انھوں نے اسے بلا کر اپنا سپہرا اندر سے نکال کر پڑھنے کا کہہ دیا۔ وہ غنیمت جان کر خاموشی سے اندر گیا اور سپہرا نکال کر صحن میں بیٹھے باقی بچوں کے ساتھ پڑھنے لگا۔۔۔

رحمت بیٹا۔ ادھر آؤ میرے پاس۔۔

بچوں کی چھٹی کے بعد قاری صاحب نے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قاری صاحب اسے ڈانٹیں گے لیکن انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے کمرے سے نکلے ہوئے رشید کو بھی اپنے پاس بلایا تھا۔ اب صحن میں صرف وہی دونوں اور قاری صاحب رہ گئے تھے۔

رحمت بیٹا! مار کٹائی کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اب آپ دونوں بڑے ہو گئے ہو پھر اس طرح

کیوں لڑے ہو آپ تو دوست ہو اور میں نے اکثر آپ کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔
 قاری صاحب میں نہیں لڑا۔ لڑائی اسی نے شروع کی تھی۔ اس نے وضاحت دی
 یہ بالکل جھوٹے بول رہا ہے قاری صاحب۔ میں اپنے راستے ہی چل رہا تھا کہ اس نے مجھے چمکی کافی۔
 رشید گل غصے میں بولا

یہ جھوٹا ہے قاری صاحب۔ میں نے کوئی چٹکی نہیں کائی۔ بلکہ اس نے پاؤں رکھ کر مجھے گرانے کی کوشش کی۔ وہ بھی اپنا دفاع کر رہا تھا۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب دوبارہ رزومت۔ کوئی بات نہیں اگر کسی نے تمہاری چکی کاٹی اور کوئی بات نہیں اگر کسی کا باؤں غلطی سے تمہارے سامنے آگیا۔

لیکن قاری صاحب غلطی سے نہیں

رحمت بیٹا اس بات کو اگر آپ رہنے دو کہ رشید نے غلطی سے ایسا کیا یا قصداً لیکن آپ نے جس طرح مارا اس کو وہ بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا۔ اگر واقعی میں رشید نے غلطی سے ایسا کیا ہو تو پھر آپ نے جو اتنا مارا تو مار کر گناہ کما یا نا۔ قاری صاحب بہت آرام سے سمجھا رہے تھے۔

قاری صاحب۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا

اچھا چلو بیٹا۔ غلطی کی بات کو رہنے دیتے ہیں۔ چلیں ٹھیک ہے کہ رشید نے آپ کو گرانے کی کوشش کی لیکن اگر آپ اسے جواب میں نہ مارتے تو سوچیں کہ اللہ آپ سے کتنا خوش ہوتے اور دوسری بات یہ کہ وہ آپ سے بڑے بھی ہیں تو آپ کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ اور پتھر تو مارنا بالکل نہیں چاہیے تھا بیٹا۔ وہ کہیں ادھر ادھر جگہ یہ لگ جاتا جیسے آنکھ میں تو کیا کرتے پھر۔

دونوں بچے قاری صاحب کے پاس زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں کو بہت آرام اور سکون سے سمجھا دیا تھا۔ اب وہ سمجھ گئے تھے یا نہیں یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اس وقت جس طرح وہ قاری صاحب کے سامنے بیٹھے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ سمجھ چکے ہیں۔

چلو بیٹا اب دونوں اٹھو اور گلے ملو ایک دوسرے سے شاباش۔ تم دونوں بھائی ہو آپس میں اور بھائی لڑتے ہیں لیکن پھر صلح بھی کر لیتے ہیں۔ آخری جملہ قاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور ایک دوسرے سے گلے مل کر وہ دونوں اپنے اپنے گھر آ گئے۔

ان دونوں کی لڑائی تو اس دن قاری صاحب نے ختم کروادی تھی لیکن اس لڑائی کا ایک فائدہ
رحمت اللہ کو یہ ہوا تھا کہ اب محلے کے زیادہ تر بچے اس سے ڈرنے لگے تھے۔ اب ہر بچہ جاننے لگا تھا کہ

رحمت اللہ سے اس کی دوستی ہو جائے تاکہ کوئی اس سے لڑے نہ ملے۔ طاقتور ہونے کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ آپ سے دبتے ہیں۔ ہر شخص آپ سے دوستی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ دشمن بھی آپ کے دوست ہو جاتے ہیں۔ یہی حال رحمت اللہ کے ساتھ بھی تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ جس میں سے کچھ تو اس کی اپنی عمر کے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو بڑے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے رحمت سے دوستی کر لی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے اپنے سے چار سال بڑے رشید کی پٹائی لگائی تھی اور وہ اس واقعے سے پہلے خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ خود سے بڑے لڑکے کو اتنا مار سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس کا نانا نہ اتنا اچھا ہے کیوں کہ نتیجہ جانے بغیر اس نے پتھر سے رشید گل کے سر کا ہی نٹا نہ لیا تھا اور پتھر سیدھا جا کے اس کے سر پر لگا تھا۔ اب یہ رشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے نٹا نہ سر کے اوپری حصے کا ہی لیا ورنہ پتھر جا کے اس کی آنکھ بھی پھوڑ سکتا تھا۔ اب اس کے بہت سے دوست بن گئے تھے۔ انکے ساتھ گھوم پھر کر اسے مزا آتا تھا اور وہ لوگ اکثر ادھر ادھر شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کا نانا نہ کتنا اچھا تھا یہ تو اس لڑائی میں سب کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اب تو اکثر بچے مل کر نٹا نہ بازی کے چھوٹے چھوٹے مقابلے کرتے رہتے تھے۔ سب چاہتے تھے کہ وہ جیت جاتے لیکن حیرت انگیز طور پر جس بھی مقابلے میں وہ شریک ہوتا کوئی اور جیت ہی نہ پاتا۔ اس کا نانا نہ دو صورتوں میں چوکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ جب نانا نہ اتنا دور ہوتا کہ وہ پتھر اس تک پہنچا ہی نہ پاتا اور دوسرا یہ کہ جب اس کا دل مقابلہ کرنے کو نہ چاہتا اور وہ جان بوجھ کر نٹا نہ سہی نہ لیتا۔ وہ لوگ مل کر بہت شرارتیں کرتے تھے۔ چلتی گاڑیوں کے شیشے کا غلیل سے نٹا نہ لے کر پتھر مارتے تھے۔ کبھی لگ جاتا تھا اور کبھی نہیں۔ ایک دو بار پکڑے بھی گئے تھے اسی شرارت کے دوران لیکن پھر اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ درخت پر چڑھ کر خود کو پتوں میں چھپا لیتے اور ناک کرنا نہ لے لیتے۔ اور اکثر نٹا نہ رحمت اللہ ہی لیتا تھا۔ اس لیے کہ سب کو یقین تھا کہ اس کا نانا نہ بہت کم چوکتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ خوب ہنستے تھے جب پتھر جا کر زور سے گاڑی کے شیشے سے ٹکراتا۔ کسی گاڑی کا شیشہ تو کبھی ٹوٹا نہیں لیکن چھوٹی موٹی دراڑ اکثر شیشے میں پڑ ہی جاتی تھی اور جب گاڑی کا مالک سراسیمگی کی حالت میں گاڑی سے نکل کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہوتا تو وہ لوگ تھوڑی دور کسی درخت کے پتوں میں چھپے ہوئے یا کسی دیوار کے پیچھے منہ ہی منہ میں ہنستے اور جیسے ہی وہ شخص چلا جاتا تو درخت سے اتر جاتے یا دیوار کی اوٹ سے نکل آتے اور کھی کھی کر کے خوب ہنستے اور ایک دوسرے کو خوب شاباشیاں بھی دیتے ایسے جیسے کوئی بہت بڑا کام سرانجام دیا ہو۔

وہ سب بچے غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے ماں باپ کے بچے تھے جو بہت مشکل سے دو وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھا پاتے تھے۔ ان کی تربیت کی کس کو فکر تھی اور جہاں اتنی غربت ہو وہاں

ترہیت ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ والدین کو فکرِ معاش سے فرصت ملے گی تو وہ تربیت کا سوچیں گے۔ اور فکرِ معاش سے آزادی کم از کم اس محلے کے آدھے سے زیادہ گھروں میں تو ممکن نہیں تھی سو یہ سارے بچے صرف کھانا کھا کر ہی بڑے ہو رہے تھے۔ تربیت نام کی بلا سے وہ نا آشنا تھے۔ وہ معاشرے کے ساتھ ہی بڑے ہو رہے تھے اور معاشرہ کب کسی کا خیر خواہ ہوا ہے جو انکا ہوتا۔ لے دے کے ایک قاری ادریس ہی تھے جو صبح شام یہی کوشش کرتے تھے کہ ان بچوں کو سہی اور غلط کی تیز سمجھا سکیں لیکن ان کی ساری کوشش پر پانی پھرتا ہوا نظر آتا جب سڑک پر سے گزرتی کسی گاڑی کے شیشے پر کسی انجان سمت سے پتھر آ کر لگتا اور شیشے میں چھوٹی سی دراڑ پڑھ جاتی۔ اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ سب ادھر ادھر سے نکل کر ایک دوسرے کو ٹا باشی دے رہے ہوتے۔

کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ بچے خود بھی انجان تھے کہ وہ گاڑیوں پر پتھر پھینک کر اور ان کے شیشے توڑ کر خوش کیوں ہوتے ہیں اور اس چیز میں مزا کیا ہے لیکن بس وہ صرف یہ جانتے تھے جب گاڑی کا مالک گاڑی سے نکل کر ادھر ادھر غصے میں دیکھتا ہے اور وجہ ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سر ہلاتا ہوا واپس گاڑی میں بیٹھتا ہے تو بہت مزا آتا ہے اور اس کی حالت پر بہت ہنسی بھی۔ شاید اس خوشی کی وجہ غصہ تھا جو انہیں ان گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر آتا تھا۔ وہ سب ان ماں باپ کے بچے تھے جو گاڑی تو کیا ایک سائیکل تک خریدنے کے لیے دو سال تک ایک ایک پیسہ جوڑتے تھے۔ تو گویا وہ پتھر مار کر اور شیشہ توڑ کر اپنی دانست میں انتقام لیتے تھے۔ کس چیز کا؟؟؟ یہ وہ بچے خود بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ تو صرف مزے کے لیے کرتے تھے۔

ہیلو ابو! ابو میں پاس ہو گیا ہوں۔ کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے میں نے۔ اس نے خوشی سے اپنے باپ کو بتایا جو اس وقت ٹیکسی میں کوئی سواری لیے منزل کی طرف جا رہا تھا۔ احسان خان کچھ نہیں بولا۔ بس جیسی سی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

ہیلو ابو! آپ کو آواز آرہی ہے میری؟؟؟ اسے فکر ہوئی کہ شاید باپ نے اس کی بات سنی ہی نہیں جو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ باپ کے پاس خوشی کے اظہار کے لیے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ بولنا چاہ رہے تھے لیکن الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ زیادہ خوشی اور زیادہ غم کے مواقع پر الفاظ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم بولنا چاہتے ہیں اپنے احساسات بتانا چاہتے ہیں لیکن زبان کچھ بھی بولنے سے انکاری ہو جاتی ہے۔ ایسے جیسے زندگی میں کبھی کوئی لفظ بولا ہی نہ ہو۔ احسان کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ وہ بولنا چاہتا تھا کہ وہ

کتنا خوش ہے۔ وہ یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کی کامیابی کا سن کر اس کا سینہ ہمیشہ کی طرح کتنا چوڑا ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ بیٹے کی کامیابی کا سن کر اسے اپنی محنت کی ایک ایک پائی وصول ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی وہ بتا نہیں سکا۔ بمشکل تمام یہ کہہ پایا ہاں بیٹا مجھے آواز آگئی ہے۔ اور میں نے سن بھی لیا ہے۔

تو پھر آپ کچھ بولتے کیوں نہیں ابو؟؟؟ آپ خوش نہیں ہوئے کیا؟؟؟ اسے جانے کس بات کی فکر ہوئی۔

بیٹا میں بہت خوش ہوں۔ بہت زیادہ۔ لیکن میں اس وقت گاڑی چلا رہا ہوں۔ سواری ہے میرے ساتھ۔ میں سواری اتار کر سیدھا گھر ہی آتا ہوں۔

کس مشکل سے اس نے یہ بولا تھا یہ وہ ہی جانتا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکان دھیمی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہی مسکان بتا رہی تھی کہ وہ کتنا خوش تھا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مرد اگر فون پر مصروف نہ ہوتا تو اس کی آنکھوں میں جھللاتے قطرے واضح دیکھ لیتا۔ دوسری طرف سے ٹھیک ہے ابو کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ فیصل جانتا تھا کہ اس کے ابو ڈرائیونگ کرتے ہوئے کبھی بھی فون نہیں اٹھاتے لیکن آج اس کے ابو کا فون کھلا تھا اور نہ صرف کھلا تھا بلکہ وہ گھر سے فون آنے کے انتظار میں تھا۔ اور اسی وجہ سے فون اس نے اپنے سامنے گاڑی کی ڈیک پر رکھا تھا۔

احسان خان نیکی ڈرائیور تھا۔ صبح نکلتا تھا تو شام کو گھر واپس آتا تھا اور کبھی کبھی تو واپسی میں رات ہو جاتی جب کبھی اسے کوئی دور کی سواری ملتی۔ کبھی کبھی وہ دن کا کھانا کھانے گھر آ جاتا لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا۔ سردی ہو یا گرمی بارش ہو یا دھوپ کبھی بھی اس کے معمول میں فرق نہیں آیا۔ اس نے اپنے کام سے کبھی چھٹی نہیں کی۔ صبح ساڑھے سات بجے نکل کر وہ چار بچوں کے گھر جا کر انہیں لے کر سکول چھوڑ آتا۔ پھر سواری کی تلاش میں نیکی ادھر ادھر گھماتا رہتا۔ سارے دن کی محنت کے بعد وہ رات کو تھکا ہارا گھر آتا۔ لیکن اپنے بچوں کو دیکھ کر اس کی ساری تھکان رُو چکر ہو جاتی اور وہ ہشاش بشاش ہو کر اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ کھانا کھاتا اور باتیں کرتا۔ بس یہی اس کی روزمرہ کی روداد تھی۔ اتنی محنت کے باوجود وہ اپنے بچوں کی سکول کی فیسیں ہنسی خوشی بھرتا تھا۔ اسے بس ایک ہی خواہش تھی کہ اس کے بچے پڑھ لکھ جائیں۔ اس مقصد کے لیے اگر اسے دو گنی محنت بھی کرنی پڑتی تو وہ دریغ نہ کرتا۔ اور اس کا بیٹا فیصل اچھی طرح جانتا تھا کہ انکا باپ ان کیلئے کتنی محنت کرتا ہے۔ وہ دل لگا کر پڑھتا تھا اور اس بات کا پتہ اس کے زلزلے سے بھی چلتا تھا۔ نیکی ڈرائیو رکا بیٹا ہو کر وہ اپنی کلاس میں بیٹھے ہوئے بہت سے امیروں کے بچوں سے آگے تھا۔ اور یہی فخر فیصل کی ہر کامیابی پر شاہدہ اور احسان کی آنکھوں میں آنسو لاتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سواری کو اپنی منزل پر اتار دیا اور فوراً ٹیکسی موڑ کر اپنے گھر کے رستے پر ڈال دی۔ آج وہ مزید ٹیکسی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گھر کے راستے میں ایک بیکری پر رک کر اس نے آج صبح سے جتنے پیسے کمائے تھے ان سب سے کی مٹھائی خرید لی اور یہ اس کے ہر سال کا معمول تھا۔ جس دن فیصل کارزلٹ آتا وہ یہی کرتا تھا۔ اپنی جیب خالی کر کے ہی وہ گھر جاتا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو سب اس کے منتظر تھے۔ فیصل نے جیسے ہی گلی میں ٹیکسی کے مڑنے کی آواز سنی فوراً سے پہلے بھاگ کر گھر سے باہر نکل آیا اور بھاگتا ہوا اپنے باپ کی طرف آیا۔ احسان جانتا تھا اس کی اس حرکت کو سو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ٹیکسی روک کر نکل آیا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور چھلانگ مار کر اپنے باپ کے گلے میں جمول گیا۔ وہ جانتا تھا کہ باپ کے مضبوط بازو اسے گرنے نہیں دیں گے۔ اور یہی ہوا احسان نے اسے اپنے گلے لگا کر اٹھا لیا اور ٹیکسی وہی گلی کے باہر چھوڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹیکسی تو وہ بعد میں گھر لے ہی جاتا لیکن خوشی کے یہ لحاظ اس کی زندگی میں بہت کم ہوتے تھے۔ اس لیے وہ ٹیکسی کی فکر میں ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

دوستوں آج ہم حقوق العباد پر بات کریں گے۔ جس میں سب سے پہلے والدین آتے ہیں۔ والدین کے بعد بہن بھائی اور باقی رشتہ دار آتے ہیں۔ اب والدین کے حقوق پر اگر نظر ڈورائی جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے بعد قرار دیا ہے۔ مطلب یہ کہ سب سے پہلے اپنے رب کے حقوق پورے کرنا ضروری ہے اس کے بعد والدین کے۔ اللہ کے حقوق پر ہم پہلے ایک درس کر چکے ہیں سو اس بار ہم بندوں کے حقوق کے بارے میں جائیں گے۔ والدین سے میرا مطلب ماں اور باپ دونوں ہیں۔ اگرچہ حدیث کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں کے حقوق باپ کے حقوق سے تین گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لے سکتے کہ باپ کے حقوق کم ہوتے ہیں۔ آیت سے اندازہ لگالیں کہ اللہ نے اپنی خوشی کو باپ کی خوشی اور اپنی ناراضگی کو باپ کی ناراضگی کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت بار والدین کے حقوق کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے۔

ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھا پے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے آف ٹیک نہ کرنا اور عاجزی سے ان کے آگے جھکے رہنا اور دعا کرنا کہ اے میرے رب! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔

بنی اسرائیل: ۳۲ ۳۳

والدین پیدا کرتے ہیں۔ آپ سب میں اکثر خود بھی شادی شدہ ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ

بچے کے بڑا ہونے کے پیچھے ماں باپ کی کتنی محنت کا دُرا ما ہوتی ہے تو اگر آپ ان سارے مراحل سے گزر رہے ہیں یا گزر چکے ہیں تو اپنے ماں باپ کی محنت کو آپ کیسے بھول سکتے ہیں۔ اب اس آیت میں احسان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی اپنے والدین کی خدمت کرتا ہے تو وہ ان پر احسان کرتا ہے۔ بالکل نہیں۔ اس لیے کہ ہم کچھ بھی کر لیں ان کے احسانات کا بدلہ نہیں اتا سکتے۔ بہت کچھ بھی کر لیں تو ماں کے اس احسان کا بدلہ کیسے اتا ریں گے جو اس نے پورے نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھ کر کہا۔

قاری صاحب نے بہت سال پہلے کچھ کہا تھا لیکن اس وقت اسے اتنا ہی یاد تھا۔۔۔۔۔

فضل اللہ! میرا اور تمہارا اس محلے میں پورے بیس سال کا ساتھ ہے اور ہم بہت اچھے پڑوسی ہیں اس لیے میں نے رحمت کو کچھ کہا نہیں اور تمہیں بتانے آگیا ورنہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور پکڑ بھی لیتا لیکن تمہاری ہمسائیگی کا خیال آگیا۔ اے تم ہی اس کو قابو میں رکھو۔

یہ محلے کا جاوید تھا جو آج فضل اللہ کے گھر رحمت اللہ کی شرارتوں کی شکایت کرنے آیا تھا۔ جاوید محلے کے ان دو چار لوگوں میں سے تھا جن کے بچے گھر تھے۔ ان کے فرش سیمنٹ کے تھے اور کھڑکیوں میں شیشے بھی لگے تھے۔ اور جو کچی زمیں تھی اس پر انھوں نے کچھ پودے اگا رکھے تھے۔ جاوید کے دو بیٹے اور ایک چھوٹی سی بیٹی تھی اور وہ تب سے اس محلے میں رہ رہا تھا جب اس کے ماں باپ زندہ تھے اور وہ غیر شادی شد تھا۔ اب تو وہ چالیس سال کا بھرپور مرد تھا۔ کپڑے کا چھوٹا سا کاروبار کرنا تھا۔ امیر نہیں تھا لیکن اس محلے کے چند ایک بچے گھروں والوں میں اس کا شمار بھی ہوتا تھا۔ وہ صبح اپنی دکان پر جاتا اور دونوں بیٹے سکول۔ پیچھے گھر میں صرف اس کی بیوی نسیم اور اس کی گود میں دس ماہ کی بچی رہتی۔ آج کل جاوید کے گھر میں لگے ہوئے امرود کے دو درختوں پر امرود پک گئے تھے۔ رحمت اور اس کے دوست گیا را بجے تک سبق پڑھ کر فارغ ہو جاتے تو جاوید کے گھر کی راہ لیتے۔ غلیل ان کے پاس ہوتا۔ دیوار کے پاس کھڑے ہو کر رحمت امرود کا نشانہ لیتا اور غلیل سے پتھر مارتا تو امرود ٹوٹ کر پچھے جاوید کے صحن میں جا گرتا۔ اور پھر اس کے دوست نسیم سے نظر بچا کر امرود اٹھا لاتے۔ نسیم کو پتا نہ چلتا۔ کیونکہ ایک تو وہ اپنا کاموں میں مصروف ہوتی تھی۔ کبھی باورچی خانے میں ہوتی تو کبھی کمرے میں بچی کو سلا رہی ہوتی۔ اور دوسرا یہ کہ گھر بڑا تھا اور درخت صحن کے ایک کونے میں تھے۔ سو وہ امرود توڑ بھی لیتے اور اٹھا بھی لیتے اور وہ بے خبر رہتی۔

آج شاید رحمت اللہ کی بد قسمتی کا دن تھا کہ جاوید گھریر تھا۔ کیونکہ اسے کل دن سے بخار تھا۔ وہ

لوگ تو حسب معمول گیارہ بجے اپنا سبق ختم کر کے اس کے گھر کے باہر آ گئے۔ جاوید صحن میں لیٹا ہوا تھا لیکن وہ لوگ اس کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھے۔ رحمت کے ہاتھ میں غلیل تھا اور وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر کبھی ایک اور کبھی دوسری آنکھ بند کر کے اور مختلف زاویوں سے نٹا نہ بنا رہا تھا کہ اچانک سے غلیل کا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی وہ پتھر مارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور وہ ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ پتھر سیدھا جا کر جاوید کی چارپائی کے قریب گر گیا۔ جاوید کی قسمت اچھی تھی کہ اسے لگا نہیں ورنہ ایک آدھ پھوڑا تو ضرور بنتا۔ جاوید بہت ڈر گیا کیوں کہ پتھر اگر اسے لگ جاتا یا اس کے پاس ہی کھڑکی پر لگا جاتا تو دونوں کا نقصان ہونا ضروری تھا۔ وہ اٹھ کر باہر جانے لگا کہ باہر دیکھ لے کہ پتھر کہاں سے آیا کیونکہ اس کے آنے کی سمت بتا رہی تھی کہ وہ دروازے کے ساتھ ملحقہ دیوار کے پار سے آیا ہے۔

دوسری طرف رحمت اللہ اور دوست اس سارے معاملے سے بے خبر امرودوں کو تاڑ رہے تھے اور رحمت نے ایک دوسرا پتھر جو وہ لوگ رستے سے جمع کر کے لاتے تھے جیب سے نکال کر نٹا نہ باندھ لیا تھا۔ اس بار وہ امرود کے بالکل نیچے کھڑا تھا اور نٹا نہ بالکل آسمان کی طرف باندھا تھا۔ اس کے دونوں دوست دوسری طرف تیار کھڑے تھے کہ وہ جیسے ہی امرود گرائے گا ان میں سے ایک چپکے سے گھر میں گھس کر امرود اٹھالائے گا۔ ابھی اس نے نٹا نہ باندھا ہی تھا کہ پیچھے سے جاوید نے آواز دی۔

رحمتے۔۔۔۔ اور رحمتے۔۔

اور اس نے پیچھے دیکھا تو جاوید اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ اس کے دونوں دوست پہلے ہی گلی کے اندر بھاگ چکے تھے۔ کچھ قدم آگے جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جاوید اسے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ پھر تو اس نے اپنی سمت جانے بغیر وہ دوڑ لگائی کہ جاوید تو کیا کوئی بھی اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن بد قسمتی یہ تھی کہ جاوید اسے دیکھ چکا تھا اور صرف دیکھا نہیں تھا بلکہ پہچان بھی گیا تھا اور پھر شام کو فضل اللہ کے گھر آنے پر شکایت لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

ارے نہیں جاوید بھائی۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔ سمجھ جائے گا اور اگر نہ سمجھا تو میں سختی بھی کر لوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ بس اب کی بار معاف کر دیں بچہ ہے۔ فضل اللہ نے التجائی لہجے میں کہا۔

معاف کرنے کی بات نہیں ہے فضل بھائی۔ میں آپ سے کبھی کچھ نہ کہتا اگر آج یہ نہ ہوتا تو۔ آپ کے بچے میرے بچے ہیں۔ امرود لینے آ جاتا تو منع کبھی نہ کرنا لیکن پتھر پھینکنے سے تو کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے نا۔ جیسے آج اگر مجھے لگ جاتا یا کھڑکی پر لگ جاتا تو۔۔ اور پھر میں تو ساری دن گھر میں ہونا بھی نہیں ہوں۔ جاوید غصے میں تھا

مانتا ہوں جاوید بھائی کہ بہت غلط کیا ہے اور آپ کو یقین دلانا ہوں کہ میں اسے قابو کر لوں گا۔ آئندہ نہیں کرے گا ایسی حرکت۔۔۔ فضل بہت شرمندہ تھا۔

چلیں ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ خُدا حافظ

اللہ حافظ جاوید بھائی۔

اور پھر جاوید چلا گیا۔ لیکن شام کو مسجد سے آنے کے بعد فضلو نے رحمت کو اپنے پاس بلایا۔

رحمتے۔۔ ادھر آؤ

جی ابا۔۔۔۔۔ وہ اب کے یاس چلا آیا۔

تجھا مرود بہت پسند ہیں کیا؟؟؟؟؟ انہوں نے گھورتے ہوئے پوچھا

اور امر و کا نام سن کر اس کا دل بلیوں اچھلا اٹھا۔ سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں وہ معاملہ جان گیا تھا۔

لیکن امتحان بنا رہا۔

امرو؟؟ نہیں تو۔۔

تو پھر دوسروں کے گھروں میں پتھر کیوں پھینکتے ہو امر و دہلیز اگر امر و دہلیز نہیں ہیں تو؟؟؟

ابا میں نے تو کسی کے گھر میں پتھر نہیں پھینکا۔ اس آٹھ سالہ بچے کی دروغ گوئی اور ڈھٹائی عروج پر

تھی۔ اگر فضل اللہ جانتا نہ ہوتا تو کبھی اندازی نہ لگاتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

جاوید نے مجھے بتایا ہے آج کہ تم نے اس کے گھر میں پتھر پھینکا اور اس نے تمہیں غلیل کے

ساتھ دیکھ لیا ہے۔۔

جاوید چچا بالکل جھوٹ بول رہے ہیں اب۔ میں نے کچھ----- وہ اب بھی اپنی بات پر

ڈھٹا ہوا تھا۔

اور ایک زمانے دا چھڑ اس کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ اپنے سے پینتیس سال بڑے شخص کو

جھوٹا کہنا فضل کو غصہ دلا گیا۔ اس نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اپنے بیٹوں کو تیز سکھاسکے اور باقی سارے

نیچا ادب بھی تھے لیکن آج پہلی بار اس نے اپنی اولاد میں بے ادبی دیکھی تھی تو غصہ آگیا۔

اور یہ بھی بتا دو کہ غلیل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟؟ کڑک دار آواز میں پوچھا گیا۔

ابامیرے یاس غلیل نہیں ہے۔۔ وہ رونے کے قریب تھا

میں کہتا ہوں سچ سچ بتا دو کہ غلیل کہاں سے آیا ورنہ بہت مارونگا رحمۃ اور تمہارے ساتھ اور کون تھا

یہ بھی بتا دو۔۔۔ اب کی بار فضل نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔

آئینہ پیسی۔۔۔۔۔ ابا۔۔۔۔۔ کان چھوڑ دیں۔ بہت در و دہور ہے۔۔۔

اماں -----

رحمتے میں کہتا ہوں جلدی سے سچ بتا دو ورنہ بہت مار پڑے گی۔ اس نے کان اور کھینچا۔
اسنے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ جیلہ اس کی چیخیں سن کر جلدی سے باورچی خانے سے نکل آئی۔
ارے ----- یہ کیا کر رہے ہو فضل؟؟؟؟ وہ بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ ماں تھی۔ بیٹے
کو بچانے تو آتا تھا۔

تم دور رہو جیلہ۔۔۔ مجھے اس سے خود ہی بات کرنے دو۔ اس نے غصے میں جیلہ کو بھی ڈانٹا۔ وہ وہی
کھڑی رہی۔ اسے بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ صابر و ثنا کر فضل آج اتنے غصے میں کیوں ہے۔۔۔
ابا چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔۔ اس نے روتے ہوئے صدا لگائی۔

تم مجھے ابھی اور اسی وقت بتا رہے ہو کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا اور تمہارے پاس غلیل کہاں سے
آیا؟؟ ورنہ حشر کروں گا تمہارا رحمت۔۔۔۔۔ آج پہلی بار وہ اتنا غصے میں تھا۔ رحمت صبح کے واقعے کے بعد
جانتا تھا کہ جاوید شکایت ضرور لگائے گا۔ لیکن ابا اس کو ایسی سزا دینگے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں
تھا۔

ابا وہ -----

ہاں وہ -----؟؟؟؟؟؟

ابا وہ فہیم اور الیاس تھے۔

اور غلیل کس کا تھا؟؟؟

الیاس کا تھا ابا۔۔۔

اچھا۔۔۔۔۔ وہ الیاس جو ایوب کا بیٹا ہے ما؟؟؟؟ اس نے پوچھا۔

جی۔ در دھرا ایک لفظی جواب آیا۔

فضل نے اس کا کان چھوڑ دیا اور وہ بھاگ کر اس سے دور کھڑا ہو گیا اور مڑ کر اس کی طرف ایسے دیکھنے
لگا جیسے بھی وہ اس پر دوبارہ جھپٹ پڑے گا۔

دیکھ رحمتے!! اس بار تو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن آئندہ کوئی شرارت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر آئندہ ایسی کوئی
حرکت کی تو وہ حال کروں گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب جاؤ اور کھانا کھا کر سو جاؤ۔

فضل اللہ نے اسے دھمکی دی۔

وہ کچھ کہہ بغیر روانہ ہو گیا۔

تو نے سن لی ما میری بات؟؟؟؟ فضل اللہ نے پیچھے سے چیخ کر پوچھا۔

جی۔۔۔ ایک لفظی جواب آیا۔

اور پھر وہ جان گیا تھا کہ اسکا نشانہ واقعی اچھا ہے اور یہ صلاحیت اسے خدا کی طرف سے عنایت ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ اور اسکے دوست ہی جانتے تھے۔۔۔

مجاہد اللہ تم نے کیا سوچا ہے؟؟؟

کس بارے میں؟؟؟

اس دن میں نے بتایا تھا تمہیں۔ ایک پیشکش دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں یاد ہوگی لیکن شاید تم بھول گئے ہو تو دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ۔۔۔

مجھے سب یاد ہے دوبارہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ترنت کر بولا

تو پھر کیا سوچا تم نے؟؟؟ وہ آج بھی اپنے اسی لہجے میں بول رہے تھے جس سے وہ دلوں کو رام کرتے رہتے تھے

میں تیار ہوں لیکن میں آپ پر اب یقین نہیں کر سکتا۔ آپ دھوکہ بھی کر سکتے ہیں میرے ساتھ۔ کئی دنوں میں وہ کافی کچھ سمجھ گیا تھا۔

تو یقین کیسے آئے گا تمہیں؟؟

یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب میں آپ پر کسی بھی طرح کوئی اعتبار نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے ایک بار پھر بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔ وہ غصے میں تھا

کیسا دھوکہ؟؟؟

آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے آزاد کر دیں گے لیکن اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو؟؟ جیسے ابھی مجھے قید کر لیا ہے تب بھی کر سکتے ہیں اور پھر میں کون ہوتا ہوں آپ کو وعدے کی پابندی پر مجبور کر سکتے والا۔۔۔

تو کس طرح کا یقین چاہتے ہو؟؟؟ تمہیں کس طرح یقین دلایا جائے؟؟؟

میرے لیے بہت مشکل ہے آپ پر یقین کرنا۔

اگر قرآن پر حلف اٹھالیا جائے کہ تمہیں اس مشن کے بعد آزاد کر دیا جائے گا تو مان جاؤ گے

؟؟؟؟

اس نے گھور کر انہیں دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس بات کی امید نہیں تھی اسے۔۔۔

دیکھو بچے میرے لیے یہ بھی مشکل نہیں تھا کہ تمہاری بغاوت کے ساتھ ہی تمہیں مروادیتا اور

میرے لیے یہ بھی مشکل نہیں ہے کہ ابھی اسی وقت تمہیں مروا دوں لیکن میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔ تمہیں مار کر مجھے کوئی فائدہ نہیں ملے گا نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچے گا۔ لیکن تمہیں زندہ رکھ کر مجھے بھی فائدہ ہے اور تمہیں بھی اور تمہارے گھر والوں کو بھی لیکن ہم سب کا فائدہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ تم مجھے فائدہ نہیں دو گے تو بدلے میں تمہیں بھی نقصان ملے گا۔ اور اگر مجھے فائدہ دو گے تو میں بھی تمہیں دے دوں گا۔ ایسے میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو فائدہ دے دیتے ہیں۔ تم اس مشن میں میری مرضی کے مطابق کام کر لو اور بدلے میں میں تمہیں بھول جاؤں گا۔

اگر میں ایسا نہ کروں تو؟؟؟؟

تو جان لو کہ مجھے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ میرا کام تب بھی ویسا ہی ہوگا۔ جب تم نہیں تھے تب بھی ہم یہی کام کرتے تھے جب تم نہیں ہو گے تب بھی ہم یہی کام کریں گے۔ ہمارا کام تو چلتا رہے گا۔ تم نہیں تو کوئی اور آجائے گا۔ یہ ضرور یا درکھو کہ ہر رہنما اپنے حصے اور قسمت کے بے وقوف اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ فرق پڑے گا تو صرف تمہیں۔۔۔

کیسا فرق؟؟؟؟

تم اچھی طرح جانتے ہو لیکن چلو میں دوبارہ بتا دیتا ہوں کہ تمہارا ایک جیٹا اور ایک بیوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

خبردار اگر میری بیوی اور بیٹے کے بارے میں کوئی بات بھی کی تو۔۔۔ وہ زور سے چیخا باہا۔۔۔۔۔ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

جانتا ہوں مجاہد اللہ جانتا ہوں۔ بس تمہیں صرف یہ بتانا تھا کہ تمہارے گھر میں اسکے علاوہ بھی آٹھ لوگ موجود ہیں جن میں سے تین چار سے تو بہت محبت کرتے ہو تم۔ اور تم کبھی نہیں چاہو گے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچے اور میرا خیال ہے کہ انکی موت کا تو تم سن بھی نہیں پاؤ گے۔۔۔۔۔ انکی رگیں تن گئی۔ ایسے جیسے بہت غصے کو قابو میں رکھا ہو

جیسا آپ چاہ رہے ہیں میں ویسا کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا

میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔۔۔۔۔

مجھے یقین نہیں ہے۔۔۔۔۔

وہ اندر گئے اور چند لمحے بعد واپس آئے۔ انکے ہاتھ میں قرآن مجید تھی وہ اسکے قریب آ کر کھڑے ہوئے اور بولے۔

میں اس کتاب پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں کہ اگر تم میری مرضی سے چلو گے تو میں تمہارے کسی بھی اپنے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور جب تم اپنے ساتھیوں سمیت یہ کام کر کے آ جاؤ گے تو کچھ دن تمہیں زیر زمین رکھنے کے بعد آزاد کر دوں گا اسکے بعد تم آزاد ہو گے چاہے جہاں بھی جاؤ لیکن تمہیں میرے ساتھ یہ وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم ساری زندگی یہاں کے راز اپنے سینے میں دبائے رکھو گے اور کبھی بھولے سے بھی دوبارہ یاد نہیں کرو گے۔ وقرآن پر ہاتھ رکھ کر بولے

وہ چند ثانیے رکے اور پھر دوبارہ اندراج کر قرآن مجید رکھ آئے۔

اگر اب بھی تمہیں یقین نہیں ہے مجاہد تو میں کل کی فجر کی نماز میں اعلان کر دوں گا اسکے بعد تو تمہیں یقین کر لینا چاہئے کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کیے گئے وعدے سے میں مکر نہیں سکوں گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولتے رہے اور اسکے اندر ایک لاوہ پھٹتا رہا

ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ بمشکل تنا کہہ کر وہ جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔

حمزہ ہم نے کم سے کم کتنی مختلف جگہوں پر حملے کیے ہونگے؟؟؟؟

اس رات کھانے سے فارغ ہو کر وہ سونے کیلئے لیٹے تھے کہ مجاہد نے اچانک سے سوال کیا۔

کیا مطلب؟؟؟ وہ اسکی طرف مڑا

میں نے کوئی مشکل بات نہیں پوچھی اور نہ ہی ایسی جو تمہیں معلوم نہ ہو۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے

طنز کیا۔۔

حمزہ اسکی طرف دیکھتا رہا۔

حمزہ کی عادت تھی کہ مولانا صاحب کے حکم پر کوئی بھی مشن کرنے کے بعد واپس آ کر وہ ایک کاپی میں اسکا نام لکھتا تھا۔ سارے دوست اس پر ہنستے تھے لیکن وہ ہنستے ہوئے جواب دیتا تھا کہ اگر قیامت میں اسکے گناہ زیادہ ہو گئے اور فرشتے کچھ بھول گئے تو وہ یہ کاپی تو پیش کر سکے گا جس میں اسکی دین کی سر بلندی کی کاوشیں محفوظ تھیں۔۔۔ اور اسی عادت کی وجہ سے مجاہد اس پر طنز کر رہا تھا۔۔۔

کل نو ہو گئے ہیں۔۔۔

ہم۔۔۔ تمہیں یاد ہے حمزہ جب ایک بار ہم نے ایک بازار میں منبتے لوگوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ ہم نے یہ تک نہیں دیکھا تھا کہ وہاں معصوم بچے بھی تھے اور خواتین بھی تھیں لیکن پھر بھی ہم نے گولیاں برسائی اور ہمیں حکم مولانا صاحب نے دیا تھا۔ وہ چپست کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بولتا رہا۔

تو خواتین کو وہاں بازاروں میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟؟؟ جب اللہ اور رسول ﷺ نے

خواتین کو بازاروں میں گھومنے سے منع کیا ہے تو پھر اتنی بڑی تعداد میں وہاں گھومنے اور وہ بھی ساری کی ساری ننگے سر کیا ضرورت تھی۔ اور مولانا صاحب نے بالکل ٹھیک کیا اور ہم نے بھی کہ جہاں اتنی بے حیائی پھیلی ہوگی وہاں کسی طریقے سے تو انہیں روکنا پڑے گا۔۔۔

حزہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی کو جان سے مارنے کا کوئی حق نہیں ہے بے شک وہ جتنا بھی گناہگار ہو۔۔۔

ایسا نہیں ہے مجاہد۔ برائی کو روکنے کیلئے کسی کو تو قدم اٹھانا پڑتا ہے۔۔۔ وہ جذبات میں تھا تو برائی روکنے کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جانیں لے لیں؟؟؟ کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا تھا۔۔۔ تمہیں لگتا ہے مجاہد کہ ہم اگر وہاں جا کر ان خواتین کو کہتے کہ بہن جی آپ نے بہت غلط کیا ہے کہ آپ بازار آگئی ہیں اور وہ بھی اس حلیے میں کہ ہر شخص کیلئے آپ دعوتِ نظارہ بنی ہوئی ہیں۔ اس لیے آپ اللہ سے توبہ کر لیں اور اپنی عزت کا خیال کرتے ہوئے اپنے گھر کی چار دیواری میں رہا کریں تو وہ مان جاتیں؟؟؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا مجاہد اور نہ ہوتا ہے سو پھر ہمارے پاس ایک ہی رستہ ہے ماکہ ہم انہیں ڈرائیں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔

اسنے یہ کہہ کر روٹ لی اور سو گیا لیکن اسے ایک بار پھر ماضی کے سمندر میں دھکیل گیا جب کسی نے اسے انسانوں کے حقوق سمجھانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔

دوستوں پچھلے درس میں ہم نے والدین کے حقوق پر بحث کی تھی۔ اب ہم بات کریں گے باقی حقوق العباد پر۔ اب آپ کیلئے ضروری نہیں ہے کہ آپ میری بات سے اتفاق کریں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان پر سب سے بڑا حق انسانیت کا ہے۔۔۔ نہیں سمجھے؟؟؟

مطلب میرا یہ ہے کہ اگر کسی انسان کو کوئی تکلیف ہے یا اسے کسی چیز کی ضرورت ہے تو اس بات سے قطع نظر کہ آیا وہ مسلمان ہے یا نہیں ہمیں فوراً اس کی مدد کر دینی چاہیے بھی ہمارے بس میں ہو۔ اب دیکھیں ماکہ اگر کسی گاڑی میں کچھ مسلمان اور کافر ایک ساتھ بیٹھے منزل کی طرف جا رہے ہیں اور راستے میں کوئی حادثہ پیش آیا گاڑی الٹ گئی۔ اب ان لوگوں کو ہماری مدد کی ضرورت ہے تو کیا ہم ان میں سے جو مسلمان ہے ان کی مدد کر دیں گے اور جو نہیں ان کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟؟؟ قطعاً نہیں۔ یا پھر اس بات کو اس طرح لیتے ہیں کہ اگر کہیں پر کوئی شخص زخمی یا بیمار حالت میں پڑا ہے اور اسے آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے اور آپ جانتے ہوں کہ وہ آپ کا محلہ دار ہے لیکن وہ مسلمان نہیں ہے تو کیا آپ کو اسے اسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہیے صرف اس لیے کہ وہ مسلمان نہیں ہے؟؟؟ ایسا تو کوئی بھی نہیں کر

سکتا۔ کیوں کہ ہمارا مذہب ہمیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ہم غیر مسلموں سے بھی حسن سلوک اپنائیں۔ میری بات سنو دوستوں۔۔۔ آپ کو ہر مذہبی انسان کہے گا کہ اچھا مسلمان بنو۔ اچھا مذہبی انسان بنو لیکن قاری ادریس آپ کو یہ بھی نہیں کہے گا کہ اور کچھ کرو یا نہ کرو بس عبادتیں کر کے اچھا مسلمان بننے کی کوشش کرو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ چلتی پھرتی دونوں کی مخلوق جو اللہ کی عبادت بھی کرتی ہے اور سجدوں میں بھی گری رہتی ہے اور مسلمان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کی زمین بھری ہوئی ہے۔ ایک ہجوم پھیلا ہوا ہے زمین کے ایک کونے سے دوسرے تک لیکن اس بھری ہوئی زمین پر صحیح معنوں میں مسلمانوں کی تعداد گنی چکنی ہی ہے۔ تو کچھ بھی بننے سے پہلے اچھا مسلمان بنو۔ اچھا مسلمان بنو گے تو اچھا انسان خود ہی بن جاؤ گے کہ ہمارے نبی تو یہودیوں کی بھی عزت کرتے تھے اور انکی بھی مدد کرتے تھے۔۔۔۔۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اچھے مسلمان بنو صرف عبادت گزار مسلمان نہیں۔ اچھے مومن کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ہر انسان کو اہمیت دینی چاہئے اسے عزت دینی چاہیے۔ ہر انسان سے محبت کرنی چاہئے۔ چاہے وہ مسلمان ہو یا نہ ہو۔ ہمارے حسن سلوک کے لیے سامنے والے کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا ہم سب چاہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام پھیل جائے۔ اور کفر ختم ہو جائے۔ لیکن ہم اس کے لیے خود کو بد لئے پر قطعاً تیار نہیں ہیں۔ ہم لوگ اپنے سے پیچھے ہر غیر مسلم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے اس میں ہمارا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔ بس ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے کو اور خاص طور پر غیر مسلم کو تو ضرور نقصان پہنچالیں۔ اب یہ بات انسانیت اور مسلمانیت دونوں کے سخت خلاف ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام ہمیں یہ نہیں سکھاتا۔ دوستوں میں کہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی انسان مذہب ہے جو اپنے پیروکار کو سکھائے کہ قتل کرو۔ دھوکا دو۔ جھوٹ بولو۔ کوئی بھی مذہب نہیں۔ ہر مذہب سب سے پہلے انسانوں سے پیار کا درس دیتا ہے۔ ہر مذہب قتل کرنے کی مذمت کرتا ہے۔ ہر مذہب جھوٹ اور دغا بازی کو روکتا ہے۔ ہم میں اور دوسرے مذاہب میں فرق صرف عبادات کا ہے۔ تعلیمات سب مذاہب کی ایک ہی جیسی ہیں۔ جیسے اسلام ہمیں زنا سے روکتا ہے تو کونسا مذہب ہے جو زنا کو پسند کرتا ہے؟؟ اسلام قتل سے روکتا ہے تو کونسا مذہب پسند کرتا ہے۔ آپ میری بات کو سمجھیں۔ فرق صرف عبادات کا ہے۔ ہم ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو کچھ مذاہب بہت سے خداؤں کا پرچار کرتے ہیں۔ ہم مسجد میں ماتھا جھکاتے ہیں تو کوئی مندر میں اور کوئی گر جائیں۔ لیکن سکھانا سب کا مذہب سب سے پہلے انسانیت ہے۔۔۔ مندر میں سجدہ کرنے والے کو اس کا مذہب یہ نہیں کہتا کہ وہ مسجد میں سجدہ کرنے والوں کو مار ڈالے۔ ایک اللہ کے ماننے والے کو اجازت نہیں ہے کہ وہ دیوتا کے پجاری کو کوئی مار دے یا گر جا کر آگ لگا دے۔ اور یہ جو ایک آواز ہے یہ

کسی مذہب کی نہیں ہے۔ یہ پیغام انسانیت کا ہے۔ یہ پیغام تب بھی تھا جب اسلام نہیں آیا تھا۔

اب آپ یہ بتائیں کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے صرف پانچ وقت کی نماز کافی ہے کیا؟ بالکل نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ نماز روزہ زکوٰۃ حج اسلام کے بنیادی ارکان ہیں لیکن صرف یہی اسلام نہیں ہے۔ اسلام تو صرف مذہب نہیں ہے۔ بلکہ زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ ایک رہنما ہے۔ اب ہم اس سے کتنی رہنمائی لیتے ہیں یہ ہم پر منحصر ہے۔ ہمارے نبی نے ہمیں صرف تعلیمات نہیں دی بلکہ زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا۔ لیکن المیہ ہمارا یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو صرف مذہب سمجھ لیا ہے۔ یعنی صرف عبادات کا ایک مجموعہ۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ عبادات کو تو اسلام نے عملیات کے بعد رکھا ہے۔ جیسے کہ نماز کو چھوڑ دو اور بعد میں قضا پڑھ لو لیکن اگر کسی کو اشد ضرورت ہے تو وہ پہلے پوری کرو۔ یا پھر یہ کہ داڑھی رکھنا افضل ہے لیکن اگر کسی نے نہیں رکھی تو ہم اس کے اوپر کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ بلکہ ہم کسی کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے۔ جو آج کل کے مولوی اور علما کرتے ہیں سب غلط ہے۔ ہم خود گناہگار ہیں ہم کیا سمجھ سکیں کہ جس کو ہم اپنی دانست میں داڑھی نہ رکھنے اور کچھ نمازیں چھوڑنے کی وجہ سے کافر سمجھ رہے ہیں اللہ کے نزدیک اس کا کیا مقام ہے۔ کیوں کہ اللہ کے دفتر میں صرف نماز روزے سے کام نہیں چلتا۔ اللہ نے اختیار اپنے پاس رکھا ہے کہ اگر اس کا بندہ گناہ کرے اور پھر مادم ہو کر معافی مانگے تو وہ فوراً اسے معاف کر دے لیکن کسی انسان کا حق مارنے یا اسے کوئی نقصان پہنچانے کے بعد اللہ بھی اس کو معاف نہیں کرتا جب تک وہ شخص آپ کو معاف نہ کر دے جس نے نقصان اٹھایا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ اللہ نے اسلام کو صرف عبادات کا ایک مجموعہ بنا کر نہیں بھیجا بلکہ ہمیں ایک رہنمائی دی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک نمونہ بھی بھیجا۔ نبی ﷺ کی صورت میں۔ اس بات کا اندازہ تھا کہ بعد میں آنے والی مسلمان کہیں گے کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا مشکل ہے سوائے انسان کو بھیجا۔ اپنے دشمن کو معاف کرنا ناممکن ہے تو اٹھا کر دیکھ لو کہ انہوں نے کن کو معاف نہیں کیا؟ اپنے چچا کے قاتلوں کو معاف کیا خود پر حملہ کرنے والوں کو معاف کیا ان کو بھی معاف کیا جو گھر کا کچرا ان پر پھیلتے تھے ان کو بھی معاف کیا جنہوں نے اتنے پتھر برسائے کہ جوتے خون سے بھر گئے۔ اگر بھوکے ہوا رکھا نہیں ہے تو اس شخص کو یاد کر لو جس کو اتنی بھوک لگی کہ پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے لیکن وہ کام نہیں کیا جو اللہ کو پسند نہیں تھا۔ اگر امیر ہو تو اس شخص کو یاد کر لو جس کے پاس مال غنیمت آتا ہے تو تب تک اپنی جگہ سے نہیں اٹھتا جب تک اپنے ہاتھ جھاڑ نہ لے۔ اگر غریب ہو تو اس کی محنت کا خیال کر لو کہ وہ کیا کرتے تھے۔ اگر بیمار ہو تو یاد کر لو کہ اللہ کے محبوب بھی تو بیمار ہوئے تھے۔ کیا انھوں نے ہماری طرح اللہ سے شکایتوں کے ڈھیر لگا دیا تھے؟؟ بالکل نہیں۔ بلکہ وہ ہر حال میں اللہ کی رضا میں راضی رہے۔ اور اپنی زندگی کا قدم قدم اللہ کی مرضی سے اٹھایا۔ اب اس سے دو باتیں ختم ہو گئی۔

فیصلہ بھی غلطی ثابت ہو کر اپنے پیچھے تباہی کا دروازہ نہ کھول لے۔ سمجھ رہے ہوں میری بات؟؟؟ اٹکا
انداز سوالیہ تھا

جی۔۔۔۔۔ آواز بہت بے جان تھی۔

ٹھیک ہے تم جاؤ اب۔ اللہ سے دعا کروں گا تمہارے لیے۔

اور وہرے ہوئے قدم اٹھاتا وہاں سے نکل آیا۔۔

کتنا مشکل ہوتا ہے کسی انسان کیلئے اس بات کو قبول کرنا کہ جن انسانوں سے وہ بے انتہا محبت
اور انکی بے حد عزت اور تکریم کرتا تھا انکی نظر میں وہ ایک ایسی چیز سے بڑھ کر نہیں ہے جسکو صرف اپنے
مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ زندگی میں کیا ہوگا کہ جب انسان کو پتا چلے کہ جس
روشنی کی لکیر کے پیچھے وہ زندگی بھر اندھیروں میں بھگتا رہا وہ تو صرف اسکی آنکھوں کا دھوکہ تھی۔ اصل میں
تو اسکا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ تو یہ کہ جب وہ آنکھوں کا دھوکہ بذات خود
مزید اندھیرے کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

لیکن یہ سب اس وقت صرف وہ ہی جانتا تھا۔ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا وہ۔ اپنے دوستوں کو بھی
نہیں۔ ورنہ وہ پانچ دن اسکی زندگی میں دوبارہ بھی لائے جاسکتے تھے۔۔
رستہ چلتے ہوئے ماضی کے جکڑ ایک بار پھر اسکے ذہن میں چلنے لگے

ابا میں جب حفظ کروں گا تو اس کے بعد کیا کروں گا؟

اس کے بعد تم قاری صاحب سے ترجمہ پڑھتے رہنا۔ اور علم پڑھتے رہنا۔

لیکن ابا قاری صاحب کے پاس تو صحیح سے مدرسہ نہیں ہے۔ میں مدرسہ جاؤں گا۔

کون سے مدرسے؟؟؟؟؟

ابا کوئی بھی مدرسہ تو بہت سارے ہوتے ہیں۔

لیکن بیٹا تم قاری صاحب سے کیوں نہیں پڑھنا چاہتے؟؟؟

ابا میں پڑھ تو رہا ہوں قاری صاحب سے۔ لیکن آگے پڑھنے کے لیے مجھے مدرسہ سے جانا ہوگا۔ وہ

اصرار کر رہا تھا۔

اچھا ٹھیک ہے بیٹا۔ حفظ ختم ہونے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔ ابھی سے کیوں فکر کر رہے ہو؟؟؟

اتنا زیادہ وقت تو نہیں ہے ابا۔ میں بیسویں سپارے پر پہنچ چکا ہوں۔ اور ابھی تو میری رفتار بھی

زیادہ ہو گئی ہے۔ قاری صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر میں اسی رفتار سے پڑھتا رہا تو بس دو سالوں میں

قرآن پاک ختم کر لوں گا۔

چلو کچھ سوچتے ہیں اس بارے میں بیٹا۔ میں کسی مدرسے کا پتہ کر لوں گا۔ اگر اچھا ہوگا تو پھر چلے جانا۔ لیکن دو سال تو کافی وقت ہے۔ ابھی سے فکر نہ کرو۔
ٹھیک ہے ابا۔

رحمت اللہ گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ پانچ سال کی عمر سے حفظ شروع کرنے کے بعد آج وہ بیسویں سیپارے پر پہنچا تھا۔ اور آج ہی قاری صاحب نے خوش ہو کر کہا کہ اگر وہ اسی رفتار سے پڑھتا رہا تو دو سال سے کم عمر سے میں وہ ختم کر لے گا۔ تو گھر واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا اور یہی بات آج اس نے اپنے باپ سے کی تھی۔

اور پھر دو سال بعد حفظ ختم کرنے کے بعد جب اس نے مدرسے جانا چاہا قاری صاحب نے بہت مخالفت کی اور فضل کو بھی قائل کر لیا کہ اسے مدرسے نہ جانے دیا جائے۔ اور فضل قائل ہو بھی گئے۔ جیلہ بھی اسے کسی صورت خود سے دور کرنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ لیکن کچھ ہی دن بعد محمود کی طرف سے آنے والی شکایت فضل کو بہت بڑی مشکل میں مبتلا کر گئی تھی۔

فضل اللہ! میری گاڑی کا شیش ٹوٹ گیا ہے اور یہ گاڑی میری نہیں ہے مالک کو پتہ چلے گا تو بہت غصہ کرے گا اور میں خود غریب آدمی ہوں ڈرائیور ہوں۔ میں کہاں سے تاوان بھروں گا؟؟؟؟؟
بھئی میری بات سنو۔ تمہیں واقعی یقین ہے کہ یہ میرے بیٹے نے ہی کیا ہے؟؟؟؟؟ اسے یقین نہیں

آیا

ارے واہ فضل! یقین کا کیا مطلب؟؟؟؟؟ میں نے خود دیکھا ہے اسے غلیل سے پتھر مارتے ہوئے۔
اب تم مجھے بتاؤ فضل میں کیا کروں گا۔؟؟

میں آپ سے معافی مانگتا ہوں محمود بھائی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔

تمہارے شرمندہ ہونے سے کیا ہونا ہے فضل۔ میرا نقصان تو پورا نہیں ہو جائے گا ماما ہی تمہاری معافی سے میں ان جھڑکیوں سے بچ جاؤں گا جو مجھے مالک سے ملیں گی۔ فائدہ کیا ہے۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

میں کیا کر سکتا ہوں محمود بھائی؟؟؟؟؟ اپنے بیٹے سے تو میں اچھی طرح پوچھ لوں گا لیکن آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟؟؟؟؟ وہ بے حد شرمندہ تھا
میرے لیے تم کچھ بھی نہیں کر سکتے فضل۔ کیوں کہ اس گاڑی کا شیش بدلنا تمہارے بس کا کام نہیں

ہے اور نہ ہی میرے بس کا ہے۔

تو پھر کیا ہوگا محمود بھائی؟؟؟؟؟ فضل اللہ بہت پریشان اور بے حد شرمندہ تھا

یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ سینھ کے غصے کو تم نہیں جانتے۔ میری نوکری بھی جاسکتی ہے۔ اس وجہ سے کہ میں گاڑی کا خیال نہیں رکھ سکا۔ اگر کوئی ایکسڈنٹ ہوا ہوتا تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن اس طرح۔۔۔۔۔

محمود بھائی میں سوائے شرمندگی اور معافی مانگنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ وہ نظریں زمین پر گاڑے ہوئے تھا۔

تم شرمندہ ہو کر اور معافی مانگ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے فضل۔ تمہارے بیٹے نے جو کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔ اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر وہ بہت غصے میں چلا گیا۔

اور اس لمحے فضل کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ رحمت نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ زمین میں نظریں گاڑے ادھر ہی کچھ دیر زمیں پر بیٹھ گیا۔ وہ پچھلے بیس سال سے اسی محلے میں رہ رہا تھا۔ اور اس کے محلے والوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ ہر کسی کی عزت کرتا تھا اور بدلے میں محلے والے بھی اس کی خوب عزت کرتے تھے۔ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی یہی سکھایا تھا لیکن پتا نہیں رحمت اللہ نے دوسروں کو تکلیف دینا کس سے سیکھا تھا۔ حالانکہ فضل اور نہ ہی جلیل نے اسے یہ سکھایا تھا۔

وہ کافی دیر ادھر کچی زمیں پر بیٹھا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آج سے چار سال پہلے بھی اسی محلے کے جاوید کے ہاتھوں رحمت نے اس کی بے عزتی کروائی تھی اور آج چار سال بعد ایک بار پھر وہی بے عزتی ہوئی لیکن جاوید نہیں محمود کے ہاتھوں۔ آج سے چار سال پہلے وہ سات سال کا تھا تو اس کی حرکت کو بچپنا کہا جاسکتا تھا لیکن آج اس کی حرکت کو بچپنے پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ چار سال پہلے بھی وہ غلیل کے ساتھ کھڑا گیا تھا اور آج چار سال بعد بھی غلیل کے ساتھ۔۔۔۔۔ پہلے نشا نے پر امرود تھا تو آج گاڑی کا شیشہ۔ غلیل اسے نہ پہلے فضل اللہ نے لے کر دیا تھا نہ ہی آج۔ اور اس کے دوست آج بھی وہی تھے جو آج سے چار سال پہلے تھے۔۔۔۔۔

تو۔۔۔۔۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پچھلے چار سال سے یہی سب کچھ کر رہا ہے؟؟ تو کیا وہ سدھرا ہی نہیں اب تک؟؟؟ وہ جو شام کو دیر سے گھر آتا ہے اور وہ جو ہر بات پر ٹھک کر جواب دیتا ہے۔ تو اس نے آج بھی وہی کیا ہے جو چار سال پہلے کیا تھا۔ غلیل سے نشا نہ لیا تھا کسی کا۔ وقت کے

ساتھ اس کا شکار بھی بدل گیا تھا۔ امرود سے گاڑی کے شیشے تک پہنچ گیا تھا وہ۔۔۔۔۔ اور وقت انسان کو ہمیشہ بدلتا ہے۔ چاہے وہ اچھائی میں ہو یا برائی میں۔۔۔۔۔

وہ اٹھ کر گھر آ گیا۔ گلی میں سے گزرتے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ وہی کچی زمین پر بیٹھا تھا تو لوگوں نے تو مزہ کر دیکھنا ہی تھا۔ اس کے اندر غصے کی جگہ انگاروں نے لے لی تھی۔ رحمت کی خوش قسمتی یا پھر ہوشیاری کہ وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ ورنہ فضل کے ہاتھوں آج اس کی خوب پٹائی ہونے والی تھی۔

مغرب کی اذان کو کافی دیر گزر چکی تھی۔ فضل آج مغرب کی نماز پڑھنے مسجد نہیں گیا۔ اسے شرم آرہی تھی جو اگر گلی میں سے گزرتے کسی نے اس کی اور محمود کی باتیں سنی ہوں تو۔۔۔ وہ رحمت کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر سے ہی وہ اس کے انتظار میں تھا لیکن وہ بھی شاید اپنے باپ کے اردوں سے خوب واقف تھا۔ شام کی اذان ہوئے بھی کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا۔۔۔ وہ کبھی کبھی اسی وقت گھر آتا اور کوئی وجہ نہیں پوچھتا تھا۔ لیکن آج عام دن نہیں تھا۔ آج وہ شدت سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر ٹیلنے لگتا۔ پھر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ گیا۔ ظفر اور امان ورکشاپ سے آچکے تھے اور اپنے باپ کو اٹھتے بیٹھتے انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اور جیلہ تو کافی دیر سے اسے مضطرب دیکھ رہی تھی۔ اس نے فٹنلو کو کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا ہلاتو فضل چونکا ہو گیا۔ آہٹ سے وہ اس کی آمد کو سمجھ چکا تھا۔

رحمتے۔۔۔۔۔ اور رحمتے۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔

وہ سیدھا اپنی ماں کے پاس باورچی خانے میں جا رہا تھا جب باپ کی کڑک دار آواز نے اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ جیلہ باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ وہ کانپتے دل کے ساتھ برآمدے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ جانتا تھا کہ محمود نے ابا کو شکایت لگائی ہوگی۔ اپنی عقل کے مطابق وہ کافی دیر سے آیا تھا تا کہ ابا کا غصہ کم ہو جائے لیکن ایسا نہیں تھا اب انہ صرف غصہ تھے بلکہ غصے کی انتہا پر تھے اور وہ طوفان کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

جی ابا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انتہائی فرمانبرداری سے نظریں جھکا کر اس نے کہا۔

فضل چند قدم اٹھا کر اس کے پاس آیا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن نہیں بول پایا اور پھر اچانک سے گھوم کر اس کے منہ پر زور کا ایک ایسا جھانپڑ مارا کہ رحمت کو اپنا آپ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ دن میں تارے نظر آنا اسے سمجھ میں آ گیا تھا اور وہ ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اس سے زیادہ شدت کا ایک اور زلزلہ وار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ اسے لگا کہ منہ کے اندر ایک یا دو دانت تو ضرور ٹوٹ گئے ہوں گے۔ جیلہ

دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئی۔ وہ تو ماں تھی نا۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن اس کے لیے تو اسکا بیٹا بے قصور ہی رہے گا۔

تم قریب مت آنا جیلہ۔۔ میں کہہ رہا ہوں کہ قریب مت آنا ورنہ اس کے ساتھ ہی تمہارا بھی یہی حشر کرونگا۔۔۔ وہ زور سے چیخا

کیا ہو گیا ہے تمہیں فضل؟؟؟؟ کیوں مار رہے ہو بچے کو اتنا؟؟؟ وہ پریشانی میں چینی۔
دو تھپڑ کھا کے اس نے وہ چیخ و پکار مچائی تھی کہ شاید پورے محلے والوں نے سن لی ہوگی۔ اس کے رونے اور فضل اور جیلہ کی آوازیں سن کر ظفر اور امان بھی کمرے سے نکل آئے تھے۔ جیلہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ اپنے شوہر کی زبان سے آج تک اس نے ایسے انگارے نہیں سنے تھے۔ فضل کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر ظفر اور امان بھی اس کی طرف بھاگے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتے۔ اس نے پاس کھڑے رحمت کے منہ پر ایک اور کڑا کے دار تھپڑ مار لیا اور شاید مزید بھی مارنا چاہتا تھا لیکن ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا جب ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک دم سے باپ کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ دونوں جوان تھے۔۔ باپ کو قابو کر سکتے تھے۔ اور انھوں نے کیا بھی یہی۔ رحمت کے لیے بس یہی ایک لمحہ بھی کافی تھا۔ وہ جلدی سے بھاگ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ جو اپنے بیٹے کو پٹے دیکھ کر خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ ماں کے پاس جا کر وہ اور بھی رونے لگ گیا۔

ظفر اور امان نے فضل کو چار پائی پر بٹھایا۔ امان جلدی سے بھاگ کر نلکے سے پانی لایا۔ پانی پی کر جب فضل کے اوسان تھوڑے بحال ہوئے تو انھوں نے ماجر اپو چھا۔

تم نہیں جانتے بیٹا۔ اس نے آج مجھے کتنا شرمندہ کیا ہے۔ مجھے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ نقصان کرنا بھی تھا تو اتنا کرنا کہ میں اس کو پورا کرنے کے قابل تو ہوتا۔ اس نے تو وہ نقصان کیا جو میں پورا بھی نہیں کر سکا اور اس نے محمود بچارے کو کتنی مشکل میں ڈالا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو؟؟؟؟ اس کی باتیں کسی کو سمجھ نہیں آئی۔ اتنی ہی بے ربط بات کی تھی اس نے۔

لیکن ابا ہوا کیا ہے؟؟؟ آپ صاف بات کریں نا۔ سمجھ نہیں آرہی۔ امان نے پوچھا۔

اس نے مجھے شرمندہ کروا دیا ہے بیٹا۔ تنگ کر رکھا ہے اس نے مجھے۔۔۔

لیکن کیا کیا ہے ابا اس نے؟؟؟؟

محمود آیا تھا آج۔ وہ جو کھیتوں کے پیچھے رہتا ہے۔ وہ اپنے مالک کی گاڑی لایا تھا اپنے گھر تو اس نے پتھر مار کر شیش توڑ دیا ہے اس کا۔

لیکن آپ کو کس نے بتایا ابا کہ یہ رحمت نے ہی کیا ہے؟؟؟؟ وحید پہلی بار بولا

بتانا کیا ہے؟؟ اس نے خود دیکھا ہے اس منحوس کو غلیل کے ساتھ۔ اور پھر اس کو پکڑنے کے لیے بھی بھاگا لیکن یہ ہاتھ نہیں آیا اس کے۔

ابا اس کے پاس تو غلیل بھی نہیں ہے۔ محمود چچا کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔
ارے واہ!!! کتنوں کو غلط فہمی ہوئی ہے؟؟ پہلے جاوید آیا تھا کہ اس کے گھر میں پتھر مارتا ہے
اور اب -----

کیا؟؟؟؟؟ جاوید چچا کے گھر میں پتھر مارے؟؟؟ یہ کب کیا ابا؟؟
ظفر بہت حیران ہوا۔ رحمت کب اتنا بڑا ہو گیا تھا؟؟ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی حرکتوں پر۔
اور صرف اتنے پر اس نے کہاں بس کیا ہے؟؟ ہر دوسرے دن گلی میں اس سے کسی ماکسی بچے کی
پٹائی کی ہوتی ہے۔ جھگڑا تو یہ روزی کرتا ہے۔ اس نے تو ماک میں دم رکھا ہے میرا۔ اس کی حرکتوں
پر پردہ ڈالتے ڈالتے میں تھک گیا ہوں۔۔۔ وہ بہت نولے لہجے میں بولا۔
یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا؟؟؟ آپ نے تو آج تک کچھ بھی نہیں بتایا۔
آج تک نہیں بتایا تو آج بتا رہا ہوں نا۔ آج میں اسکی ساری مستی نکال دیتا۔ تم لوگوں نے کیوں روکا
مجھے۔؟؟؟ وہ ایک بار پھر غصہ ہو کر تیز آواز میں بولا۔
ابا ایسے مار پیٹ سے کیا ہو جائے گا۔ ہم محمود چچا کو ہمیشے کی مرمت کے پیسے دے دیں گے۔۔۔ وحید
نے تجویز دی

ہاں ہاں۔۔۔ پیسے دے دیں گے۔۔۔ جیسے اس گھر میں تو نکسال لگا ہوا ہے نا۔ ارے بے وقوف وہ بتا رہا
تھا کہ اس گاڑی کے ایک شیشے کی قیمت دس ہزار سے زیادہ ہے۔۔۔
کیا؟؟؟؟؟؟؟؟

ہاں وحید محمود چچا ٹھیک کہہ کر گئے ہیں۔ اس گاڑی کا ایک شیشہ اتنے کا ہی ہے بلکہ اس سے بھی
کہیں زیادہ۔ ظفر علی چونکا گاڑیوں کی ورکشاپ میں کام کرتا تھا اس لیے وہ قیمت کا اندازہ کر سکتا تھا۔
لیکن بھائی۔۔۔۔

لیکن ویکن کچھ نہیں وحید۔۔۔ مجھے اس منحوس کی مستی نکال لینے دو تو ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا علاوہ
کوئی حل نہیں ہے اس کا۔ اس کی آواز بہت تیز تھی۔ جو باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی جھیلہ اور اس کی گود
میں سر رکھے ہوئے روتے ہوئے رحمت کے کانوں میں بھی پڑی۔

اماں میں نے کچھ نہیں کیا۔ ابا نے مجھے اتنا مارا اور آپ دور کھڑی رہی۔
ارے میرا بچہ میں جانتی ہوں کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس تیرے ابا کو کسی نے کچھ ایسا ویسا کہہ دیا ہو

گا تو غصہ ہو گئے۔

وہ ماں تھی۔ کبھی اپنی اولاد کو غلط نہیں کہہ سکتی تھی، وہ باپ تھا، اسے سماج کا سامنے کرنا تھا۔ وہ ماں تھی صرف اولاد سے پیار تھا۔ وہ باپ تھا، اسے عزت کا بھی خیال تھا۔ باپ تھا تو صحیح غلط سمجھ رہا تھا۔ ماں تھی تو ساری دنیا اس کے سامنے غلط تھی سوائے اولاد کے۔ باپ اور ماں میں اتنا فرق تو ہوتا ہی ہے۔

پاپا۔ میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔

ارے واہ بیٹا۔۔۔ یہ انقلاب کیسے آگیا؟؟؟؟ وہ بے حد حیران ہوا۔

پاپا ممما کہہ رہی تھی کہ آپ بارڈر پر کام کرتے ہیں اور اگر آپ میں نے آپ کو تنگ کیا تو آپ صحیح سے کام نہیں کر پائیں گے اور پھر پھر دوسرے ملک سے لوگ آکر ہمیں مار ڈالیں گے۔ تو اب میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔

اس نے تفصیل سے بتایا۔ کل رات ہی تو اس کی بات ہوئی تھی اپنی ماں سے۔ وہ دونوں کافی دیر تک بحث کرتے رہے۔ عائشہ سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔

شکر بیٹا پاپا سے ایسے ناراض نہیں ہوتے۔ وہ پھر اداس ہوتے ہیں۔

اس نے بات شروع کی۔ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ ان ہی کی خاطر گھر سے باہر رہنے والا سنا ہوا زاپہ بیٹے کا پیار کھو دے۔ وہ اتنی جلدی نہیں آسکتا تھا یہ تو طے تھا۔ وہ بارڈر پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اور وہ اور اس جیسے لوگ ڈیوٹی دے رہے تھے تو ہی اس وقت اس ملک کے باسی سکون کی نیند سو رہے تھے لیکن یہ بات اس پانچ سالہ بچے کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سنا ہوا زاپہ سمجھ پاتا تھا کہ وہ اپنے بچے کو کیسے سمجھائے۔ وہ وعدے پر وعدہ توڑتا جا رہا تھا۔ اور ساتھ میں اس بچے کا اعتبار بھی۔ وہ بچہ لاشعوری طور پر اس کا مقابلہ اپنے دوستوں کے والدین سے کرنا تھا۔

ماما میں پاپا سے ناراض رہوں گا۔ وہ کیوں نہیں آتے ہمارے پاس۔

بیٹا آپ کے پاپا آرمی میں ہیں نا۔ وہ اتنی جلدی نہیں آسکتے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ وہ آپ سے یا آپ کی ماما سے پیار نہیں کرتے۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ماما پیار کرتے ہوتے تو آتے ہمارے پاس لیکن وہ تو نہیں آتے۔ وہ اس وقت ناراضگی کی آخری حد پر تھا۔ اپنے باپ کی محبت پر شک کرنے لگا تھا۔

بیٹا میں بتا رہی ہوں نا کہ وہ بارڈر پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک بہت بڑی گن ہے اور ایک نینک بھی ہے۔ بالکل ویسے جیسی اس دن ہم نے مووی میں دیکھی تھی۔ اس سے وہ ان لوگوں کو مارتے

ہیں جو ہمارے ملک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں بلکل سپر مین کی طرح۔ وہ اسے بہلا رہی تھی۔
لیکن وہ مجھے ہر بار کہتے ہیں کہ اس بار وہ آئیں گے لیکن پورا ہفتہ گزر جاتا ہے اور وہ نہیں آتے۔
ماراضگی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

ارے بیٹا آپ کے پاپا آپ سے اس لیے وعدہ کر لیتے ہیں کہ وہ آپ کو مارض نہیں کرنا چاہتے۔ آپ
کو نہیں پتا جب آپ مارض ہوتے ہو تو آپ کے پاپا کتنا داس ہوتے ہیں۔۔۔
تو وہ بارڈر پر کیوں کام کرتے ہیں۔ وہ ہمارے پاس آ کر کام کریں ما۔
عائشہ کا دل کیا پنا سر پیٹ لے۔ اس کو سمجھا دنیا کا مشکل ترین کام تھا
بیٹا وہ اس لیے وہاں کام کرتے ہیں کہ وہ بہادر ہیں اور جو لوگ بہادر ہوتے ہیں صرف وہی لوگ بارڈر
پر کام کرتے ہیں۔ آپ کے پاپا بہت بہادر ہیں بیٹا۔ اب کی بار جواب مانو نے دیا تھا
تو کیا عبداللہ اور کامران کے پاپا بہادر نہیں ہیں؟؟؟
عائشہ نے شکر کیا۔ چلو کسی بات سے تو اس کے سمجھنے کا امکان پیدا ہوا۔

ایسی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی بہادر ہیں لیکن آپ کے پاپا ان سے زیادہ بہادر ہیں۔ اور اپنی گن
سے گندے لوگوں کو مارتے ہیں۔ عبداللہ کے پاپا تو ایسا نہیں کرتے ما۔ عائشہ کے پاس ساری دہلیں ختم
ہو گئی تھیں۔

تو میرے پاپا اس لیے گھر نہیں آتے کہ اگر وہ آگئے تو گندے لوگ ہمارے ملک میں آجائیں
گے؟؟؟؟؟ وہ پوچھ رہا تھا۔

بلکل بیٹا۔ بلکل یہی بات ہے۔ کہ اگر آپ کے پاپا واپس آگئے تو گندے لوگ آجائیں گے اور وہ
لوگ پھر سب کو تنگ کریں گے۔ اس لیے آپ کے پاپا ان کو نہیں آنے دیتے۔ مانو نے سمجھاتے ہوئے کہا
تو ماما کیا پاپا کبھی بھی نہیں آئیں گے؟؟؟ وہ ایک بار پھر کچھ سوچ کر مایوس ہو رہا تھا۔
نہیں بلکل نہیں۔ بلکہ جیسے ہی بارڈر پر آپ کے پاپا جیسا کوئی اور سپر مین آئے گا تو پاپا فوراً ہمارے
پاس آجائیں گے۔

ماما پاپا سپر مین ہیں کیا؟؟؟
بیٹا سپر مین تو نہیں ہیں لیکن کام بلکل سپر مین جیسا کرتے ہیں۔
ماما میں بھی سپر مین بنونگا اور گندے لوگوں کو مارونگا اور میں پاپا کی گن بھی دیکھوں گا۔ میں پاپا سے
کہونگا کہ اس بار آتے ہوئے اپنی گن بھی لائیں۔

آپ بھی سپر مین بنو گے بیٹا بلکل اپنے پاپا کی طرح لیکن آپ پہلے پرمس کرو کہ اپنے پاپا سے

ماراضگی ختم کر لو گے۔

ماما میں پاپا سے مارض نہیں ہوں آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ پاپا سپر مین والا کام کرتے ہیں ورنہ میں مارض نہیں ہوتا۔

بیٹا ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارا شکر اتنا سمجھدار ہے وہ خود سمجھ جائے گا۔ مانو اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

سوری مانو۔۔۔۔

ارے بیٹا سوری آپ کل اپنے پاپا سے کر لیا۔ ٹھیک ہے؟؟؟ وہ بہت اداس ہوتے ہیں آپ کی مارضگی پر۔

ٹھیک ہے۔ میں پاپا سے سوری کر لوں گا۔

عانشہ نے خدا کا لاکھلا کھشکرا دیا جو وہ اتنی آسانی سے سمجھ گیا ورنہ جب وہ کسی بات پر انک جاتا تھا تو پھر اسے سمجھنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ سٹا ہنواز تو گھر پر نہیں ہوتا تھا۔ اکثر دو تین مہینوں بعد گھر کا ایک چکر لگا لیتا تھا لیکن اس سے زیادہ اسے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ وہ ماں بیٹا اور ناٹو گھر میں ہوتے تھے۔ ایسے میں جب وہ کسی بات پر انک جاتا تھا اور ضد شروع کرتا تو عانشہ کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے وقت میں مانو اسکی تھوڑی سی مدد کر پاتی تھی لیکن عانشہ کو سٹا ہنواز کی کمی شدت سے محسوس ہوتی۔ لیکن آج وہ آسانی سے سمجھ گیا اور اس سے اگلے دن جب اس نے سٹا ہنواز سے فون پر اپنی مارضگی ختم کرنے کا اعلان کیا تو وہ تو گرتے گرتے بچا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا بڑا انقلاب کیسے آیا تھا۔ اور وہ بھی اتنا چانک؟؟؟؟ اسی لیے وہ پوچھ بیٹھا۔

پاپا ماما اور مانو نے مجھے کل بتایا کہ آپ بارڈر پر کام کرتے ہیں اور جلدی جلدی نہیں آسکتے۔۔

تو بیٹا یہ تو میں آپ سے روز کہتا ہوں لیکن آپ مانتے ہی نہیں میری بات۔

پاپا آپ نے مجھے یہ تو کبھی بھی نہیں بتایا کہ آپ کے پاس گن بھی ہے اور آپ سپر مین کی طرح گندے لوگوں کو مارتے ہیں۔

سپر مین کی طرح؟؟؟؟ وہ حیران ہوا

ہاں پاپا ماما نے مجھے رات کو بتایا کہ آپ کے پاس گن بھی ہے۔

پاپا میں آپ سے بالکل بھی مارض نہیں ہوں۔ جب آپ کی طرح دوسرا سپر مین آجائے گا آپ تب آجائے گا۔ میں آپ سے مارض نہیں ہوں گا۔

دوسرا سپر مین؟؟؟ وہ پھر حیران ہوا۔ کتنا اچھا ہونا اگر عانشہ فون اٹھاتی اور اسے یہ سب بتا دیتی کہ

اس نے ان باپ بیٹے کی صلح کروائی ہے اور کیسے کروائی ہے یہ بھی بتا دیتی۔
ہاں نا پاپا ماما نے بتایا تھا کہ جب آپ کے جیسا دوسرا سپر مین آئے گا تو آپ ہمارے پاس آئیں گے

ہاں جیسا یہ تو ہے لیکن ہم لوگ انتظام کر رہے ہیں دوسرے سپر مین کا اور جلدی مل جائے گا تو پاپا آپ کے پاس آجائیں گے

پاپا میں بھی سپر مین بنوں گا۔ آپ کی طرح بارڈر پر گندے لوگوں کو ماروں گا اور پاپا میں گن بھی لاؤں گا۔

آج بہت عرصے بعد وہ شاہنواز سے خوشی سے بات کر رہا تھا اور فون کے دوسری طرف شاہنواز خوشی سے پھولے نہیں مار رہا تھا۔ شہرہ تو اس سے تب سے ناراض تھا جب اسے امیر جنسی کال آئی تھی اور وہ اپنی چھٹی ختم کر کے ڈیوٹی پر آیا تھا۔ وہ کس دل سے آیا تھا یہ بھی صرف وہ ہی جانتا تھا۔
ہاں جیسا آپ بھی ضرور بنو گے اور اپنے پاپا سے بھی اچھے سپر مین بنو گے۔ آپ تو اپنے پاپا سے بھی بہت بہادر اور لائق ہونا۔

پھر میرے پاس بھی گن ہوگی نا پاپا؟؟؟
بلکل۔ اور بہت بڑی گن ہوگی آپ کے پاس اور آپ کے پاس تو ٹینک بھی ہوگا اگر آپ ہوم ورک صحیح سے کرو گے اور پڑھائی کرو گے تو۔

پاپا میں ضرور پڑھوں گا اور ہوم ورک بھی کروں گا۔ ماما سے پوچھ لیں میں نے آج بھی کیا ہے۔
زبردست۔۔۔۔۔ میرا بہادر جیسا اپنے پاپا کا بہادر اور لائق جیسا ہے۔
ٹھیک ہے پاپا میں کارٹون دیکھتا ہوں۔ آپ ماما سے بات کر لیں۔
اور خدا حافظ کر کے اس نے فون عائشہ کو پکڑا دیا تھا۔

آج تو شاہنواز کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ وہ عائشہ کا بے حد شکر گزار تھا اور بات بے بات قہقہے لگا رہا تھا۔ عائشہ کو اسکی ہنسی بہت بھلی لگی۔ اتنے دنوں بعد ہی تو وہ دل کھول کر ہنس رہا تھا اور نہ کافی بار فون پر شہرہ سے بات کر کے اداس ہو جایا کرتا تھا اور یہ بات تو اسے بہت ہی تکلیف دیتی تھی جب شہرہ اسے کہتا تھا کہ وہ ان دونوں سے پیار نہیں کرتا اور پھر فون بند کر کے وہ اکثر بے دھیانی میں خود سے ہی پوچھ بیٹھتا۔
اگر تم ان دونوں سے پیار نہیں کرتے تو تم اس دنیا میں زندہ کیسے ہو مجھ شاہنواز بھٹ؟

ایک بار اپنا رستہ چن کر غلطی کر چکے ہو مجاہد اللہ۔ اب آگے گنجائش نہیں ہے کہ زندگی غلطی

کرنے کا ایک ہی موقع دیتی ہے۔۔۔۔

کسی نے کانوں میں صدادی۔۔ وہ گھبرا کر مزید تیز چلنے لگا۔۔ اسے اپنی زندگی میں کی ہوئی وہ واحد غلطی یاد آرہی تھی جو اسکی زندگی پر محیط ہوگئی تھی۔ اسکی غلطی تو اتنی بڑی نہیں تھی جتنی سزا وہ کاٹ رہا تھا۔۔ وہ ایک بار پھر ماضی میں جھانکنے لگا۔ جب اس نے جان بوجھ کر اور اپنی مرضی سے دوسروں کی مرضی کے خلاف وہ غلطی کی تھی۔

اماں میں نے آخری سیپارہ شروع کر لیا ہے اور ابھی بس ایک دو مہینوں میں ختم بھی ہو جائے گا۔ قاری صاحب کہہ رہے تھے کہ اپنے اماں ابا کو بتادو۔ مسجد سے آکر اس نے نیم کے درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹی ہوئی جیلہ کو اطلاع دی۔

ارے واہ! میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا اور حافظ قرآن بھی بن گیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ جیلہ کی توبہ اچھیں کھل گئی۔

زینت۔۔۔۔۔ ارے اور زینت سنو تو۔

زینت باورچی خانے سے بھاگتی ہوئی آئی۔

کیا ہوا اماں؟؟؟ گھبرائی آواز میں اس نے پوچھا۔

میرا بیٹا حافظ بن گیا ہے اس خوشی میں کچھ میٹھا تو بنا دو۔

اماں میں ابھی حافظ بنا نہیں ہوں۔ تھوڑا سا وقت رہتا ہے ابھی۔ رحمت اللہ نے اپنی ماں کو خوشی سے بے قابو ہوتے دیکھ کر کہا۔

ارے تو بس دو مہینے کی توبہات ہے پھر ختم ہو جائے گا اور ویسے بھی تم نے آخری سیپارہ تو لے ہی لیا ہے نا تو اس خوشی میں کچھ میٹھا بنا لیتے ہیں۔ فضل اور بچے بھی آکر کھا لینگے۔

ہاں ٹھیک ہے اماں۔ میں کھیر بنا دوں گی رات کے کھانے پر۔

ہاں چلو رات کو بنا دینا۔ اور زینت مڑ کر پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس پٹائی کے بعد فضل اللہ نے اس پر سخت پابندی لگائی تھی کہ وہ سیدھا مسجد سے گھر آیا کرے گا اور اپنے محلے کے ایک بچے جو قاری ادریس سے ہی پڑھتا تھا کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ رحمت اور اس کے دوستوں پر نظر رکھے۔ فضل نے اسے ان دوستوں سے ملنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ اور باپ کے ڈر سے اب وہ نہیں ملتا تھا ان سے بس کبھی کبھی مسجد سے واپسی پر ان سے تھوڑی دیر مل لیتا تھا لیکن پھر اس ڈر سے کہ کہیں اس بچے نے دیکھ لیا تو اسکی شامت آجائے گی اور وہ گھر آ جاتا تھا۔ غلیل چھوڑ دیا تھا اس نے

۔ تیرا سال کا بچہ ہی تو تھا کتنی مار برداشت کرتا، ڈر گیا تھا۔

فضل تمہارے بیٹے نے قرآن ماثلاً اللہ سے حفظ کر لیا ہے اور میں اسی بات کی مبارکباد دینے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ قاری صاحب عشا کی نماز پڑھ کر فضل اللہ کے گھر آئے تھے۔

آج وہ خاندان بہت خوش تھا۔ ایک حافظ قرآن بن گیا تھا ان کے گھر میں۔ ظفر اور امان آج ورکشاپ سے جلدی چھٹی کر کے گھر آ گئے تھے اور وحید تو کام پر گیا ہی نہیں تھا اور فضل اور جیلہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کے چہرے تو ایسے چمک رہے تھے جیسے ان کو جنت کا ٹکٹ مل گیا ہو۔ رحمت اللہ نے پانچ سال کی عمر سے حفظ کرنا شروع کیا تھا اور آج پورے آٹھ سال بعد تیرا سال کی عمر میں اس نے قرآن ختم کر لیا۔ وہ قاری صاحب کے ذہین طلبا میں سے ایک ثابت ہوا تھا اور اس کے ختم القرآن پر سب سے زیادہ وقاری ادریس ہی خوش تھے۔ ظفر، امان اور فضل تینوں مسجد گئے اس کے ساتھ اور وہاں انکی موجودگی میں ہی اس نے آخری آیات پڑھیں۔ آج ان کے گھر میں دیگچہ بھر کر چاول بنے تھے اور محلے میں بھی بانٹے گئے۔ رحمت اللہ حافظ قرآن بن گیا تھا۔

خیر مبارک قاری صاحب! لیکن اصل میں ہم سے زیادہ مبارکباد کے مستحق آپ ہیں۔ آپ ہی تو سبب ہیں اس کے۔

نہیں فضل اللہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ میں تو صرف ذریعہ بنا ہوں۔ اللہ نے جو کرنا تھا وہ کر کے ہی رہتا، میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا یہ اللہ کا حکم تھا۔ قاری صاحب نے کہا۔

صحیح بات ہے قاری صاحب! بس اللہ نے آپ کو ہمارے لیے وسیلہ بنایا۔ وہ دل کھول کر خوش تھا بچہ اب کیا کرے گا فضل اللہ؟؟؟ حق قرآن تو ختم ہو گیا ہے اس کا۔ قاری صاحب نے پوچھا قاری صاحب میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ہی کچھ بتادیں۔ گھر والوں سے پوچھوں گا کچھ تو۔۔ اس بات پر تو وہ کچھ دن پہلے سے سوچ رہا تھا۔

حفظ تو اس نے کر لیا ہے فضل۔ اب اسے ترجمہ پڑھا دو اسے پتا تو چلے گا کہ جس کتاب کو اس نے یاد کر لیا ہے اس میں اس کے لیے کیا لکھا ہے۔

یہ تو آپ نے بہت پتے کی بات کی قاری صاحب۔ میرا تو دھیان ہی نہیں تھا اس بات پر۔ میں گھر میں بات کر لیتا ہوں۔

ہاں ٹھیک ہے فضل تم گھر میں بات کر لو لیکن میں نے اس لیے کہا کہ بچے کو سبق سے دور مت کرو ورنہ وہ سیکھا ہوا بھی بھول جائے گا۔

نہیں قاری صاحب ایسا تو نہیں ہوگا۔ میں آج ہی بات کرتا ہوں۔ رکیں میں کھانا لے کر آتا ہوں۔۔۔ آج تو آپ کھانا میرے پاس ہی کھالیں۔

وہ کھانے کا پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وحید بڑے میں ایک گلاس، جگ ایک پلیٹ میں ہنری اور ایک میں چاول لے آیا اور ساتھ میں دسترخوان میں دو روٹیاں لے آیا۔ قاری صاحب کھانا کھا کر رخصت ہو گئے تو فضل بھی گھر کے صحن میں آ کر چار پائی پر بیٹھ گیا سب سوچکے تھے۔ وہ اندھیرے میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا اسے ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔ وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔۔۔

رحمت بیٹا! اب آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے حفظ تو ماہما اللہ ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے دن رات کو کھانے کے لیے باورچی خانے میں فضل نے اس سے پوچھا۔
پتا نہیں ابا۔ آگے کچھ علم وغیرہ پڑھ لوں گا تفسیر وغیرہ کچھ۔ لیکن پہلے ترجمہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنے آگے کے منصوبے بتاتے ہوئے کہا۔

ہاں بیٹا میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ترجمہ پڑھ لو اور قاری صاحب نے بھی رات کو یہی تجویز دی۔
نہیں ابا میں قاری صاحب سے اور نہیں پڑھنا چاہتا۔ میں مدرسے میں جا کر پڑھنا چاہتا ہوں۔
باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تمام افراد نے ایک ساتھ گھور کر اسے دیکھا ایسے جیسے اس نے مدرسے میں نہیں مرنے پر جانے کی بات کی ہو۔

کون سے مدرسے میں بیٹا؟؟؟؟ ہمارے گاؤں میں تو کوئی بھی مدرسہ نہیں ہے۔ جیلہ نے فکر مندی سے پوچھا اور ساتھ میں اطلاع بھی دی۔

اماں دوسرے گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہی رہ کر پڑھ لوں گا۔ یہاں نہیں پڑھ سکتا میں۔ وہ بہت روائی سے بولا جیسے اس نے پہلے سے فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن کون سے مدرسے میں؟؟؟؟ اس کا نظرنے پوچھا۔

بھائی کسی بھی بڑے مدرسے میں۔۔۔

لیکن تم قاری صاحب سے کیوں نہیں پڑھنا چاہتے؟؟ وہ ابھی بھی حیران تھے اس بات پر۔

ابا میں اگر ترجمہ پڑھ بھی لوں گا تو تفسیر اور مزید علم کے لیے مجھے جانا پڑے گا مدرسے میں۔

تو ٹھیک ہے مابینا دو تین سال میں ترجمہ ہوگا تو تمہاری عمر بھی خود کو سنبھالنے والی ہو جائے گی پھر چلے

جانا۔

ابا میں ابھی بھی ٹھیک ہوں۔ خود کو سنبھال سکتا ہوں۔ وہ بحث کر رہا تھا۔

لیکن بیٹا بھی تم چھوٹے ہو۔ نہیں جاسکتے تم ترجمہ قاری صاحب سے پڑھ لو پھر بے شک چلے جانا۔ جیلہ تو اسکا ارادہ سن کر ہی پریشان ہو گئی۔

لیکن میں قاری -----

لیکن ویکن نہیں بیٹا۔ بس تم ترجمہ قاری صاحب سے پڑھ لو پھر چلے جانا اور بس یہی فیصلہ ہے ہم سب کا بھی اور تمہارا بھی۔

وہ چپ ہو گیا۔ باپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ فضل بھی مطمئن ہو گیا۔ وہ اس کو ایک ڈیڑھ ہفتہ آرام کے لیے چھوڑ کر دوبارہ قاری صاحب کے پاس بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر تیسرے دن شام کو لیاقت اسے گھر نہ آتا۔

فضل اللہ اپنے بیٹے کو قابو میں رکھو ورنہ میں اسے ایسا قابو کر لوں گا کہ تم یاد رکھو گے اور وہ بھی ساری زندگی بھول نہیں پائے گا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

لیکن لیاقت بھائی ہوا کیا ہے؟؟؟ وہ بے بسی سے بولا۔

یہ تو تم جا کر اپنے حافظہ قرآن بیٹے سے پوچھو۔۔

اس سے تو میں پوچھ ہی لوں گا بھائی لیکن آپ بھی کچھ بتادیں نا مجھے۔ وہ انتہائی بے چارگی کی حالت میں بولا۔

میرے بیٹے رشید کو مارا ہے اس نے۔ کل بھی اس نے مارا تھا اسے لیکن میں نے بچوں کی لڑائی سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن آج تو حد ہی ہو گئی جب تمہارا غنڈا بیٹا راستے میں اپنے دوستوں کے ساتھ میرے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا اور اسے دیکھتے ہی اپنے دو دوستوں سمیت اس پر ٹوٹ پڑا اور اتلارا اسے کہ۔۔۔۔۔ تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں دکھانا ہوں۔

وہ فٹلو کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ اپنی بیوی کو دوسرے کمرے میں بھیج کر وہ فضل کو کمرے میں لے آیا جہاں رشید لیٹا ہوا تھا۔ سولہ سالہ رشید اپنی جسمانی حالت سے تیرا چودہ سال سے زیادہ نہیں لگتا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں رحمت جو تیرا سال کا تھا اپنے قد اور جسمانی حالت سے قطعاً سولہ سال سے کم نہیں لگتا تھا۔

فضل نے شرمندہ سی نظر لیٹے ہوئے رشید پر ڈالی جس کے چہرے اور جسم پر چھوٹے چھوٹے کھرچنے کے نشان تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یا تو اسے کسی چیز سے کراچا گیا ہے یا پھر اسے بری طرح زمین پر گھسیٹا گیا ہے اور یہ کم سے کم اکیلے رحمت اللہ کے بس کا کام نہیں تھا سو مطلب یہ کہ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر رشید کو مارا تھا۔ وہ بے چارگی کی حالت میں بستر پر لیٹا تھا۔

فضل اللہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کا خون اتنا بے رحم ہو سکتا ہے یہ اس کے لیے قابل قبول بات نہیں تھی اگر رشید اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا خود گواہ نہ ہوتا۔ وہ اپنے منہ سے رحمت کا نام لے رہا تھا۔ اور اس دن پ ایک بار پھر فضل اللہ کا دل کیا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ایک ہفتہ پہلے وہ جتنا خوش اس کے حافظ قرآن ہونے پر تھا آج اتنا ہی افسوس اس کے پیدا ہونے پر تھا۔ اس کا بیٹا اسے زمین میں گاڑ گیا تھا اور اسے لگا کہ اس پاتال سے وہ کبھی نکل نہیں پائے گا۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا اور سنا رہا۔ وہ اور کبھی کیا سکتا تھا۔ خالی الذہنی کی حالت میں وہی کھڑا رہا۔ لیاقت کیا کہتا رہا اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ ہر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ خالی خالی نظروں سے وہ کبھی رشید اور کبھی لیاقت کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ انکار بھی کس بنیاد پر کرتا جب مار کھانے والا اس کے سامنے پڑا تھا اور خود اپنی زبان سے اس کے بیٹے کا نام لے رہا تھا۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ اس کا بیٹا سدھر گیا ہے۔ بچپن میں کی ہوئی شرارتوں کو بھول چکا ہے لیکن یہاں تو معاملہ اس کے تصور سے زیادہ خطرناک تھا۔ اسی لیاقت کے ساتھ محلے میں فضل کے اٹھارہ سال گزرے اور بہت بہترین تعلقات تھے اور آج اسی کے بیٹے پر ایسی بے دردی سے تشدد کرنے کا مطلب تھا کہ رحمت اللہ کسی پر بھی تشدد کر سکتا ہے۔

ہاں۔۔۔۔۔ کسی پر بھی

لیاقت اپنی بات ختم کر چکا تو فضل نے خاموشی سے اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ اب اس کے رکنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا اور وہ رکتا بھی کس لیے۔ برسوں سے بنائی ہوئی عزت ایک پل میں کیسے خاک ہوتی ہے یہ آج فضل اللہ جان گیا تھا۔ لیاقت کے ساتھ اس کی بہت اچھی دوستی تھی اور لیاقت اس کی بہت عزت کرتا تھا لیکن آج اسی کی نظر میں اپنے لیے نفرت فضل سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھا۔ بالکل ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح اور اس کے پاس صرف ایک متاع ہی تو تھی جو اسکی بنائی ہوئی تھوڑی بہت عزت تھی لیکن رحمت اللہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ واپس لانا جا رہا تھا۔

فضل اللہ ایک بارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے گھر پہنچا۔ اس کے چہرے پر دکھ درد کے نہیں بلکہ کرب کے آثار تھے۔ وہ کیا کھو کر آیا تھا یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔ اس نے اپنی عزت اور اپنا احترام کھو دیا تھا۔ آج کے لیاقت اور پہلے کے لیاقت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلے وہ عزت اور محبت سے فضل اللہ سے ملتا تھا اور لیکن آج اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا رحمت اللہ کے ہاتھوں بستر پر یزید ارشید بیٹا تھا اس کا۔

گھر میں داخل ہوا تو سامنے نیم کے درخت کے پچھلے چارپائی پر جیلہ بیٹھی نظر آئی جو زینت کو کچھ سمجھا

[illegible]

نہیں میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔ تم رہنے دو۔

ابا میں جانا ہوں نا۔ آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ میں لے آتا ہوں پھر آپ بات کر لیا۔

وہ اچھا بپ سے آگے نکل گیا۔ فضل اللہ نے اپنے قدم روک لیا۔

اصغر اگر تم اسے نہیں لائے تو اس گھر میں نہیں گھسنے دوں گا تمہیں۔ چاہے تم ساری رات باہر ہی گزار لو لیکن اس گھر میں تب تک نہیں آؤ گے جب تک اسے ساتھ نہیں لاتے۔۔۔ اصغر نے گھر سے نکلتے ہوئے اپنے پیچھے باپ کی آواز سنی۔

جیلہ اور زینت ابھی تک اسی جگہ کھڑی تھی۔ جیلہ تو حق دق اپنے شوہر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیا کر دیا ہے رحمت نے۔ ایسا بھی کیا کر دیا ہے جو فضل اتنا آگ بگولہ ہو رہا ہے؟؟ اور اگر کچھ غلطی کی بھی ہے تو بچہ ہے۔ اتنے ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟؟

لیکن یہ سب وہ اپنے شوہر کو نہیں کہہ سکتی تھی۔ بھلا جو اپنے جوان بیٹے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا اس کی کیا خاطر کرنا۔ اس نے تو اصغر کو بھی رحمت کے بغیر گھر واپس آنے سے منع کیا تھا۔

پتہ نہیں رحمۃ نے ایسا کیا کیا ہے جو اب اتنے غصے میں ہیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے اصغر سوچ رہا تھا۔

وہ اس کے دوست الیاس کے گھر گیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ الیاس بھی گھر پر نہیں ہے۔ وہ ایوب کے گھر گیا۔ لیکن وہاں سے بھی تینوں غائب تھے۔ اب کہاں جاسکتا تھا وہ؟؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

فضل جلے پیر کی بلی کی طرح ایک کونے سے دوسرے کونے تک کے چکر کاٹ رہا تھا۔ ایسا کیا غلطی ہو گئی تھی اس سے کہ رحمت اللہ کو لوگوں کو تکلیف دے کر خوشی ہونے لگی تھی۔ اس کے تو جتنا بس میں تھا اس کو سب دینے کی کوشش کی تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا۔۔۔

اولاد تو اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے لیکن کہتے ہیں کہ اولاد میں کوئی ایک ایسا ضرور ہوتا ہے

کہ جو اپنے والدین کے لیے واقعی بہت بڑی آزمائش ہوتا ہے۔
 اور آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ رحمت اللہ اس کے لیے واقعی سب سے بڑی آزمائش تھا۔ اسے
 جو جو رحمت کی وجہ سے سہنا پڑ رہا تھا اتنا تک تو اس کے باقی چار بیٹوں نے ملکر بھی نہیں کیا تھا۔
 وہ جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا اس کے چہرے کی کرخنگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شکر کہ اس وقت رحمت
 اس کے سامنے نہیں تھا۔

ایوب کے گھر سے ماکام واپس ہو کر اصغر سوچنے لگا کہ رحمت کہاں ہو سکتا ہے؟؟ اصغر اس کے ان
 دو دوستوں کو ہی جانتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اگر اس کا کوئی دوست تھا تو اصغر اس سے ماواقف تھا۔ اب وہ
 کیا کرے؟؟ اس کے بغیر گھر بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس کے بعد ابا خود اسے ڈھونڈنے چل پڑیں گے
 ۔ اور اگر وہ کہیں ابا کے ہاتھ لگ گیا تو ابا تو اسے ادھر ہی کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر مارنا پیٹنا شروع کر
 دیں گے۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ رحمت نے ضرور کچھ بہت ہی غلط کیا ہے ورنہ ابا اتنی
 جلدی اشتعال میں نہیں آتے اور اتنے آگ بگولہ تو وہ آج تک کسی بات پر نہیں ہوئے تھے۔

ایوب کے گھر سے نکل کر اس کا ارادہ تھا کہ مسجد کی طرف جانے والے راستے پر جا کر دیکھ لے
 کیا پتا کہیں مل ہی جائے۔ ابھی وہ آدھا رستہ ہی چلا تھا کہ رحمت الیاس، ایوب اور ایک اور ان کے ہم
 عمر لڑکے کو کھیتوں میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان سب کی اصغر علی کی طرف پشت تھی۔ لیکن اصغر انہیں
 دیکھ چکا تھا سو لپک کر ان کے پیچھے بھاگا۔ وہ آگے چلے جا رہے تھے۔ اس نے آواز بھی نہیں دی۔ مبادا
 رحمت اسے اس طرح اپنے پیچھے آیا ہو ادیکھ کر بدک نہ جائے۔ اس نے جلدی سے بھاگ کر انہیں جالیا۔
 رحمت گھر چلو۔۔۔۔۔ اس نے انہیں روک کر کہا۔

رحمت کے چہرے پر ایک لہری گزری۔ اصغر اسے کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ اسے اتنا تو پتا چل
 گیا کہ رحمت جان گیا ہے کہ اسے گھرانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔
 کیوں؟؟؟؟؟؟؟؟ اس نے یک لفظی سوال پوچھا۔
 بس میں کہہ رہا ہوں ماکہ گھر چلو۔

لیکن ابھی تو ہم نے کھیلنا شروع کیا ہے۔ میں ابھی نہیں آسکتا۔
 اصغر نے الیاس کے ہاتھ میں غلیل دیکھ لی تھی اور وہ سمجھ گیا کہ اس بار پھر رحمت نے غلیل کے ساتھ کچھ
 کیا ہے جو ابا کو غصہ آیا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ رحمت فی الحال گھر نہیں جانا چاہتا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ
 بھاگنے کی کوئی ترکیب نکالتا اصغر نے اسے سختی سے بازو سے پکڑ لیا اور اسے کھینچنے لگا۔
 چھوڑ دو بھائی۔ مجھے چھوڑ دو۔ وہ چیخنے لگا۔

وانت نکل کر منہ کے اندر ڈھیر ہو گئے۔۔

تو گالی دینے کی سزا تو دیتا ہے؟؟؟؟ تو آیا ہے بہت بڑا منصف؟؟؟؟

وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ اسے اتنا درد ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بولنے کا قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ فضل اللہ آگے بڑھا اور صحن میں پڑی ہوئی چھڑی اٹھا کر اسے پیٹنے لگا۔ ہر بار چھڑی پڑنے پر وہ ایک اور پہلے سے تیز آواز کی چیخ مارتا لیکن فضل پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اصغر کا دل کیا کہ ابا کے سامنے جا کر روک لے انہیں لیکن اس حالت میں اس کی بالکل ہمت نہیں ہوئی جیلہ باورچی خانے میں اس کی ہر چیخ سن رہی تھی اور سسکیوں سے رو رہی تھی۔ فضل اللہ اسے مارتا رہا جب تک تھک نہیں گیا۔ اور پھر خود ہی چھڑی دور پھینک کر کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر لیا۔

زینت جلدی سے رحمت کے پاس آئی۔ جیلہ کو آوازیں لگائی۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی پہنچ گئی۔ اصغر بھی آیا۔ ان سب نے اسے اٹھایا اور ساتھ میں پڑی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ اب بھی چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ جیلہ پاس بیٹھ کر اس کے زخم اور سر سہلانے لگی۔

ان تینوں کو ابھی تک صرف اتنی سی بات سمجھ آئی کہ رحمت نے رشید کو مارا ہے اور اسی بات کا ابا کو پتا چل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ابا رحمت کو اتنا کیوں مارا ہے آپ نے؟؟؟؟؟ امان نے کھانے سے فارغ ہو کر فضل سے سوال کیا۔ وہ شام سے ہی اپنے کمرے میں بند تھا۔ رات کا کھانا تیار ہوا تو زینت اسے بلائے آئی۔ سب جانتے تھے کہ وہ زینت کی بات کبھی نہیں نہاتا۔ اپنی بیٹی نہیں تھی تو اسے زینت کی شکل میں بیٹی مل گئی تھی۔ لیکن اس دن وہ زینت کے بلانے پر بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ کسی کو بھی اپنے فعل کی وضاحت نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے آنا پڑا جب زینت نے اسے اپنے واسطے دیے۔ زینت اسے بہت عزیز تھی۔ اس کی خاطر باہر صحن میں آگیا۔ لیکن کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ رحمت کو جیلہ نے ہلدی ملا دودھ پلا کر اور کپڑے سے گرم نکور کرنے کے بعد بہت مشکل سے سلا دیا تھا۔

فضل نے گھور کر امان کی طرف دیکھا۔ وہ سہم گیا۔ شاید اس کے سوال پر ابا کو غصہ آگیا۔

ابا میرا مطلب ہے کہ اس نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ کو اتنا غصہ دلا گیا؟؟؟؟؟؟؟؟

فضل نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے کھلے آسمان پر صرف تارے ہی نظر آئے۔ اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی۔

کبھی کبھی جب انسان بے بس ہوتا ہے اور اسے ساری دنیا اپنے اوپر ہنستی ہوئی لگتی ہے بالکل اسی

طرح اسے آسمان پر چمکتے تارے اور ان کا سردار چاند بھی اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔
اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر رشید کو مارا ہے۔۔۔ اس نے آسمان کو تکتے ہوئے ہی جواب
دیا۔

[illegible]

جس کو شوق ہے یہ جاننے کا کہ میں نے اسے کیوں مارا ہے وہ لیاقت کے گھر جا کر رشید کو دیکھ آئے۔ اس کی حالت دیکھ آئے۔ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

اس نے اس معصوم کو اپنے غنڈہ گرد دوستوں کے ساتھ مل کر بہت مارا ہے اور پھر اسے کچی سڑک پر گھسیٹا ہے۔ اس کے سر پر ڈنڈے سے مارا ہے۔ اور تم لوگ کہتے ہو کہ میں نے اسے بے دردی سے پیٹا ہے۔۔۔ ارے بے دردی سے پیٹنے کا مطلب جاننا چاہتے ہو تو جا کر اس معصوم کو دیکھ آؤ۔ اس کے جسم پر خراشیں اور کھر و چھیں دیکھ لو۔ لگ پتا جائے گا۔۔۔

جیلہ سمیت سب اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب بھی کر سکتا ہے۔

اور وہ کہتا ہے کہ یہ سب اس نے اس لیے کیا ہے کہ اس نے تمہاری ماں کو گالی دی۔ ارے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکا کیا پاگل ہے جو اس نے کچھ نہیں کیا اور اس نے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ بتاؤ مجھے پاگل ہے کیا وہ؟؟؟؟؟؟ اور دوسری بات یہ کہ اگر اس نے گالی دی بھی تو اسکا مطلب یہ ہے کیا کہ اسے جان سے مار دو۔ ارے لوگوں نے تو پیغمبر کی بیویوں کو گالیاں دی ہیں تو تمہاری ماں کیا ان سے زیادہ معزز ہے جو اس کو گالی دینے کی یہ سزا ہے؟؟؟؟؟؟ وہ بولتا رہا۔

وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جو اس نے بتایا اس کے بعد وہ اس کی پٹائی کرنے میں حق بجانب لگ رہا تھا۔

اس نے مجھے سراٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں نے اس محلے میں پچیس سال گزارے ہیں۔ اس محلے کے لوگ عزت کرتے تھے میری لیکن اب تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے برسوں کی عزت کچھ دنوں میں کھونے والا ہوں۔۔۔ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔۔۔

ابا آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ چھوٹا ہے سمجھ جائے گا۔ ہم لیاقت چاچا سے معافی مانگ لیتے۔
وحید نے پہلی دفعہ منہ کھولا۔۔۔

وہ چھوٹا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے اور وہ سمجھ جائے گا یہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔ اس نے سمجھنا ہوتا تو پہلے سمجھ گیا ہوتا۔ اسی وجہ سے تو میں پریشان ہوں کہ اب وہ سمجھنے کی عمر کا نہیں رہا۔ وہ بے حد اُمید تھا۔ اور رہی معافی کی بات تو وہ تو اسے مانگنی ہی پڑے گی۔ لیاقت سے بھی اور رشید سے بھی۔۔۔ وہ اٹھ گیا۔ زینت برتن سمیٹ چکی تھی۔ جیلہ بالکل خاموش رہ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ فضل کے منہ سے رحمت کا کام سن کر وہ بھی اداس ہو گئی تھی۔

اور ہاں میں سوچ سوچ کر ایک اور فیصلے پر پہنچ گیا ہوں۔۔۔۔۔
وہ پراسرار لہجے میں بولا۔۔۔ سب سراٹھا کر اسکی طرف دیکھنے لگے۔
میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے مدرسے بھیج دوں گا۔ اب یہاں رہ کر بگڑ رہا ہے یہ۔ اور میرے قابو
میں نہیں آ رہا۔۔۔۔۔

اور یوں اسکے دے جانے کا شوق پورا ہونے کا وقت آگیا اور وہ اپنے شوق کی تکمیل پر خوش تھا۔۔۔ رحمت اللہ دے سے پہنچ گیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاپا یہ آپ نے کیا کر دیا۔۔۔ آپ آئے کیوں نہیں؟؟ ہم تو تیار ہو گئے تھے۔۔۔ عمران اپنے والد سے جرح کر رہا تھا۔ جو آج جلدی نہیں آ سکتے تھے۔

بیٹا بس میں نکلنے ہی والا تھا جب ایک ضروری کام پیش آیا اور اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ صفائی دے رہا تھا۔

لیکن پاپا آپ نے پرمس کیا تھا کہ آپ آئیں گے جلدی۔۔۔۔۔ میں نے کب پرمس کیا تھا بیٹا۔ میں نے کہا تھا کہ میں کوشش کروں گا جلدی آنے کی۔۔۔ اور میں نے کوشش کی بھی لیکن نہیں آ پاپا۔۔۔ لیکن پاپا آپ نے کوشش بھی نہیں کی مگر نہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا۔ وہ بولتا ایسے تھا کہ سامنے بیٹھے انسان کو خود بخود اس پر پہارا آ جاتا۔

سیدنا و حسین شاہ گازیوں کے ایک شوروم کا مالک تھا۔ شوروم بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن بہر حال اتنا

ضرورت تھا کہ اس کی آمدنی نے اسے بہت امیر نہ سہی لیکن امیر لوگوں میں ضرورت شامل کیا تھا۔ شروع شروع میں یہ شوروم اس نے اپنے دوست کے ساتھ شراکت پر شروع کیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد کچھ گھریلو وجوہات کی وجہ سے اس کے دوست کو مستقل طور پر ملک سے باہر جانا پڑا اور وہ شوروم میں اپنا حصہ خاور کو بیچ گیا۔ خاور کے پاس اگرچہ اس وقت پیسے پورے نہیں ہو رہے تھے لیکن وہ ہر قیمت پر اسے خریدنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنا دوست تو اس کے بھروسے کا تھا لیکن کسی اور کے ساتھ شراکت اسے قطعاً گوارا نہیں تھی۔ سو اس نے کچھ اپنی پونجی اور کچھ بینک سے قرض لے کر شوروم خرید لیا اور اس دن سے وہ شوروم کا مالک تھا۔ اس کا اور شمعینہ کا ساتھ تقریباً گیارہ سال کا تھا۔ ان گیارہ سالوں میں ان کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے۔ آٹھ سالہ عمران چھ سالہ طوبی، ہاڑھے چار سال کی حواء اور ڈیڑھ سال کی فضا۔ بس یہی کل کائنات تھی خاور کی۔ اپنے ماں باپ کو وہ بہت عرصہ پہلے کھو چکا تھا۔ ایک بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ اب بس اس کے پاس یہی پانچ رشتے تھے۔ جن کو وہ اپنے آپ سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ آج وہ باوجود بہت کوشش اور خواہش کے جلدی نہیں آسکا تھا۔ کیونکہ ایک وقت پر جب وہ اٹھ رہا تھا تو اس کا ایک پرانا دوست آگیا پھر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چائے وغیرہ پی اور دوڑھائی کھنٹے گزر گئے۔ ملازم شوروم کے کام کر رہا تھا۔ وہ تو اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ لا پرواہ تھا۔ اس نے گھرفون کر کے شمعینہ کو بتا دیا کہ وہ نہیں آسکتا لیکن عمران تو بچہ تھا۔ وعدہ خلافی کی وجہ پوچھنا اس کا حق تو بنتا تھا اور وہ استعمال بھی کر رہا تھا۔

چینا آپ کو کیوں لگتا ہے کہ آپ کے پاپا نے کوشش نہیں کی ہوگی جلدی آنے کی۔ میں تو خود بہت خوش ہونا ہوں چینا اپنے بچوں کے ساتھ جانے پر۔

ٹھیک ہے پاپا کوئی بات نہیں۔ پھر کبھی چلے جائیگے۔ وہ ایسا ہی تھا۔ تھوڑی سی بحث کرتا تھا اور پھر سمجھ جاتا تھا۔ ماں باپ کو تنگ نہیں کرتا تھا۔

ارے نہیں چینا۔۔۔ پھر کبھی کیوں۔ ہم انتہاء اندک کل ہی چلیں گے۔ میں کل بہت کوشش کروں گا جلدی نکلنے کی۔ یہ بتاؤ کدھر طوبی لوگ کدھر ہیں۔

پاپا ماماچن میں سالن بنا رہی ہیں اور طوبی ادھر ان کے پاس ہی ہے۔ خاور بیٹے کی انگلی پکڑے لاؤنج میں آئے۔ جہاں حوائی وی پر کوئی کارٹون دیکھ رہی تھی اور ساتھ میں صوفے پر فضا اپنی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ باپ کدیکھ کر وہ صوفے پر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے تالیاں بجانے لگی۔ وہ روز ایسے ہی کرتی تھی۔ خاور کی واپسی پر وہ جہاں ہوتی تھی وہی پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتی تھی۔ حواء کی نظر بھی خاور پر پڑی تو وہ بھاگتے ہوئے آئی اور لپٹ گئی اس سے۔ خاور نے اسے اٹھا کر پیار کیا اور وہ

پھر سے بھاگتے ہوئے جا کر کارٹون دیکھنے لگی۔ فضا البتہ ابھی تک تالیوں ہی بج رہی تھی۔ وہ خاور کے پاس نہیں آتی تھی بلکہ خاور کو خود اس کے پاس جانا پڑتا تھا۔ لیکن اس معصوم بچی کی یہ ادا اتنی پیاری تھی کہ کسی کو بھی پیارا آ جاتا سو خاور نے اسے صوفے سے گود میں اٹھالیا اور بچن کی طرف چل دیا۔ عمران اس کے پیچھے بچن میں ہی آ گیا۔ سلام کر کے اور طوبی کو پیار کر کے وہ ادھر بچن میں ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ارے کیا ہوا بیٹا؟؟؟؟ ابھی تک مارض ہو کیا اپنے پا سے؟؟؟؟ عمران کو خاموش کھڑا دیکھ کر اس نے پوچھا۔ عام طور پر وہ اتنا خاموش نہیں رہتا تھا اس لیے۔

نہیں پاپا بالکل نہیں۔ میں بالکل بھی مارض نہیں ہوں۔

وہ طوبی کے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ گڑیا اسے پسند نہیں تھی۔ فضا اور حواء کے لیے پھر بھی ٹھیک تھی کہ وہ دونوں چھوٹی تھی لیکن طوبی کو اب گڑیا نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اکثر طوبی کے سامنے کہتا تھا اور اسی بات پہ اس کی اور طوبی کی لڑائی بھی ہوتی تھی۔

چلو ایک کام کرتے ہیں۔ آج آپ سب کو زیادہ پاکٹ منی دیں گے۔ کیوں کہ پاپا آج آپ کو گھما نے نہیں لے کر گئے۔ خاور کو لگ رہا تھا کہ آج اس کے بچے مارض ہیں اس سے سواس نے ان کو منانے کا ایک اور طریقہ نکالا۔ اور اس نے اپنی جیب سے بٹوائیکال کر پیسے نکالے۔ آج ان کی پاکٹ منی میں بیس بیس روپے اس نے اضافی شامل کر دیے۔ طوبی اور عمران کو ان کے پیسے ادھر ہی دے دیے۔ طوبی تو بہت خوش ہوئی۔ اور عمران کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ خاور سمجھ گیا کہ زیادہ پاکٹ منی سے وہ خوش ہو گیا ہے۔ وہ واقعی زیادہ پاکٹ منی سے خوش ہو گیا تھا۔ لیکن کیوں؟؟؟؟ یہ خاور کبھی نہیں جان سکتا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں عمران کو لٹچ باکس کے ساتھ پچاس روپے پاکٹ منی بھی ملتی تھی۔ لیکن وہ روز صرف تیس روپے خرچ کرتا تھا اور باقی بیس روپے وہ سکول کے باہر سڑک پر بیٹھے ہوئے معذور بابا کی جھولی میں ڈال دیتا تھا اور بدلے میں روز ہزاروں دعاؤں کا خزانہ لیتا تھا۔ یہ کام وہ پچھلے پانچ مہینوں سے کرتا آ رہا تھا۔ پہلے وہ سارے پیسے خرچ کر لیتا تھا لیکن جب سے اسے معذور بابا ملا تھا اس نے اپنا خرچ گھٹا دیا تھا۔ اب وہ صرف تیس روپے خرچ کرتا۔ بیس روپے اس کے پاس رہ جاتے اور چھٹی ہوتے ہی وہ سب سے پہلے بھاگ کر وہ بیس روپے بابا کو دے آتا۔ طوبی کو بھی اس کے اس کام کا پتہ نہیں چلا تھا۔

لیکن آج اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اس کا دوست فیضان اپنی پاکٹ منی بھول آیا تھا اور لٹچ ٹائم میں جب عمران اپنے حصے کے تیس روپے خرچ کر چکا تھا فیضان نے اس سے پیسے مانگ لیے۔

لیکن اس کے پاس تو پیسے نہیں تھے اور جو تھے وہ بابا کا حصہ تھا لیکن فیضان بھی تو اس کا دوست

تھا۔ کیا کرتا وہ۔ جیب سے بیس روپے نکال کر فیضان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ کاش فیضان نے پیسے خرچ کرنے سے پہلے اسے بتایا ہوتا تو وہ آج اپنے لٹجے باکس پر گزارہ کر لیتا لیکن بابا کے پیسے بچا لیتا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے پیسے فیضان کو دے دیئے۔

بابا نے آج کھانا کھایا ہوگا کہ نہیں؟؟؟

یہ سوال وہ آج بار بار خود سے پوچھ رہا تھا۔ معصوم بچے کو لگتا تھا کہ اگر وہ بابا کو پیسے نہیں دے گا تو بابا کھانا کیسے کھائے گا۔ ان پانچ مہینوں میں آج پہلی بار اس نے وین کے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی دوسری طرف سے گھما کر لے جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بابا آج اسے دیکھ لے۔ اس نے سارے دن میں تہیہ کر لیا تھا کہ کل جا کر وہ بابا سے سوری کر لے گا۔ اور ان کو اپنے لٹجے بکس میں سے آدھا دے دے گا۔ لٹجے آج کے لیے اور بیس روپے کل کے لیے لیکن اب تو جب پاپا نے اس کو بیس روپے اضافی دے دیئے تھے تو اب تو لٹجے بکس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ بیس روپے خود لے کر باقی چالیس روپے بابا کو دے دے گا۔ بیس روپے آج کے اور بیس روپے کل کے۔ اور صرف اسی لیے اضافی پانچ روپے کا سن کر وہ خوش ہو گیا تھا۔

اور اللہ کو بے شک انسانوں کے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے لیکن فرق صرف نیت سے پڑتا ہے۔ اس نے بھی آج نیت کی تھی کہ کل اپنے جیسے میں سے دے گا تو اللہ نے اس کا حصہ اسی کے لیے رکھا۔ اس معصوم بچے کا امتحان اللہ کو مقصود نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سوری بابا جی۔۔۔ کل میں نے آپ کے والے پیسے فیضان کو دے دیے۔ وہ معصومیت سے بولا۔ آج اس نے چھٹی کا بھی انتظار نہیں کیا اور جیسے ہی لٹجے ٹائم کی گھنٹی بجی وہ سب سے پہلے کلاس سے نکل کر سیدھا بھاگتا ہوا معذور بابا کے پاس گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ چونکہ اس نے کل پیسے نہیں دیے تھے تو شاید بابا نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ آٹھ سال کا بچہ ہی تو تھا۔ سوچ بھی معصوم ہی تھی۔

فٹ پاتھ پر بیٹھے اس بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو جھلما نے لگے۔ پتہ نہیں کس ماں باپ کا بچہ ہے یہ؟؟؟

پندرہ سال پہلے ایک حادثے میں ایک پاؤں اور ایک بازو مفلوج ہونے کے بعد سات سال تک بیٹا اور بہو سنبھالتے رہے اسے لیکن دو سالوں کے اندر اندر ریکے بعد دیگرے تپ دق سے ان دونوں کی ہونے والی اموات کے بعد وہ اور اس کی چار سالہ پوتی روزینا کیلے رہ گئے تھے۔ اس کی بہو کھانستی تھی۔ حکیم صاحب سے علاج بھی ہوتا تھا لیکن آفاقہ نہ ہوا اور آخر ایک سال کے بعد وہ کھانستے کھانستے ہی

زندگی کی بازی ہار گئی۔ حکیم صاحب نے منع کیا تھا کہ اسکے استعمال کے برتن الگ کر دیے جائیں لیکن ایک تو گھر میں اتنے برتن نہیں تھے کہ الگ الگ استعمال ہوتے اور نہ ہی وہ لوگ کوئی امیر تھے جو وہ بستر پر بیٹھ جاتی اور کام ہوتے رہتے۔ چاری سے کھانتے کھانتے ہی کام کرنا پڑتا اور انہی برتنوں میں سب کو کھانا بھی پڑتا۔ اس کا بیٹا اجمل بھی تھوڑا تھوڑا کھانتا تھا لیکن کسی نے درخور اعتناء نہ سمجھا۔ بلآخر بیوی کی موت کے دو مہینوں بعد جب اسے بھی خون کی قے ہوئی تو سب کو فکر ہو گئی۔ اسے بھی تو وہی جان لیوا بیماری لگ گئی تھی۔ بھگم بھاگ حکیم صاحب کے پاس گیا۔ دو ہفتے کی دوائی سے بھی آرام نہ آیا تو حکیم صاحب نے بڑے ڈاکٹر کا پتہ دیا اور اسے وہاں بھیج دیا۔ بڑے ڈاکٹر کی فیس دے کر اور دوائی خرید کر تو اس کی مہینے کی تقریباً آدھی کمائی چلی گئی تھی۔ وہ مہینہ بڑی مشکل سے گزرا۔ دوسرے مہینے میں بھی یہی حال رہا۔ کیونکہ بڑے ڈاکٹر نے اسے دو مہینے کی دوائی دے دی تھی اور ان دو مہینوں میں اسے بہت زیادہ آفاقہ ہوا تھا۔ خون کی کھانسی تو بالکل ختم ہو گئی تھی البتہ کھانسی اسے کبھی کبھی ہو جاتی لیکن دو مہینے کے بعد وہ دوبارہ نہیں گیا۔ کیوں جاتا۔ وہ ٹھیک تو ہو گیا تھا۔ تو اب وہ مزید مہینے تنگی میں کیوں گزارتے۔ دوائی بھی چھوڑ دی اس نے۔ آنے والے چار مہینے اچھے گزرے۔ اجمل مزدوری بھی کرتا اور پھر آ کر گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرتا۔ وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ لیکن پھر پتہ نہیں اچانک اسے کیا ہو گیا۔ وہ کھانسی لگا تھا اور جب کھانسی لگتا تو اتنا کھانتا کہ اس کی سانس بند ہونے لگتا اور پھر کھانسی شروع ہونے کے دو تین دن بعد ہی وہ ایک بار پھر کھانتے ہوئے خون تھوکنے لگا تھا۔ وہ ایک بار پھر حکیم صاحب کے پاس گیا لیکن انھوں نے پھر اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ اس بار اسے بڑے ڈاکٹر کی دوائی سے بھی آرام نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور اب تو وہ بستر سے نہیں اٹھ پاتا تھا تو کام کرنے کیسے جاتا۔ ایک مہینے تک وہ بستر پر پڑا رہا اور کھانتا رہا، گھر کے کونے میں اس نے اپنی چار پائی بچھائی تھی۔ روزینہ اس کے پاس جاتی تو اسے بھی جھڑک دیتا۔ شاید وہ قصداً ایسا کرتا تھا تا کہ وہ اس کے پاس نہ آئے۔ مبادا اسے بھی یہی بیماری لگ جائے۔ اور اس بار اس بیماری نے اسے زیادہ مہلت نہیں دی۔ ایک مہینے بعد ہی ایک دن کھانتے کھانتے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی اور اس کے چوتھے دن سے آج تک کریم بابا صبح سے اسی فنٹ پاتھ پر بیٹھ جاتا اور راہ چلتے لوگ اسے اتنا کچھ دے ہی دیتے کہ شام کو وہ گھر دو روٹیاں اور تھوڑا سا سالن لے ہی جاتا جو وہ اور روزینہ کھا لیتے۔

پچھلے سات سال سے اسی فنٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے اس نے لوگوں کی جھڑکیاں اور گالیاں بھی کھائی تھیں، باتیں بھی سنی تھیں، اپنے بارے میں تن آسان اور ہڈ حرام کے الفاظ بھی سنے تھے۔ مفت خوری کے طعنے بھی برداشت کیے تھے لیکن آج اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہ آٹھ سالہ بچہ کون تھا؟؟؟؟؟؟

باباجی سوری دے دیں۔ وہ فیضان ہے ماوہ کل اپنی پاکٹ منی بھول آیا تھا اور مجھ سے مانگ لیے تو آپ کے والے پیسے میں نے اسے دے دیے۔ آپ پلیز ناراض نہ ہوں۔

اس نے اپنی ازلی معصومیت سے کہا اور کریم دادجیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے فٹ پاتھ پر سے گزرتے لوگوں کے منہ سے کئی باریہ لفظ سنا تھا اور پانچویں جماعت میں پڑھتی اس کی پوتی نے اسے بتایا تھا کہ انگریزی میں اس لفظ کا مطلب معافی مانگنا ہوتا ہے۔۔۔ تو کیا یہ امیر زادہ اس سے معافی مانگ رہا تھا؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

لیکن کس بات کی؟؟؟؟؟؟؟؟ اس لیے کہ اس نے بیس روپے اپنے دوست کو دیے اور بابا کو نہ دے سکا؟؟

بابا میں آپ کو آج کل والے پیسے بھی دوں گا اور آج والے بھی۔ کل پاپا نے مجھے زیادہ پاکٹ منی دی تھی لیکن اگر پاپا نہ دیتے تو میں آپ کو پنا لے دے دیتا۔ مجھے پتا ہے کہ آپ نے کل سے روٹی نہیں کھائی۔۔

عمران نے چالیس روپے بابا کو دیتے ہوئے کہا۔ پیسے بابا کے ہاتھ پر رکھے اور اٹھ کر چلنے لگا۔ بابا تو ابھی تک بالکل خاموش تھا۔

بابا میں آئندہ فیضان کو نہیں دوں گا اور اگر وہ مانگے گا تو میں لے لوں گا اور اپنے پیسے اسے دے دوں گا۔

اس نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ دفعتاً ایک بار پھر رک کر پوچھا۔۔

بابا آپ ناراض تو نہیں ہیں ما۔؟؟؟؟

کریم داد کوئی جواب کیسے دیتا۔ اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اس کا سرفنی میں ہلا اور اطمینان پا کر وہ بچہ وہاں سے چلا گیا۔ جو مکس پانی کریم داد کی آنکھوں میں جمع تھا وہ ایکدم سے اپنا رستہ بنا کر بہہ نکلا۔ ایسی کوئی دعا تھی جو وہ اسے دے۔ اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں سیکھی ہوئی ساری دعائیں کریم داد کو بے معنی لگیں۔ اس کی نظر آسمان کی طرف اٹھی۔

یا اللہ میں کوئی دعا نہیں دے سکتا۔ بس تو اس کو خود ہی عطا کر دے۔ میری ساری دعائیں بہت کمزور ہیں۔ اس کے دل سے دعا نکلی۔۔

اور اللہ تک پہنچنے کے لیے دعا کالیوں سے نکلا ضروری بھی نہیں ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آج اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا لیکن وہ ماشتہ کرنے اور خالہ سے اپنا پھول لینے مجھے آئی

کیسی ہوو جیہہ؟؟ وہ ہمیشہ اسکا پورا نام لیتا تھا جبکہ باقی گھر والوں کیلئے وہ 'وجی' تھی۔
میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔ اس نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔
میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آج تم یونیورسٹی نہیں جا رہی ہو کیا؟؟
نہیں۔۔

آپ بھی آج نہیں جا رہے؟؟ کچھ لمحے رک کر اس نے پوچھا۔
میں تو جاؤنگا۔ ابھی جاگنگ سے آیا ہوں تو ناشتہ کر کے چلا جاؤنگا۔
اتنی دیر سے؟؟ وہ جو ہمیشہ صبح صبح جانے کا عادی تھا آج اتنا لیٹ کیسے ہو گیا تھا
دیر تو نہیں ہوئی ابھی تو صرف سات بج رہے ہیں۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف
دیکھا

کیا؟؟؟ سات بجے؟؟ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
ہاں ابھی سات بج رہے ہیں۔ اس نے دوبارہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق کی
وہ خاموش کھڑی رہی۔ اپنی بے وقوفی سمجھ چکی تھی۔ صبح اٹھ کر گھڑی کی طرف دیکھنے کی زحمت اس نے
نہیں کی تھی اور موبائل دیکھتے ہوئے بھی نا تم پر نظر نہیں ڈالتی تھی۔ خالہ کی دبی دبی مسکراہٹ بھی سمجھ گئی تھی
سو شرماتے اور پچھتاتے ہوئے فوراً اندر کی طرف قدم بڑھائے۔
وجیہہ۔۔۔ صارم کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔
میں ہر صبح ایک پھول دیتا ہوں پسند آتا ہے؟؟
آپ کب دیتے ہیں وہ تو خالہ دیتی ہیں اور مجھے خالہ کا دیا ہوا پھول پسند آتا ہے۔ سر جھکائے وہ
آہستگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں تھوڑی سی ناراضگی تھی۔

امی کو میں ہی دیتا ہوں اور وہ اس لیے کہ جب میں جاتا ہوں تو اس وقت تم سو رہی ہوتی ہو اور جب
میں آتا ہوں تو اس وقت بھی تم سو رہی ہوتی ہو۔ وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا
میں جاگ سکتی ہوں۔ صبح بھی اور رات کو بھی۔ وہ بد دستور پچھے ہی دیکھتی رہی۔
صارم کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گویا پھول لینا اسے پسند تھا اور پھول بھی۔ وہ پھول لیتی آرہی
تھی اور صارم کے پوچھنے پر امی بتا دیتی تھی کہ وہ بہت خوش بھی ہوتی تھی پھول پا کر لیکن آج صارم کے
سامنے وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے پھول لینے کیلئے جاگ سکتی ہے۔ اسکا مطلب تھا کہ وہ اس سے پھول
لینا چاہ رہی تھی۔ اور یہ بات وہ سمجھ بھی رہا تھا۔

اچھا ٹھیک ہے آئندہ امی کے ہاتھ نہیں بھیجوں گا لیکن روز تم سے ملکر دے بھی نہیں

سکتا تا یا ابا کو اچھا نہیں لگے گا۔۔۔ وہ سوچتے ہوئے بولا
لیکن خیر میں کچھ کروں گا۔ تم یہی رکو میں آتا ہوں۔ اور وہ اندر بڑھ گیا۔
صرف چند ہی لمحے لگے تھے اسے واپس آنے میں اور اس کے ہاتھ میں ویسا ہی ایک خوبصورت پھول
تھا جیسا وہ پچھلے پانچ دن سے خالہ کے ہاتھ بھجواتا رہا تھا۔ وہ بالکل اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
یہ لو جیہ۔ آج خود سے رہا ہوں اور آئندہ بھی خود یا کروں گا۔ اس نے پھول اسکی طرف بڑھاتے
ہوئے کہا۔

اس نے خاموشی سے پھول پکڑا اور اسے دیکھنے لگی۔ بہت پیارا تھا وہ۔ اور آج تو بہت ہی
پیارا لگا اسے وہ پھول۔۔۔۔
کچھ کہو گی نہیں؟؟
کیا؟؟ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اسے۔ وہ اب بھی مسکراتے ہوئے پورے شاہک سے اسے ہی
دیکھ رہا تھا۔
کچھ بھی۔۔۔۔۔

۔۔۔ وہ بولی اور مزید کچھ کہنے سے قبل ہی اندر کی طرف بڑھ گئی۔
وہ وہی کھڑا رہا۔ اندر جا کر وہ سیدھی سیزھیوں کی طرف گئی۔۔
وہی ناشتہ کر کے جاؤنا۔ خالہ اسے اوپر جاتے دیکھ کر کچن سے نکل کر بولی۔
خالہ میں بعد میں آ جاؤنگی ناشتہ کرنے۔ تب تک خالہ اس کے ہاتھ میں صابن کا دیا ہوا پھول دیکھ چکی
تھی۔ اور بلکے سے مسکرا رہی تھی۔ اسے خالہ سے ناراض ہونا تھا۔ انہوں نے بتایا کیوں نہیں کہ وہ سات
بجے سے پہلے مجھے آئی تھی اور یہ کہ ابھی صابن گیا نہیں تھا لیکن اسکو کسی اور وقت پر اٹھائے رکھتے ہوئے
اسنے سیزھیوں پھلانگی شروع کر دی۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کون ہو تم؟؟ وہ چاروں اپنی اپنی چارپایوں پر بیٹھے ہوئے تھے جب وہ کمرے میں داخل
ہوا۔ اپنے کمرے میں پانچویں چارپائی اور بعد ازاں سیف اللہ کی زبانی انہیں اس کی آمد کا پتا چل گیا
تھا۔ وہ چاروں مغرب کی نماز پڑھ کر فوراً اپنے کمرے میں آئے تھے جب کہ مجاہد تھوڑا دیر ویسے ہی ادھر
ادھر گھومتا پھرتا رہا۔

مجاہد اللہ۔۔۔۔۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

پڑھنے آئے ہو؟؟ ایک نے پوچھا۔

اس نے گھور کر ایسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔
میرا خیال ہے کہ اس مدرسے میں جو بھی آتا ہے وہ پڑھنے ہی آتا ہے۔ اگر تم کچھ اور کرنے آئے
ہو تو مجھے بتا دو پھر میں بھی سوچ لوں گا کہ پڑھ لوں یا وہ کام ہی کر لوں۔۔
سیف اللہ انکی بات پر زیر لب ہنسا۔ اسے ایسی بات کی امید نہیں تھی۔ خاص طور پر جب وہ آج ہی
آیا تھا۔ ایسی بات کی توقع تو باقیوں کو بھی نہیں تھی۔
وہ اپنی چار پائی پر جا کر لیٹ گیا۔ باقی سب کچھ یاد کر رہے تھے۔
تم لوگ کیا یاد کر رہے ہو؟؟؟
آج کا پڑھا ہوا سبق۔۔ جواب سیف اللہ کی طرف سے آیا۔
ایک بات تو بتاؤ۔ تم دونوں کو نگے ہو کیا؟؟؟ اس نے باقی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
نہیں تو۔ ان میں سے ایک بولا۔
تو پھر بولتے کیوں نہیں ہو؟؟؟؟
کیا بولیں؟؟؟ تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ ہم سب پڑھ رہے ہیں۔۔۔۔
تو پڑھنا۔ میں نے کب منع کیا ہے؟؟؟ اچھا اپنے نام تو بتا دو۔۔
وہ سب اس کی طرف توجہ دینے بغیر اپنے کام میں مصروف رہے۔۔۔
تمہارا نام کیا ہے؟؟؟ اس نے کونے والے سے پوچھا۔
امیر حمزہ۔۔۔۔
اور تمہارا؟؟؟؟ دوسرے سے پوچھا۔۔
علی حیدر۔۔۔
اس نے تیسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
عمر فاروق۔۔۔
زبردست۔۔
اور کب سے ہو یہاں؟؟؟؟ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔
دیکھ مجاہد تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ ہم اس وقت پڑھ رہے ہیں پھر چپ کیوں نہیں ہو جاتے۔
عمر فاروق نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
اچھا ٹھیک ہے یا رخصہ کیوں ہوتے ہو؟؟؟ جب پڑھ لو گے تو تب کر لینگے باتیں۔ باتیں تو اب
ہوتی ہی رہیں گی۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ان سب کو اس کی اتنی بے تکلفی اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ

خاموش تھیں جیسے کہ وہ یہاں آج ہی آیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قاری صاحب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں رحمت کو مدرسے بھیج دوں گا۔

قاری ادریس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ایسے جیسے انہیں کسی بچہ نے ڈنک مار لیا ہو۔

لیکن کیوں؟؟؟؟؟ وہ ابھی بچہ ہے۔۔۔

قاری صاحب یہاں رہ کر وہ بہت بگڑ رہا ہے۔ پہلے تو میں نے بچہ سمجھ کر اس کی اتنی زیادہ فکر نہیں کی

لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ اسے سختی کی ضرورت ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی۔۔

یہاں کیوں نہیں ہو سکتی فضل؟؟؟؟؟

قاری صاحب۔ یہاں میں اس کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ آپ کے بس میں جو تھا آپ نے

کیا لیکن اب وہ آپ کی بات بھی نہیں سمجھ رہا۔

ایسا کیا کیا ہے اس نے؟؟؟

قاری صاحب پہلے میرے ایک محلے دار نے اسے گھروں میں غلیل سے پتھر مارتے ہوئے

پکڑا۔ میں نے اسے سمجھایا اور مجھے لگا کہ وہ سمجھ بھی گیا لیکن کچھ عرصہ پہلے مجھے پتا چلا کہ وہ اپنے دوستوں

کے ساتھ مل کر راہ چلتی گاڑیوں پر غلیل سے پتھر مار کر ان کے شیشے توڑتے ہیں۔ اور یہ کام وہ لوگ اتنی

مہارت سے کرتے تھے کہ کافی عرصہ تک تو ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی، پٹائی بھی

کی اس کی اس کے دوستوں سے ملنے پر بھی پابندی لگا دی۔ لیکن ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ اس نے

اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر لیاقت کے بیٹے رشید کو بہت مارا ہے۔ اسے کچی سڑک پر گھسیٹا ہے اور اس

کے سر پر ڈنڈے سے مارا ہے۔ رشید کو تو آپ جانتے ہیں ماقاری صاحب؟؟؟؟؟

ہاں جانتا ہوں۔ وہ بھی سٹاگر دے میرا لیکن رحمت نے ایسا کیوں کیا؟؟؟ تم نے پوچھا نہیں

فضل؟؟؟؟؟ قاری صاحب کو بھی تشویش ہوئی۔

میں نے پوچھا ہے قاری صاحب۔ کہتا ہے کہ اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔ فضل اللہ سر جھکائے

بولا۔

قاری صاحب میں رشید کو دیکھ آیا ہوں۔ رحمت نے بہت ظالمانہ مارا ہے اسے اس لیے اب میں نے

یہی فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے بھیج دوں گا۔

لیکن فضل میں کبھی بھی تمہارے اس فیصلے کی حمایت نہیں کروں گا۔

لیکن اس میں غلط کیا ہے قاری صاحب؟؟

دیکھو فضل اللہ ہر انسان ہر بات ہر کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ میں بھی کچھ باتیں تمہیں نہیں بتا سکتا لیکن میں کبھی اس فیصلے کی حمایت بھی نہیں کروں گا۔

لیکن قاری صاحب وہ بگڑ رہا ہے۔۔

بگڑنے کا علاج مدرسہ ہے کیا؟؟؟

لیکن وہاں پابندی تو ہوتی ہے مہار قاری صاحب اس طرح آزاد گھومنے پھرنے اور غنڈہ گردی تو نہیں کر پائے گا۔۔

یہ غنڈہ گردی نہیں لیکن بہت سی اور طرح کی غنڈہ گردی سیکھ جائے گا فضل۔۔ قاری ادیس کسی بھی طرح راضی نہیں ہو رہے تھے۔

لیکن میں پوچھنا چھ کر کے ہی بھیجوں گا اسے۔ لوگوں سے پوچھوں گا۔ مدرسہ میں پڑھنے والوں سے پوچھوں گا۔ ایسے ہی کہیں بھی اٹھا کر تو نہیں بھیجوں گا۔

تم کچھ بھی کہہ لو فضل میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا۔ مرضی تمہاری ہے لیکن مدرسہ کی تجویز مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔

میں سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کروں گا قاری صاحب لیکن اتنا تو میں سمجھ ہی چکا ہوں کہ اب اسے قابو کرنا میرے یا آپ کے بس کا کام نہیں ہے۔

ٹھیک ہے فضل اپنی مرضی اور خوشی دیکھو لیکن سوچ سمجھ کر۔

بالکل جناب اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

خدا حافظ۔

وہ گھر آ گیا۔ سارا رستہ وہ حیران ہوتا رہا کہ آخر قاری صاحب رحمت کو مدرسہ بھیجنا کیوں نہیں چاہتے حالانکہ مدرسہ میں ایسی کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ بہت سے بچے مدرسہ سے پڑھ کر عالم بن جاتے ہیں اور پھر مدرسہ کا ماحول تو بہت اچھا ہوتا ہے۔ وہاں جا کر تو بہت بڑے شیطان سدھر جاتے ہیں۔ پھر رحمت تو سدھر ہی جائے گا۔

اور ویسے بھی وہ خود بھی تو مدرسہ جانا چاہتا تھا۔ اور اسکے جانے میں ایسی کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ حفظ تو وہ پہلے کر چکا ہے۔ اب مدرسہ میں باقی علم بھی پڑھ لے گا۔ اور سدھر بھی جائے گا۔ لیکن پھر قاری صاحب مدرسہ کی اتنی مخالفت کیوں کر رہے تھے؟؟؟

یہی سوچ اسے پریشان کر رہی تھی۔

وہ رات تک یہی سوچتا رہا۔ قاری صاحب کی اتنی کھلی مخالفت نے اسے فیصلہ کرنے میں مشکل میں

ڈال دیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ دن تک مدرسے کا چکر لگائے گا۔ وہاں سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی اسے وہاں بھیجے گا ورنہ تو اسے قاری صاحب کی شاگردی میں بٹھا دے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ارسل ----- آہستہ چلائیں میں کہتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ چلائی۔۔۔

لیکن ابھی تو تم خود کہہ رہی تھی کہ دیر ہو گئی ہے۔۔۔ وہ بھولا بن گیا۔

میں نے جلدی اٹھنے کا کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ راستے میں ہوا کے ساتھ ریس لگائیں۔ آہستہ چلائیں۔۔۔ صبا نے پیچھے سے اس کا کالر کھینچا۔

ارسلان رضا جو شاہ دی سے پہلے بہت سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ شاہ دی کے بعد سو جاتا تو ایسے لگتا کہ اب کبھی اٹھے گا ہی نہیں۔ شاید لاشعوری طور پر صبح وہ اس پیاری اور محبت بھری آواز کا ہی انتظار کرتا رہتا تھا جو روزا سے صبح اٹھاتی تھی۔۔۔

ارسل اٹھ جائیں دیر ہو رہی ہے اور ناشتہ تیار ہے۔

اور وہ کروٹ دوسری طرف کر کے سو جاتا۔۔۔

ارسل اٹھ جائیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر وہ آ کر اس کا مکمل ہٹاتی اور اسے زبردستی بستر سے اٹھا دیتی۔ اس حالت میں ارسلان کے بکھرے بال اور بنا ہوا منہ دیکھ کر تو اسے روز ہی ہنسی آتی۔ وہ ایڑھیوں کے بل کھڑی ہو کر ایک بار اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں کوئی شکل دے دیتی۔ شاید وہ انہیں سنوارنے کی بے سود کوشش کرتی تھی اور ارسلان رضا اس کی صبح صبح کی ہنسی دیکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

اور آج تو صبح صبح ارسلان کی آنکھ ہی نہیں کھل رہی تھی۔ وہ رات کو سو یا بھی دیر سے تھا۔ بینک مینیجر نے اسے ایک فائل دی تھی اسی سلسلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مہندی سے سجے ہاتھوں سے صبا نے اس کے سامنے میز پر گرم چائے کی پیالی رکھی تو اس کا دل کیا کاش وہ دنیا کی ساری نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا۔ اسے واقعی چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن اس نے صبا کی تکلیف کی خاطر کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ سب کا دل رکھنے اور سب سے بے حد پیار کرنے والی نازک سی لڑکی اس کی طلب کو کیسے نہ جان پاتی۔۔۔

اسے چائے دے کر اور کام کرنا چھوڑ کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ سارے دن کی فٹکن کے بعد اسے نیند بہت بھرپور آتی تھی۔ وہ کام کر کے اٹھا تو دو بج چکے تھے۔ وہ چار گھنٹے کی نیند بھی کر چکی تھی۔ اس نے صبا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بھی گہری نیند میں تھی۔ اس کے چہرے کی ازلی مسکراہٹ ابھی

بھی اس کے ہونٹوں پہ رقصاں تھیں۔ بالوں کی ایک شریسی لٹ اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔ ارسلان نے ہاتھ بڑھا کر اس لٹ کو ہٹانا چاہا لیکن وہ اسے جگانے میں چاہتا تھا سو اپنا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن اپنے بیڈ پر آ کر اسے ایک بار پھر اس لٹ کی حرمت پر غصہ آیا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ صبا کا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کرے۔ وہ آہستہ سے آگے آیا اور اس سے زیادہ آہستگی سے ان بالوں کو اس کے ماتھے پر سے ہٹا دیا۔ اور لٹ کروہ اسی کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور اسے دیکھتے دیکھتے ہی وہ نیند کی وادی میں بھٹک گیا۔۔۔۔

اور آج صبح تو وہ بالکل نہیں اٹھ رہا تھا۔ بہت مشکل سے جا کے ماتھے سے پانچ منٹ پہلے اٹھا۔ ناشتہ کر کے بہت جلدی سے تیار ہوا۔ رضا حسین سے ڈانٹ بھی پڑی اسے کہ وہ خود تو لٹ ہو جائے لیکن وہ صبا کو کیوں دیر کروا رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ لٹ تیز چلا رہا تھا۔

ارسل میں کہہ رہی ہوں ماما کہ آہستہ چلائیں۔ وہ لٹ پر اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی چلائی۔ لیکن اب تو میں آہستہ چلا رہا ہوں۔

اس سے بھی آہستہ کریں۔۔۔

ایک کام کرو۔ تم یہاں سے اتر جاؤ اور پیدل چلنا شروع کر دو۔ مجھے تو جلدی پہنچنا ہے آفس۔ ارسل میں ابو کو شکایت لگاؤ گی۔

ہاں ابو کی چییتی جونہری ہو تم۔ جانتی ہو کہ میں لاکھ کہوں گا کہ دیر ہو رہی تھی لیکن ماننا تو انہوں نے تمہارا ہی ہے۔ وہ جیلز ہو رہا تھا۔۔

ہاں ابو کی ایک اکلوتی مٹی جو ہوں۔ بھول گئے ابو کی بات کہ میں اللہ نے انکی کسی نیکی کی بدلے میں دی ہوں۔ وہ اکھڑ کر بولی اسے چڑانے کے لیے۔۔۔

ہاں ہاں۔ اور ابو امی کے گناہوں پر ناراض ہو کر اللہ نے میرے اور کامران جیسی مصیبتوں سے نواز دیا انھیں۔۔

کامران نہیں صرف آپ۔ وہ اپنا ننپلا ہونٹ دبا کر بولی۔۔

بابا بابا۔ ارے بی بی۔ اب یہ مصیبت آپ ہی کے گلے پڑ گئی ہے۔ اب سہتی رہو ساری عمر اس مصیبت کو۔ خلاف توقع وہ چڑا نہیں۔ وہ چپ ہو گئی۔

جب ابو امی نے گناہ کیے تھے تو بقول تمہارا ماما کہ اللہ نے سزا کے طور پر میں بھیج دیا۔ اب اس عمر میں وہ لوگ بہت عبادت کرتے ہیں تو اللہ میاں نے سوچا کہ اب ان کی مصیبت کسی اور گناہ کے گلے

میں ڈال دینی چاہیے۔ سو چار مہینے پہلے یہ مصیبت تمہارے گلے میں ڈال دی۔ ویسے صبا بی بی آپس کی بات ہے تم نے ایسا کونسا گناہ کیا تھا جس کی اتنی بھیا نک سزا ملی ہے؟؟؟؟ وہ اپنا کان قریب لاتے ہوئی رازدارانہ انداز میں بولا۔

وہ اب اپنی فطرت پر اتر آیا تھا۔ ہلکا پھلکا مزاق اس کی عادت تھی۔ جب موڈ میں ہوتا تھا تو وہ بات میں ہنسی مذاق کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتا تھا۔ اور سامنے والے کو لا جواب کرنا تو کوئی اس سے سیکھے اور وہ تو صبا بی تھی۔ جس سے وہ چیر خانی تو کر سکتا تھا لیکن ماریش کبھی نہیں۔۔۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔۔۔

تو پھر تمہیں سزا کس چیز کی ملی؟؟؟؟

مجھے کوئی سزا نہیں ملی۔۔۔

تو پھر میں کیوں ملا؟؟؟؟

ارسل میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ باتوں پر زیادہ دھیان دے رہے ہیں اور بانیگ پر کم۔ دھیان سے چلائیں اور منہ بند کریں۔۔۔۔۔ وہ لا جواب ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ اسے کبھی نہیں بتا سکتی تھی کہ

ارسلان رضا تمہارا ساتھ ملنا میرے لیے سزا نہیں بلکہ اس زندگی میں مجھ پر اللہ کا کیا گیا سب سے بڑا اکرم ہے۔ میرے رب نے کسی گناہ کے کفارے کے طور پر نہیں بلکہ میری کسی نیکی کا اسی دنیا میں مجھے بدلہ دیا ہے جو تم میرے ہمسفر بنے ہو۔ تمہاری سنگت میں زندگی زندگی لگنے لگی ہے۔ لیکن یہ باتیں وہ صرف سوچ سکتی تھی۔ اسے بتا نہیں سکتی تھی۔۔۔

اس لیے اس نے اس کی بات کو گول کر کے اسکا دھیان سڑک پر لگا دیا۔

دس منٹ کے بعد اسکا سکول آگیا۔ وہ اتر گئی تو بہت شکرا دیا کیا اس نے۔۔۔

ایسا کیا ہوا جو تم اتنا شکر کر رہی ہو؟؟ وہ حیرت سے اس کا منہ تکتے لگا۔ اسے خود بھی دیر ہو رہی تھی لیکن اس وقت صبا بی کو اتنے دل سے شکرا دیا کرتے دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا۔

میں اللہ کا شکر کر رہی ہوں جو اس نے مجھے زندہ سلامت پہنچا دیا ورنہ آپکا تو آج کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا۔۔۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟؟ اس نے گھورا

آپ نے تو آج کہیں نہ کہیں بانیگ ٹکرا کر ماری دینا تھا مجھے۔ خود تو آپ نے ہیلمٹ پہنا ہوا ہے اس لیے دو چار چوٹیں ہی آتی۔ لیکن میں سیدھی اللہ کے پاس جاتی۔ اب اس بات پر شکر کرنا تو مہتا ہے

نا۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

پتا نہیں اللہ نے عورتوں کو اتنا شکرا کیوں پیدا کیا ہے؟؟؟

ایک تو میں تم پورے دامن کی عورت کو اس نازک سی بانیک پر لا کر اتنا بھگا کر لایا ہوں اور اوپر سے تم سینہ کو بی بھی کر رہی ہو۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جہنم بھرا ہوگا تم عورتوں سے۔۔۔

ارسل۔۔۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں؟؟؟ میں عورت ہوں؟؟؟ اور وہ بھی دامن کی؟؟؟ اور آپ مجھے لا کر لائے ہیں؟؟؟ اور میں سینہ کو بی کر رہی ہوں؟؟؟ یہ آپ کیسے بول رہے ہیں؟؟؟ اسے واقعی دوسو واٹ کا جھٹکا لگا تھا۔

اور اسے منہ بنانے کا موقع دیے بغیر وہ اپنی بانیک اڑا کر لے گیا۔ اور وہ جو اس کے سامنے اس سے ناراض ہونے کا سوچ رہی تھی خود ہی اس کی بات اور الفاظ پر کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

اس کے دل سے ارسلان کی سلامتی کی دعا نکلی۔ اس نے سکول کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ساتھ ہی آیت الکرسی پڑھ کر اس کا تصور کر کے پھونکا۔

وہ بالکل عین وقت پر سکول پہنچی تھی۔ بچے اسمبلی کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بھی جلدی سے چلی گئی۔۔۔

اسمبلی ختم ہوئی تو واپس سٹاف کے کمرے میں جا کر اس نے روز کی طرح اپنا موبائل چیک کیا۔۔۔ موبائل کی سکرین ایک پیغام کا اشارہ دے رہی تھی۔۔۔

دامن کی سینہ کو بی کرنے والی عورت سے سوری

اور ساتھ میں ایک شریہ قسم کا کارٹون بھی بنا ہوا تھا۔

اسکے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مہینج کرنا اسے یاد تھا لیکن اسے تنگ کرنا بھی نہیں بھولا تھا۔۔۔

معافی نامہ منظور اور ساتھ میں ایک نعصلہ سا کارٹون بنا کے بھیج دیا اس نے۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب ارسلان کا جواب اس وقت آئے گا جب اس کا چائے کا وقفہ ہوگا۔

پچھلے کچھ دنوں سے اسکے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر اسکے دوست کافی پریشان تھے لیکن وہ نہ تو کسی کو کچھ بتا رہا تھا اور نہ ہی وہ خود کچھ سمجھ پا رہے تھے۔ وہ اکثر اس سے پوچھتے رہتے لیکن وہ یا تو خاموش رہتا اور یا پھر کوئی ایسا جواب دیتا کہ وہ کچھ پوچھ ہی نہ پاتے۔ اس لیے اب انہوں نے اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ آخر وہ سنجل ہی جائے گا۔۔۔

اس کا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر کسی تنہا کونے میں بیٹھ جاتا یا پھر اس

میدان میں جا کر گھنٹوں گھنٹوں وہی بیٹھا رہتا۔
اور پھر اس کا ماضی ایک فلم کی طرح اسکے دماغ میں چلنے لگتا۔۔۔ آج بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ کتنی دیر سے
بیٹھا اپنا ماضی ہی کرید رہا تھا۔۔۔۔۔ مجاہد اللہ کا ماضی۔۔
یا پھر۔۔۔۔۔
جانے کس کا ماضی تھا وہ؟؟

مجاہد۔۔۔ اوئے مجاہد اٹھ جاؤ۔۔۔ فجر کی اذان ہو رہی ہے۔۔۔۔
سیف اللہ نے اسے آواز دی۔۔
اور وہ اس کی پہلی آواز کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ وہ صبح جلدی اٹھنے اور ورزش کا عادی تھا اور کل دن کی
تھکان کی وجہ سے اسے رات کو بہت گہری نیند آئی اور اسی وجہ سے اس کی آنکھ اذان کے ساتھ نہیں کھل
سکی۔
چلو جلدی سے اٹھ جاؤ اور وضو کر لو پھر جماعت میں آ جانا۔ سیف اللہ نے اس کی رہنمائی کی کوشش
کی۔

ٹھیک ہے۔ وہ بستر سے اٹھ گیا۔۔
سیف اللہ تم وضو کر چکے ہو؟؟ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر پوچھا۔
ہاں میں کر چکا ہوں اور میں مسجد جا رہا ہوں۔۔۔ حمزہ اور عمر لوگ وضو کرنے گئے ہیں۔ تم بھی جاؤ۔۔
ٹھیک ہے تم جاؤ۔۔۔ اور وہ وضو کرنے چلا گیا۔
وضو کر کے کمرے میں آیا تو حمزہ اور عمر جا چکے تھے صرف علی حیدر اپنی چار پائی کے ایک کونے
پر بیٹھا ہوا تھا۔

تم نے مسجد نہیں جانا کیا؟؟؟ مجاہد نے پوچھا
میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سب چلے گئے تو میں نے سوچا کہ میں اور تم ساتھ ہی چلے جاتے
ہیں۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔
اچھا۔۔۔ چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں۔

اور وہ دونوں کمرے سے نکل کر مدرسے کے پیچھے کی طرف بنے مسجد میں چلے گئے۔ نماز سے فارغ
ہو کر حسب معمول سب نے دوبارہ اپنے کمروں کا رخ کیا لیکن مجاہد کو مخالف سمت میں جاتے دیکھ کر حیدر کو
حیرت ہوئی۔۔۔

تم کہاں جا رہے ہو؟؟ اس نے پوچھا۔

میں فجر کے بعد تھوڑا گھومنے پھرنے کا عادی ہوں اس لیے بس ادھر ادھر کہیں تھوڑا سا گھوم کر آتا ہوں۔ تم جاؤ کمرے میں باقی سب بھی چلے گئے ہیں۔

لیکن تم جاؤ کدھر رہے ہو؟؟؟؟ تمہیں تو یہاں کا پتا بھی نہیں ہے۔ مجاہد کو حیرت ہوئی حیدر اس کی اتنی فکر کیوں کر رہا تھا۔

علی حیدر میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو کم جاؤنگا۔ گھوم پھر کر اسی کمرے میں واپس آؤنگا۔ تم فکر مت کرو۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اچھا چلو ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ وہ بھی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

تم فکر کیوں کر رہے ہو حیدر۔ تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

فکر کی بات نہیں ہے بس ویسے ہی۔ چلو چلتے ہیں۔ آج اسی بہانے میں بھی صبح کی سیر کر لوں گا۔ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

اور وہ دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

مدرسہ کافی بڑا تھا۔ دو دروازے تھے ایک دروازہ بالکل مسجد کے بائیں طرف تھا اور دوسرا بڑا دروازہ بالکل سامنے کو تھا۔ بڑے دروازے سے داخل ہو تو اس سے ملحقہ دیوار کے ساتھ دو بڑی راہداریاں بنی ہوئی تھیں جن میں صبح دوپہر شام کو کھانا کھایا جاتا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں کمرے بنے ہوئے تھے جس میں مدرسے میں پڑھنے والے لڑکے رہتے تھے۔ قطار میں بہت سارے کمرے تھے جن میں مختلف درجوں کے اپنے اپنے الگ حصے بنے ہوئے تھے۔ اس پوری قطار کے آخر میں غسل خانے اور وضو کی جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ کمروں کے دائیں طرف دیوار تھی اور کمروں سے کافی فاصلے پر دیوار کے ساتھ کچھ بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے جن میں علی حیدر کے مطابق وہ لوگ سبق پڑھتے تھے۔ اسی دیوار کے ساتھ آگے جا کر کونے میں مسجد بنی تھی۔ مسجد بڑے دروازے کے دائیں طرف کی دیوار اور دروازے کے سامنے والے دیوار کے کونے میں تھی۔ اسی بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ آگے آ کر دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں پر بڑے بڑے تالے پڑے تھے۔

ان کمروں میں کیا ہوتا ہے حیدر؟؟؟ مجاہد نے پوچھا۔

پتا نہیں۔ میں تو جب سے آیا ہوں میں نے ان کمروں پر یہی تالے لٹکے ہوئے دیکھے ہیں۔ اس نے

بتایا۔

تم کب سے آئے ہو؟؟؟ مجاہد نے ایک اور سوال کیا
مجھے آئے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے۔

کیا؟؟؟ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے یہ کمرے بند ہیں؟؟؟
ارے نہیں یار۔۔۔ ڈیڑھ مہینے سے تو میں آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلے سے بند ہوں۔۔
ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔۔ مجاہد بولا۔

لیکن یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات کو کھلتے ہیں اور جو کھانا ہم لوگ کھاتے ہیں وہ اناج یہاں
پر رکھا جاتا ہے اور کچھ سے تو میں نے سنا ہے کہ یہ کمرے پہلے استعمال ہوتے تھے۔
کس چیز کے لیے؟؟؟؟
یہ تو نہیں پتا یار۔۔

اچھا۔۔ چلو چھوڑو دفع کر دو ہمیں کیا
چلو مجاہد واپس چلتے ہیں۔ ابھی ناشتہ کا وقت بھی ہونے والا ہے۔ پھر سبق پڑھنے بھی جانا ہے۔
حیدر نے اطلاع دی۔

ہاں ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں۔ اس نے ہائی بھری
اور وہ دونوں دوچکر کاٹ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

رحمت اللہ آپکے ابا کہہ رہے تھے کہ وہ آپکو مدد سے بھیج دیجئے آگے علم حاصل کرنے کے لیے۔
آج کافی دنوں بعد موقع پا کر جمعے کی نماز کے بعد قاری صاحب نے اسے روک کر پوچھا۔
جی قاری صاحب ابانے فیصلہ کر لیا ہے گھر میں بھی سب کو بتایا ہے۔ اس نے تائید کی۔۔
اچھا۔ گھر میں سب کو پتا ہے؟؟؟ انھیں حیرانگی ہوئی۔۔
جی۔۔۔۔

تو رحمت آپکی اماں اس فیصلے سے خوش ہیں کیا؟؟؟؟ انھوں نے ایک بار پھر پوچھا
نہیں قاری صاحب وہ خوش نہیں ہیں لیکن یہ ابا کا فیصلہ ہے۔۔
رحمت بیوا! آپ کے ابا آئے تھے میرے پاس۔ انہوں نے وہ ساری باتیں مجھے بتائی ہیں جن کی
وجہ سے وہ آپ کو بھیج رہے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔ قاری صاحب نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔
رحمت اللہ نے اچنبھے سے قاری صاحب کی طرف دیکھا۔ ایسے جیسے کوئی چور فر دھرم پڑھ کر سنانے
پر قاضی کی طرف دیکھتا ہے۔۔

لیکن جیسا مجھے آپ کے ابا کی بات پسند نہیں آئی۔ اگر آپ وعدہ کرو کہ آپ آئندہ ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے تو میں آپ کے ابا سے بات کر لوں گا۔ کسی ماکسی طرح وہ فیصلہ بدل ہی دیں گے۔ انہوں نے امید دلائی۔۔۔

وہ خاموش رہا۔

بیٹا آپ بتاؤ نا۔ آپ کے باپ سے بات کروں میں؟؟؟ انہوں نے پھر پوچھا۔۔

نہیں قاری صاحب۔ میں خود جانا چاہتا ہوں۔

اور اپنی بات کا اختتام کرتے ہی وہ اٹھا اور مسجد سے باہر چلا گیا۔ قاری صاحب پیچھے سے اسے دکھا اور تاسف سے دیکھتے رہے۔ ان کی نظروں کے سامنے سے بہت سارے سال پر لگا کر اڑ گئے تھے۔

کتنی مماثلت تھی ہارون اور رحمت میں۔ وہ بھی تقریباً اسی عمر کا تھا۔ قد کا ٹھہر کا بھی اتنا ہی ہوگا۔ اسے بھی بہت شوق تھا کہ اسے جا کر پڑھنے کا۔ اسے بھی روکا گیا۔ لیکن وہ بھی ایسے ہی خود جانا چاہتا تھا۔ جیسے آج رحمت اللہ کہہ کر گیا کہ وہ خود جانا چاہتا ہے۔ اور ہارون تو چلا بھی گیا تھا۔

یہ ایک کل میں نے عبداللہ اور حسن کو بھی بتا دیا ہے۔۔۔۔۔

کیا بتایا ہے؟؟؟

یہی کہ آپ سپر مین ہیں۔۔۔

بابا ہا۔۔۔ تو انھوں نے کہا کیا؟؟؟؟

وہ بہت حیران ہوئے جب میں نے ان کو بتایا کہ آپ گندے لوگوں کو مارتے ہیں۔۔۔

پاپا میں اور ماما کل مارکیٹ گئے تھے تو وہاں پر ایک گاڑی والے نے میرے جتنے ایک لڑکے کو بہت مارا۔ پاپا آپ آئیں گے تو میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔ آپ اس گاڑی والے کو مارا۔ آئی بیٹ! ہم۔۔۔
لیکن کیوں بیٹا؟؟؟؟ میں کیوں ماروں؟؟؟

شہید اپنے باپ سے فوں پر مچھو گفتگو تھا۔ اس کی عادت تھی کہ پورے ہفتے میں جو اسے یاد ہوتا تھا وہ اپنے باپ کو بتاتا تھا۔ کل مارکیٹ میں سے بھی وہ جو دیکھ کر آیا تھا وہی بتا رہا تھا۔

پاپا وہ آدمی بہت گندہ تھا۔ وہ لڑکا پھول بیچ رہا تھا اور وہ آئنی کوروک کر پھول دے رہا تھا تو اس شخص نے اسے تھپڑ مارا۔ میں اس لڑکے کے پاس جا رہا تھا لیکن ماما نے مجھے نہیں جانے دیا۔۔

کیوں نہیں جانے دیا؟؟؟؟

یتا نہیں ماما کو یتا ہوگا۔۔

لیکن پاپا پھر جب وہ لوگ چلے گئے تو میں گیا اس کے پاس۔ وہ رو رہا تھا۔۔۔ وہ اپنے مخصوص معصوم لہجے میں بول رہا تھا۔

پھر کیا کیا آپ نے جیہا؟؟؟ وہ بھی اپنے بیٹے کی باتوں میں دلچسپی سے رہا تھا۔۔۔ کچن میں کام میں مصروف عائشہ کے کان بھی ان باپ بیٹے کی باتوں پر تھے۔ فون کے دوسری طرف کی آواز تو وہ نہیں سن پا رہی تھی لیکن اپنے بیٹے کی باتیں وہ سن رہی تھی۔

پاپا وہ بہت رو رہا تھا۔ ماما نے مجھے جو پیسے دیے تھے وہ میں نے اسے دے دیے۔۔۔

سارے پیسے دے دیے؟؟؟؟؟ ماما ہنوا ز نے حیرانگی سے پوچھا

جی پاپا سارے دے دیے۔۔۔ وہ بہت رو رہا تھا تو۔۔۔ اس نے اپنے عمل کی توجیح پیش کرنے کی کوشش کی۔۔۔

مٹا باش میرا بیٹا بہت اچھا کیا۔ دل خوش کر دیا پاپا کا۔ وہ واقعی خوش ہو گیا۔۔۔ اس کا بیٹا کم سے کم کسی غریب کا دکھ تو سمجھتا تھا۔۔۔

لیکن پاپا اس نے نہیں لیے پیسے۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ لے لو لیکن اس نے کہا کہ میں پیسے تب لوں گا جب کوئی میرے پھول خریدے گا۔۔۔

اوہ۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ مٹا ہنوا ز کے لہجے میں اداسی آ گئی۔۔۔

پاپا پھر میں نے اور ماما نے اس کے سارے پھول خرید لیے۔ اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ سچ؟؟؟؟؟ وہ حیران ہوا۔

بلکل سچ پاپا اور میں نے وہ سارے پھول پانی میں رکھ دیے ہیں۔ ماما نے بتایا کہ اس طرح یہ بہت دن تک تازہ رہیں گے۔ اب جب آپ آئیے تو میں آپ کو بھی دکھاؤں گا۔۔۔

لیکن جب تک میں آؤں گا تب تک تو وہ مر جائیے۔۔۔ وہ لہجے میں میں اداسی بھرتے ہوئے بولا۔۔۔

نہیں پاپا۔۔۔ نہیں مر جائیے۔ میں نے پانی میں رکھ دیے ہیں۔۔۔ وہ پر امید تھا۔

لیکن اگر میرے آنے سے پہلے مر جائیے تو۔۔۔۔۔۔۔

تو پاپا ہم جا کر اس لڑکے سے اور پھول لے آئیے وہ روز وہاں ہوتا ہے۔۔۔

ہاں یہ ٹھیک ہے ہم اور لے آئیے۔۔۔ اس نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔۔۔

لیکن پاپا آپ اس گندے آدمی کو مار پیچے گا جس نے اس لڑکے کو مارا؟؟؟؟؟

ہاں جی ضرور ماروں گا۔۔۔ لیکن وہ آدمی ہمیں ملے گا کیسے؟؟؟

پاپا میں آپ اور ماما روز مارکیٹ جایا کریں گے۔ وہ بھی مارکیٹ آئے گا تو آپ اسے گن سے مار دینا۔۔۔
ٹھیک ہے ماما پاپا؟؟؟؟؟؟

ہاں بیٹا یہ تو بالکل ٹھیک کہا۔ ہم روز جائیں گے تو اسے ڈھونڈ لینگے لیکن بیٹا ہم آپ کی ماما کو نہیں لے کر جائیں گے۔ وہ بات کو طول دے رہا تھا۔ اپنے بیٹے سے بات کرنا اسے دنیا کا سب سے دل آویز کام لگتا تھا۔

کیوں؟؟؟؟؟ شہرہ کے لہجے میں پھر وہی معصومیت اتر آئی۔
کیوں کہ بیٹا جیسے وہ آپ کو جانے نہیں دے رہی تھیں ایسے ہی پھر مجھے بھی اس گندے آدمی کو مارنے نہیں دینگے۔۔۔

بس ٹھیک ہے پاپا ہم ماما کو نہیں لے کر جائیں گے۔ میں اور آپ جایا کریں گے۔۔۔
اور کچن میں مصروف عائشہ کو ہنسی آئی اپنے شوہر اور بیٹے کی باتیں سن کر۔۔۔
وہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آئی۔ شہرہ سمجھ گیا کہ اب اسے فون ماما کو پکڑا دینا چاہیے۔۔۔
پاپا میں کارٹون دیکھتا ہوں۔ آپ ماما سے بات کر لیں۔ اور ماما سے بھی۔ اور اسے فون عائشہ کی طرف بڑھایا لیکن پھر اچانک کچھ یاد آنے پر دوبارہ فون کان سے لگا لیا۔۔۔
ہیلو پاپا۔ آپ اپنی گن ضرور لائیں گے گا اس گندے آدمی کو مارنا ہے۔۔۔
ہاں بیٹا آپ فکر نہ کرو گن ضرور لاؤں گا۔۔۔
اور شہرہ فون عائشہ کو پکڑا کر خود کارٹون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تو باپ بیٹے کی صلح کیا ہو گئی ماما کو کچ میں سے نکال ہی دیا؟؟؟ عائشان کی باتیں سن چکی تھی۔۔۔
ہا ہا ہا۔۔۔ نہیں جناب ماما کو کیسے نکال سکتے ہیں۔ شہرہ کی ماما ہمیں گھر سے نہیں نکال دینگے۔۔۔ اس نے خوشدلی سے کہا۔

جواب میں وہ صرف ہنس دی۔۔۔

عائشہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ میں تم لوگوں کو وقت نہیں دے پاتا۔۔۔
ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما ہنواز۔ آپ خواہ مخواہ فکر نہ کریں۔ اس نے تسلی دی۔۔۔ حالانکہ ماما ہنواز کے بغیر کبھی کبھی وہ بھی بہت اداس ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن پھر اس کی والدہانہ محبت کو یاد کر کے خود کو تسلی دے دیا کرتی اور اب اس کی ایسی بات سن کر تو اس کی آنکھوں کے کنارے بھینگنے کو تھے لیکن وہ اس کے سامنے کمزور پڑ کر اسے مزید اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

نہیں عائشہ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ میں نے شہرہ کی ساری ذمہ داری بھی تمہارے سر ڈال دی ہیں

اور تم لوگوں کو وقت بھی بالکل نہیں دے پاتا لیکن یا رکیا کروں ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ میں بے بس ہوں۔۔۔
وہ ان دونوں کی اتنے عرصے تک دوری پر بہت اداس ہو رہا تھا۔

ایسا نہ کہیں شاہنواز پلینز۔ شرمندگی کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی شہر کی ذمہ داری مجھ پر بوجھ ہے اور دوسری بات یہ کہ آپ سے شاہی سے پہلے میں یہ سب جانتی تھی کہ آپ عام لوگوں جتنا وقت نہیں دے سکتے اس لیے میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔۔۔ آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لیں پلینز۔۔۔ آنسوؤں کا ایک گولہ اس نے حلق سے اتار لیا۔

اور فون کی دوسری طرف شاہنواز اسکی آواز کا بھگیا پن جان چکا تھا لیکن جانتا تھا کہ اسکی بیوی اس سے کبھی شکایت نہیں کرے گی۔ وہ خود آنسو پی جائے گی لیکن اسکے سامنے بہا کر اسے کبھی کمزور نہیں ہونے دے گی۔ اور یہی کچھ وہ اپنے بیٹے میں بھی منتقل کر رہی تھی۔

مجاہد اللہ کو مدرسے میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اپنے شدید تجسس کے باوجود اسکی ملاقات ابھی تک بڑے مولانا صاحب سے نہیں ہو سکی تھی۔ اسے بتایا گیا کہ بڑے مولانا صاحب ہفتے میں صرف ایک بار درس دیتے ہیں۔ اور وہ بھی اگر انہیں وقت مل جائے تو۔ ورنہ کبھی کبھی ہفتے گزر جاتے ہیں اور وہ مدرسے کا رخ نہیں کر پاتے۔۔۔

آج جمعہ کا دن تھا اور مولوی ثناء اللہ نے کل اعلان کیا تھا کہ بڑے مولانا صاحب کا درس ہوگا۔ آج صبح سے مدرسے میں جوش و خروش پایا جا رہا تھا۔ سیف اللہ نے اسے بتایا کہ بڑے مولانا صاحب کے ہر درس کے لیے طلباء میں ایسا ہی جوش ہوتا ہے۔

عام طور پر تو بد رسہ مولوی ثناء اللہ مولوی بلال اور مولوی صلاح الدین کی زیر نگرانی چلتا تھا لیکن لوگ کہتے تھے کہ اصل نگران مولانا عبد الرحمان ہیں۔

آج انہیں مانتے کے فوراً بعد سبق پڑھنے نہیں جانا تھا بلکہ انہیں کہا گیا کہ دس بجے مولانا صاحب کا درس شروع ہوگا لہذا انہیں دس بجے تک مدرسے میں ہونا چاہیے تھا۔

بڑے مولانا صاحب کیسے آدمی ہیں یا رجن کی شہرت اتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے؟؟؟ اس نے
ماشتے سے فارغ ہو کر کمرے میں آتے ہوئے حیدر سے پوچھا۔

یا آج خود دیکھ لیا۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ اللہ نے بہت درجات دیے ہیں ان کو۔ اس نے تعریف کی۔۔

اچھا۔ یہ تو سنا ہے میں نے۔۔۔ اے پہلے اپنی معلومات کا بتایا۔

یا مجاہد ایسا اثر ہے انکی زبان میں کہ انسان دگ رہ جائے۔ مولوی ثناء اللہ بھی ہیں۔ مولوی بلال اور قاری صلاح الدین بھی ہیں لیکن جو چیز انکو اللہ نے دی ہے اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ حیدر بڑے مولانا صاحب سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

تم کچھ زیادہ ہی تعریف نہیں کر رہے ہو؟؟؟ مجاہد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
نہیں یا اس مدرسے کا ہر طالب بڑے مولانا صاحب سے ایسا ہی متاثر ہے۔ دیکھنا آج تم ملو گے تو تم بھی تعریف ہی کرو گے۔

چلو دیکھتے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔۔۔ ویسے جتنی تعریف سنی ہے اب تو ان کی شخصیت سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اس نے سرگوشی کی۔

نہیں یا رڈ رنر کی ضرورت نہیں ہیں۔ وہ تو طلباء کے ساتھ باپ سے بڑھ کر شفیق ہیں۔ تم ابھی ڈر رہے ہو لیکن ان سے ملو گے تو تم بھی انکے سحر میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ یہ دعویٰ امیر حمزہ نے کیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں پر مولانا عبدالرحمان کا کیسا اثر تھا۔

گزرے سات دنوں میں مجاہد اللہ کی سیف اللہ، امیر حمزہ، عمر فاروق اور علی حیدر کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس میں زیادہ دخل اسکی بے تکلف طبیعت کا تھا اور ان میں سے بھی خاص طور پر علی حیدر اور سیف اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اس کی وجہ ان دونوں کا اسکا بے حد خیال رکھنا تھا۔

اب ناشتہ کر کے وہ دس بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب کمرے میں بیٹھے اس وقت بڑے مولانا صاحب کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔

چلو سب اٹھ جاؤ۔ وضو کرو اور پھر چلنے کی تیاری کرو۔ ساڑھے نو بجے تو عمر نے محفل برخواست کرنے کا کہہ دیا۔ وہ سب اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے تاکہ دس بجے سے پہلے پہنچ جائیں۔

دس بجنے سے پہلے سارے طلباء راہداری میں جمع ہو گئے۔ آج مجاہد اللہ کا پہلا درس تھا۔ اور مولانا عبدالرحمان کے بارے میں وہ اتنا کچھ سن چکا تھا کہ وہ تھوڑا زوریں تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ہر نئے آنے والے طالب کا ان سے تعارف کرایا جاتا ہے۔ سو آج مجاہد اللہ کا تعارف ہوا تھا بڑے مولانا سے۔۔۔

پورے دس بجے مولانا صاحب مولانا ثناء اللہ اور باقی دونوں کے ساتھ راہداری کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ مجاہد اللہ تو انکو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسی بارعب شخصیت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے چہرے سے نور نکل رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں تسبیح تھام رکھی تھی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سارے طلباء کے سامنے آئے جو انکے احترام میں کھڑے ہو گئے تھے انہوں نے سب

کو سلام کیا اور جواب پا کر سر کے اشارے سے سب کو بیٹھنے کا کہا اور خود بھی تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔
مولوی ثناء اللہ اور باقی دونوں ان کے پیچھے بیٹھ گئے۔۔۔۔۔

کیسے ہو بچوں؟؟؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے بھاری لیکن بے حد نرم آواز میں پوچھا۔ سب نے
ایک ساتھ با آواز بلند انہیں خوشی سے جواب دیا۔

مولانا صاحب نے مڑ کر مولوی ثناء اللہ کی طرف دیکھا اور کچھ پوچھا اور پھر جواب پا کر پھر مڑے
اور ہاتھ کے اشارے سے مجاہد کو اپنے پاس بلا دیا۔ اس نے سنا تو تھا کہ مولانا صاحب ہر نئے آنے والے
سے ملتے ہیں لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح سب کے سامنے اسے اپنے پاس بلا لیں گے۔ وہ
ڈرتے ڈرتے اٹھا اور بالکل لڑکھڑاتے قدموں سے انکے پاس گیا۔

بیٹھ جا بیٹا۔ انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے وہاں بیٹھ گیا۔ اسکی نظریں زمین پر تھیں۔ مولانا صاحب کے پروقاہ چہرے کی طرف
نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اسکی۔

نام کیا ہے بیٹا؟؟؟؟

مجاہد اللہ۔۔

ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ بہت اچھا نام ہے۔ اللہ تمہیں اپنے نام کی لاج رکھنے کی ہمت دے۔ انہوں نے
اسکے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔

آپ یہاں خوش ہونا بیٹا؟؟؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟؟؟ انہوں نے اسی پر شفقت لہجے میں
پوچھا۔

جی مولانا صاحب میں بہت خوش ہوں کوئی تکلیف نہیں ہے یہاں پہ۔۔

ٹھیک ہے بچے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اپنے قاری صاحب کو بولا کرو اور اگر وہ بھی نہیں تو مجھے
بولا کرو۔ ٹھیک ہے نا؟؟؟

جی ٹھیک ہے۔ اور اٹھ کر اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔ وہ انکی عاجزی اور ملنساری سے بہت متاثر ہو رہا
تھا۔

مجاہد اللہ نے مولانا صاحب کے بارے میں جو سنا تھا انکو اس سے بڑھ کر پایا۔ انکی شخصیت بیک
وقت کئی اطراف سے انسان کو اپنے حصار میں لینے والی تھی۔ رعب اتنا تھا کہ نظر اٹھانا مشکل تھا انکی
طرف۔ جبکہ چہرے پر وہ نور تھا کہ نظر ایک بار پڑ جاتی تو دوبارہ پلٹنا مشکل ہو جاتا۔ آواز میں وہ بھاری
ہن کے بولتے تو لگتا کہ جیسے بادل گزر گزرا رہے ہیں اور لہجے میں وہ نرمی کہ جیسے منہ سے پھول جھرنے کو

ہیں۔ وہ باقی سب کی طرح مجاہد اللہ کو بھی اپنے حصار میں جکڑ چکے تھے۔ وہ کسی معمول کی طرح انکے سامنے سے اٹھ کر اپنی جگہ پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔

دیکھو بچے! ہم انسانوں کی حقیقت کیا ہے؟؟؟ ہم انسان جو اتنا تکبر کرتے ہیں وہ صرف اس لیے کہ ہمیں لگتا ہے کہ اگر ہم نہیں رہیں گے تو اس دنیا کا نظام نہیں چل پائے گا۔ جبکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ اس کائنات میں ہم انسان ایک وجود سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وجود کا مطلب سمجھتے ہو یا؟؟؟ یہ جو سامنے دروازہ ہے۔ یہ جو میرے ہاتھ میں عصا ہے یا یہ جو تکیہ ہے جس پر میں نے ٹیک لگا رکھی ہے یہ سب اپنے اندر ایک وجود رکھتے ہیں لیکن یہ اپنے آپ میں کوئی ذات نہیں ہیں۔ ہم بھی اپنے اندر وجود تو رکھتے ہیں لیکن ذات نہیں ہیں۔ ذات صرف ایک ہے جو اللہ کی ہے۔ وہ مکمل ہے۔ اس نے کن کہا کائنات بن گئی۔ وہ کن کہہ دے گا کائنات تباہ ہو جائے گی۔ وہ پھر کن کہہ دے گا تو اس جیسی کئی اور کائناتیں تخلیق ہو جائیں گی۔ وہ تھا، وہ ہے اور وہ رہے گا۔ ہم نہیں تھے اب ہیں اور نہیں رہیں گے۔ کیونکہ ہم وجود ہیں ذات نہیں۔ ذات تو لافانی ہی۔

وہ کچھ دیر کیلیے رکے اور طلباء کی طرف نظر کی۔ سب انکے لہجے اور الفاظ کے سحر میں کھو چکے تھے۔ انہوں نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بولنا شروع کیا۔

بچے اللہ کو ہم انسانوں سے صرف عبادت نہیں چاہیے۔ اگر اللہ کو صرف اپنے سامنے ایک جھکنے والی مخلوق کی ضرورت ہوتی تو انسانوں کو پیدا کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سجدے کرنے کے لیے فرشتے کافی تھے جو ایک سجدہ اتنا کرتے ہیں جو ہزاروں سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے سامنے ان پودوں بیڑوں پہاڑوں مٹی ریت اور پتھروں کو جھکا دے۔ پھر انسان کو کیوں پیدا کیا؟؟؟ اور اسے اشرف المخلوقات کیوں بنایا۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کو سجدے اور عبادت کے علاوہ بھی کچھ چاہیے۔ مطلب اس کی پیدائش کا کچھ ایسا مقصد ہے جو اسکے سامنے جھکنے سے آگے ہے۔

انہوں نے ایک بار پھر وقفہ لیا۔ وہ ایسے مہر مہر کر بول رہے تھے کہ انکے منہ سے ٹکٹے والا ہر لفظ سننے والے کے دل اور دماغ پر اثر کر رہا تھا۔ مجاہد پہلی ہی ملاقات میں سمجھ گیا کہ انہیں کسی بھی انسان کو سمجھانا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اور وہ کسی بھی انسان کو اپنے سحر میں جکڑ سکتے ہیں۔

اب دیکھو بچے۔ ہم نے اسلام کو صرف عبادت کا مجموعہ سمجھ لیا ہے۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہے۔ پہلے عرض کر چکا کہ اگر صرف عبادت ہی انسان کی پیدائش کا مقصد ہوتا تو انسان کی پیدائش تو خود ایک سوالیہ نشان ہے۔ لیکن انسان کی پیدائش اور اسے صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی سمجھ بوجھ دینا اس بات کی دلیل

ہے کہ اللہ نے اس دنیا میں اس کے لیے کچھ غلط اور کچھ صحیح رکھا ہے۔ اب جب اللہ نے اسے یہ عقل بھی دی ہے کہ وہ فرق بھی کر سکے تو اگر وہ پھر بھی صحیح کو نہیں چنتا تو اسے سزا ملنا بھی ضروری کر دیا ہے۔

اللہ کے سامنے تو ہر مذہب کے پیروکار جھکتے ہیں۔ چاہے وہ بھگوان کی صورت میں ہوں یا اللہ کی صورت میں۔ مسجد جانے والا بھی اللہ کے سامنے جھکتا ہے ہندو جانے والا بھی ایک بھگوان کی پوجا کرتا ہے، اگر جانے والا بھی اسی ایک خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ پھر یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اگر اللہ کے سامنے ہی سب جھکتے ہیں تو اتنے سارے مذاہب کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تو بس ایک مذہب ہونا چاہیے تھا جس میں سب اللہ کی عبادت کریں۔ ایسا ہی ہے مانجیوں؟؟؟؟؟

انھوں نے طلباء کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

جی مولانا صاحب۔۔۔ سب نے ایک آواز کہا۔

تو جو ہمارا مذہب ہے وہ اللہ کا پسندیدہ ترین مذہب ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی مذاہب نعوذ باللہ غلط ہیں یا جھوٹ پر مبنی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے میں ٹھیک تھے جب وہ مازل ہوئے تھے لیکن بعد میں آنے والے پیروکاروں نے انہیں سلی حالت میں رہنے ہی نہیں دیا سو آخر میں اسلام کو بھیج کر ان باقی مذاہب کو منسوخ کرنا پڑا۔ اب جو بھی اس مذہب کا پیروکار ہے وہ غلط ہے۔ کیوں کہ اسے خود بھی نہیں پتا کہ جو اس کا مذہب ہے وہ اصل حالت میں کیسا تھا۔ ایک صرف اسلام ہے جو آج بھی اپنی اصلی حالت میں ہے۔

تو بچوں آج ہم نے آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف اللہ کی عبادت کرنا نہیں ہے۔ اب اس کی پیدائش کے ممکنہ مقصد پر اگلے ہفتے کے درس میں بات کریں گے۔ اور اگر وقت بچا تو کسی اور موضوع پر بھی بات ہوگی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ اللہ حافظ۔ اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ سارے طلباء بھی اٹھ کر اپنے کمروں میں واپس آ گئے۔

ظفر کے ابا! رحمت کو میں سمجھا لوں گی۔ وہ آئندہ ایسا کچھ بھی نہیں کرے گا بس اسے مدرسے سے مت بھیجو۔ جیلہ التجانی لہجے میں فضل سے کہہ رہی تھی۔

نہیں جیلہ۔ اب رحمت مجھ سے سنبھالا نہیں جاتا، مدرسے چلا جائے گا تو شاید کچھ زندگی کو دیکھ لے

گا۔

لیکن وہ بچہ ہے فضل۔۔۔ وہ چھوٹا ہے ابھی۔ کچھ سال مزید گزر جائیں تو پھر بھیج دیں گے لیکن ابھی میرا دل نہیں مان رہا۔

وہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے جیلہ۔ اپنے آپ کو اچھی طرح سنبھال سکتا ہے اور بس یہی آخری وقت ہے ہمارے پاس جس میں وہ سدھر سکتا ہے اور پھر یہ وقت بھی گزر گیا تو ہاتھ ملتے رہینگے پھر۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ سدھر جائے گا فضل۔ وہ اپنی بات پر انکی تھی، ماں تھی۔ کیسے سمجھتی۔

وہ کبھی نہیں سدھرے گا جیلہ اگر یہاں رہا تو۔ گھر سے باہر جا کر شاید سدھر جائے۔

وہ سارے اس وقت صحن میں نیم کے درخت کے پچھے دو چار پائیوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لوگ گھر واپس آ گئے رحمت ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اس دن کی مار کھانے کے بعد اتنے دنوں بعد آج نماز پڑھنے مسجد گیا تھا۔ جب سے فضل نے اعلان کیا تھا کہ وہ رحمت کو مدرسے بھیج رہا ہے جیلہ کو کسی پل قرار نہیں مل رہا تھا لیکن اس دن کے بعد اسکی ہمت نہیں ہوئی تھی فضل سے اس موضوع پر بات کرنے کی۔ اسے غصے سے واقف تھی وہ اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ابھی تک غصے میں ہے لیکن آج اتنے دن بعد اسکا موڈ تھوڑا سا بہتر دیکھ کر اس نے بات کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔ ظفر تو کمرے میں سو گیا تھا۔ اماں مسجد سے سیدھا گھر کا سودا لانے دکان گیا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے ایک چار پائی پر فضل اور اصغر اور دوسری پروجید جیلہ ورزینت بیٹھے تھے۔

جیلہ کوشش کر رہی تھی فضل کو سمجھانے کی۔ اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ تو کوئی بات سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ اسلیے اس نے خاموش ہونا ہی بہتر سمجھا۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی رحمت بھی گھر آ گیا اور آ کر سیدھا جیلہ کو کول کے ساتھ چار پائی پر بیٹھ گیا۔۔۔ جیلہ کے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا تو وہ فوراً بولی۔۔۔

رحمت تیرا ابا تجھے مدرسے بھیجنا چاہتا ہے۔ جو تو نے کیا ہے اس پر وہ بہت ناراض ہیں تجھ سے۔ میں تیرے ابا سے کہہ رہی ہوں کہ تو اب کے بعد ایسا کچھ بھی نہیں کرے گا۔ وہ تجھے مدرسے نہ بھیجیں۔۔۔ رحمت نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسکی طرف بہت پر امید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا۔

بول نہ بیٹا۔ کہ تو آئندہ اپنے ابا کو تکلیف نہیں دے گا۔۔۔

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اسکی نظریں زمین پر تھی۔۔۔

جیلہ کو لگا جیسے اسے سنائی نہیں دے رہا۔ اس نے جھنجھوڑا۔

بول ما رحمت کہ تجھے مدرسے نہیں جانا اپنے گھر اور اماں کو چھوڑ کر۔

اماں میں خود جانا چاہتا ہوں۔ میں یہاں حفظ پڑھ چکا ہوں اور اب آگے میں قاری صاحب کے

پاس نہیں پڑھنا چاہتا۔ میں مدرسے جا کر پڑھنا چاہتا ہوں اب۔ ابا آپ کسی مدرسے میں بات کر لیں۔۔۔ وہ ایک ہی سانس میں بولا۔

جیلہ کا تو اوپر کاسانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ وہ ہنستوں کی طرح اسکا منہ دیکھتی رہی۔ وہ خود جانا چاہتا ہے؟؟؟؟ لیکن کیوں؟؟؟

وہ اپنی بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ اور جیلہ کے دماغ میں یہی ایک جملہ گردش کرتا رہا۔

میں خود جانا چاہتا ہوں اماں

اس نے نظر اٹھا کر فضل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جیسی سی مسکراہٹ تھی۔ جیلہ کو ایسے لگا جیسے وہ اس کا قنبر ہو۔ وہ اس سے پوچھ رہا ہو کہ۔۔۔۔۔

اب بولو جیلہ بی بی۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ کبھی نہیں سدھرے گا۔ کیا اب بھی کہو گی کہ وہ سدھر جائے گا۔ کیا اب بھی واسطے دے کر روکو گی جب کے تیرے واسطے کو وہ ٹھکر چکا ہے۔۔۔؟؟؟

اور اس نے سر جھکا لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور وہ آٹھ بجے کے ڈرامے اور پھر گھر کا چھوٹا مونا کام اور تھوڑی سی پڑھائی کر کے ابھی لیٹ ہی گئی تھی۔ صبح اسے یونیورسٹی بھی جانا تھا سو وہ جلدی لیتی تھی۔ اس کے فون نے ایک چھوٹی سی رپ دی۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اٹھا کر دیکھا تو سکرین پر صارم کا نمبر اسکے نام سمیت دیکھ کر پہلے تو ایک حیرانی کا جھٹکا لگا اسے اور اس سے منجمل کر اس نے پیغام کھولا تو پانچ چھ الفاظ کا یہ چھوٹا سا میسج بذات خود ایک حیرانی تھی۔ صارم نے ایسے کبھی میسج نہیں کیا تھا۔

وہ اٹھی اور جا کر دروازہ جس کی کنڈی جوا بھی تھوڑی دیر پہلے امی لگا کر لیٹ گئی تھیں کھولی۔ نیچے کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ آکر چلا گیا تھا۔ اس نے سیرھیوں میں نیچے تک جھانکا لیکن مایوسی ہی ہوئی۔ سیرھیوں میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے ہی لگی تھی کہ دفعتاً اسکی نگاہ باہر کی طرف کھلنے والی کنڈی پر پڑی۔

روزانہ جیسا ایک خوبصورت ادھ کھلا گلاب اس میں اٹکا ہوا تھا اور دروازے کی کنڈی کے اوپر ایک چھوٹا سا کاغذ بھی پڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے دونوں چیزیں اٹھائی اور دروازے کی کنڈی دوبارہ جڑھادی۔ اور لاؤنج میں آ گئی۔

رات کے اس پہر تمہیں بلا کر پھول دیتا تو نایا جان کو اچھا نہ لگتا۔ اور انہیں مارض نہیں کر سکتا نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ تم سے مارض ہو۔ بس یہ یقین رکھو کہ آج یہ پھول میں نے خود وہاں سجایا ہے اس امید کے ساتھ کہ تمہیں برا نہیں لگے گا۔ بس میں انتظار کر رہا ہوں مزید ڈیڑھ مہینہ گزرنے کا جب میں تمہیں امی کے ہاتھ سے یا دروازے میں سجا کر پھول نہیں دوں گا۔ اور تب میں تمہیں ڈھیر سارے پھول دیا کروں گا ایک نہیں۔۔۔

صارم

لاؤنج میں کھڑے ہو کر اس نے وہ چند سٹری خط تین بار پڑھا۔ اور مسکرا ہٹ اسکے چہرے پر پھیل گئی۔ عجیب انسان تھا وہ۔ ہمیشہ حیران ہی کرتا رہتا تھا۔ اور وہ اسے بالکل بھی سمجھ نہیں پاتی تھی۔۔۔ کاغذ لپیٹ کر وہ اپنے اور ملیہ کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ ملیہ نے اسکے ہاتھ میں پھول دیکھا تو ایک معنی خیز مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر بستر میں منہ چھپالیا۔ وجہ یہ۔۔۔ نے پھول اپنے ٹیکے کے پاس رکھا اور خط اپنے پرس میں ڈال کر سونے کیلئے لیٹ گئی۔

ان دونوں کی منگنی کے وقت بڑوں کا فیصلہ تھا کہ شا دی دو مہینے بعد جنوری کے پہلے ہفتے میں کی جائے۔ اس وقت تک وجہ یہ بھی امتحانات سے فارغ ہو جائے گی اور صارم کی چھٹی کی درخواست بھی منظور ہو جائے گی۔ اور آج انکی منگنی کو سولہ دن ہو گئے تھے یعنی کہ پورا ڈیڑھ مہینہ رہتا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ شدت سے یہ ڈیڑھ مہینہ گزرنے کا انتظار کر رہا ہے۔۔۔

مجاہد اللہ کو مدرسے میں آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر ابھی بھی وہ تھوڑی سیر کرتا تھا۔ لیکن اب اسکے ساتھ حیدر بھی ہوتا تھا۔ اس ایک مہینے میں اس نے بھی اپنا معمول بنا لیا تھا کہ وہ بھی فجر کے بعد اسکے ساتھ سیر کر لیتا۔ لیکن اب فرق یہ آیا تھا کہ وہ لوگ مدرسے میں نہیں کرتے تھے بلکہ مدرسے سے نکل کر پاس والی بستی کی گلیوں میں پھرتے رہتے تھے۔ یا پھر بستی کے باہر خالی میدانوں میں۔۔۔

اس علاقے میں آبادی ویسے بھی کم ہی ہے۔ کہیں کہیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کچھ گھر دکھائی دیتے ہیں اور وہ گھر بڑے تو ہوتے ہیں لیکن اکثر اوقات کچے ہوتے ہیں۔ مکیں بھی سادہ ہی ہوتے ہیں۔

وہ دونوں کافی دیر خالی میدان یا پھر بستی کے گلیوں میں گھوم پھر کر واپس آجاتے۔ باتیں کرتے اور مقررہ وقت سے پہلے مدرسے واپس آ کر ناشتہ کرتے اور سبق پڑھنے چلے جاتے۔۔۔

زندگی کے گزرے اٹھارہ سالوں میں اس نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور ساتھ میں ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھ لی تھی۔ اب وہ اس مدرسے میں صرف اپنے علم کی پیاس بجھانے آیا تھا، وہ یہاں آٹھ سال کیلئے آیا تھا۔

مجاہد میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟؟؟؟؟؟ خالی میدان کے چکر کاٹتے ہوئے حیدر مجاہد سے مخاطب ہوا۔۔

ہاں بتاؤنا۔ کس بارے میں۔۔

اپنے بارے میں۔

پھر تو ضرور بتاؤ اور فوراً بتاؤ۔۔ وہ خوشدلی سے بولا۔

میں بہت تیز بھاگتا ہوں۔۔۔ وہ شرارت سے بولا۔۔

ہا ہا ہا۔۔۔ ہاں وہ تو تمہارے چلنے سے ہی پتا چلتا ہے۔ میں ایک قدم لیتا ہوں تو تم تین لے چکے ہوتے ہو۔ وہ ابھی بھی اس سے آگے چل رہا تھا۔۔ کھسیانہ ہو کر آہستہ ہو گیا۔۔

ارے جناب چلتے رہیں۔۔ وہ اسے چیڑتے ہوئے بولا

نہیں مجاہد سچ میں۔ جب میں اپنے بچپن میں بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دوڑتا تھا تو میں ان سب سے آگے نکلتا تھا۔

جیسے آج کل مجھ سے آگے نکل جاتے ہو۔۔ ایک بار پھر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

ارے نہیں یا راتم بہت آہستہ چلتے ہو اس لیے میں آگے نکل جاتا ہوں۔۔ وہ وضاحت کر رہا تھا میں جب سکول جاتا تھا تو تب یہ سارے بھاگ دوڑ کرتے تھے ہم۔ اس کے بعد تو آج تک ایک بار بھی دوڑ نہیں لگائی۔

تم سکول جاتے تھے حیدر؟؟؟؟ وہ حیران ہوا۔

ہاں یا میں سکول جاتا تھا۔۔ آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے میں نے۔ اس کے بعد دل نہیں کیا تو نہیں گیا۔۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ مجاہد نے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کے چہرے پر اداسی کے نشانات تھے۔۔ کیا ہوا تمہیں سکول یا دارہا ہے کیا؟؟؟؟

نہیں یا ر سکول یا نہیں آ رہا بلکہ اپنے بچپن کے وہ دوست یا دارہا ہے ہیں جن کے ساتھ دوڑ لگایا کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ پھر چانک ہی مڑ کر اس نے پوچھا۔۔

مجاہد تم سکول جاتے تھے۔؟؟؟؟

نہیں یا میں کبھی سکول نہیں گیا۔

کیوں؟؟؟؟؟ وہ حیران ہوا اس بات پر کہ وہ کبھی بھی سکول نہیں گیا تھا۔
 بس ویسے ہی۔ میرا دل نہیں کرتا تھا، مجھے سکول پسند نہیں تھا۔۔۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔۔۔
 اچھا اچھا سہی ہے۔۔۔ میرا بھی یہی حال تھا۔۔۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔۔۔
 اچھا چلو جلدی کرو۔ اب واپس چلتے ہیں۔ ناشتہ بھی کرنا ہے۔۔۔
 ہاں چلو۔۔۔ اور وہ دونوں واپس مڑ آئے۔

مجاہد اللہ سیف اللہ علی حیدر امیر حمزہ اور عرفا روق کو قاری ثناء اللہ الگ سے پڑھاتے تھے۔ یہ
 پانچوں مہینے ڈیڑھ کے فرق سے اوپر تلے ہی اس مدرسے میں آئے تھے اور جو پہلے سے اس مدرسے میں
 موجود تھے وہ الگ سے انہیں پڑھاتے تھے۔ اگر کبھی انکی طبیعت ماساز ہوتی یا پھر وہ کہیں مصروف ہوتے
 تو مولوی بلال یا مولوی صلاح الدین میں سے کوئی انہیں پڑھا لیتا۔ عمریں بھی ان سب کی اوپر تلے بیس
 سال کے قریب ہی تھیں۔۔۔
 ناشتہ کر کے وہ پانچوں مدرسے آئے تو مولوی صاحب کو اپنا انتظار کرتے پایا۔ وہ بیٹھ گئے تو مولوی
 صاحب نے درس شروع کیا۔

بچے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ
 جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ دو درجوں
 کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان کے بیچ میں ہے۔
 بچے جہاد اسلام کا رکن نہ سہی لیکن بنیادی ارکان کے بعد سب سے ضروری فرض ہے اور پھر آجکل کے
 حالات میں تو ہم سب پر جہاد فرض ہے۔۔۔ میں تیر اور تم کو اس سے جہاد کی بات نہیں کر رہا بلکہ سب سے پہلے
 اپنے نفس سے جہاد کی بات کر رہا ہوں۔۔۔

اب دیکھو جب لفظ جہاد کا مطلب مشقت کرنا ہے تو جہاد دبا نفس کا مطلب ہوا کہ نفس کے ساتھ
 مشقت کرنا۔ زندگی میں جو کام انسان اپنی مرضی سے کرتا ہے وہ مشقت نہیں کہلاتا۔ مشقت تو دراصل وہ
 کام کہلاتا ہے جو انسان اپنی مرضی کے خلاف کرتا ہے۔ جو وہ کرنا نہیں چاہتا اور اسے با دل نا خواستہ
 کرنا پڑھ جائے تو وہ مشقت کہلاتا ہے۔ جیسا کہ بیٹا اگر میں تمہیں کہوں کہ اس مدرسے کے ایسے ہی بے
 مقصد دس چکر لگا لو جو کہ تم کبھی نہیں کرنا چاہو گے اور میں تمہیں مجبور کروں تو میں نے تمہیں مشقت میں
 ڈالا۔

وہ سانس لینے کو رکے اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔
 تو نفس کے خلاف مشقت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کچھ اور چاہتا ہے اور آپ اسے کسی اور کام

پر مجبور کرو۔ اور یہ تو حدیث سے ثابت ہے کہ نفس انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سو آپ کا کوئی دشمن آپ کا بھلا تو نہیں سوچ سکتا۔ بالکل اسی طرح نفس ہمیشہ غلط کام کی طرف راغب کرتا ہے۔ نفس کو تو شیطان سے تشبیہ دی گئی ہے تو پھر شیطان بھی کسی کے ساتھ اچھا کر سکتا ہے بھلا؟؟؟

تو یہ کہ نفس ہمیشہ برائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اسکی مثال بھی بالکل سامنے ہے۔ آپ کسی راستے پر چل رہے ہو اور آپکے سامنے ایک خوبصورت اور نسوانیت سے بھرپور خاتون آتی ہے۔ نفس کہتا ہے اتنا حسن سامنے ہے۔ جی بھر کر دیکھ لو۔ اب نہیں دیکھا تو پھر شاید کبھی دیکھ نہیں پاؤ گے۔ اللہ فرماتا ہے کہ محرم ہے غلطی کی ایک نظر معاف ہے لیکن دوسری نظر حرام ہے۔۔۔ پھر نفس کہتا ہے ارے بھائی دیکھ لو ساری دنیا دیکھ رہی ہے تم دیکھ لو گے تو کیا ہو جائے گا۔ اللہ کہتا ہے کہ ساری دنیا اگر دیکھ رہی ہے تم تب بھی مت دیکھو۔ پھر نفس کہتا ہے کہ دیکھ لو تمہیں کوئی گناہ نہیں ہوگا تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، قصور تو اس خاتون کا ہے جو اس حالت میں سامنے آئی ہے۔ تم گنہگار نہیں ہو بلکہ گنہگار تو وہ ہے جو دعوت گناہ دے رہی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ اس کا گناہ تو الگ ہے۔ اسکی سزا تو میں اسے دوں گا لیکن تم دیکھ کر گناہ مت کرو۔ لیکن پھر نفس کہتا ہے کہ اے نادان انسان آج کل کے معاشرے میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں دیکھ لے۔ نہیں دیکھے گا تو اپنے ساتھ زیادتی کرے گا۔ اتنے حسن کو نظر بھر کر نہیں دیکھو گے تو اپنے ساتھ بہت ظلم کرو گے۔ پیچھے مڑ جاؤ اور دیکھ لو۔ دیکھ لو ساری دنیا دیکھ رہی ہے اگر تم دیکھ لو گے تو کوئی قیامت آجائے گی اور جب وہ خود اسی حالت میں نکلی ہے تو تمہارا کیا قصور؟؟؟ اور ہم اگر گردن موڑ کر دیکھ لیں تو سمجھ جاؤ کہ ادھر ہی نفس جیت گیا اور ہمارا ایمان ہار گیا۔

اب نفس کے خلاف مشقت یعنی جہاد کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کے لیے نفس راغب کر رہا ہے اس سے بچو۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ نفس کہتا ہے کہ دیکھ لو اور اللہ کہتا ہے کہ مت دیکھو۔ اور آپ نے اللہ کے حکم کو مقدم مان کر نفس پر جبر کیا اور نہیں دیکھا تو آپ نے نفس کے خلاف جہاد کیا۔

اللہ کہتا ہے بے حیائی کی طرف مت جاؤ نفس کہتا ہے اے بے وقوف انسان یہ زندگی بس چار دن کی ہے۔ خود کو خوش کرنا تمہارا حق ہے۔ اس چھوٹی سی زندگی میں بھی اگر خوشیاں نہیں ڈھونڈ سکتے تو تم نے زندگی میں کیا ہی کیا۔ اپنے لیے خود خوشیاں ڈھونڈو۔ اور ہم بے حیائی کی چادر اوڑھ کر خود کو خوش کرتے ہیں۔ نفس ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہمیں اللہ کی ماننے سے باز رکھتا ہے اور ہم غلاموں کی طرح اسے ہر حکم پر تسلیم خم کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو بندہ اللہ کی سننے کا اسکی ماننے کا اسکی راہ پر چلے گا، نفس کی حکم عدولی کرے گا تو اس نے واقعی جہاد کیا۔

اچھا تو بچے میں آپ لوگوں کو جہاد کی قسمیں نہیں بتاؤں گا کیوں کہ وہ سب آپ پہلے سے جانتے

ہیں۔۔ جہاد کی قسموں میں فرق نہیں آیا۔ قسمیں آج بھی وہی ہے فرق آیا ہے تو طریقوں میں۔ کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جس طرح جہاد ہوتی تھی آج اس کے طریقے مکمل طور پر تبدیل ہو چکے ہیں۔ پہلے تلوار سے ہوتی تھی اب بندوق اور بم سے ہوتی ہے۔ پہلے مقابلے پر آئے ہوئے کافروں سے ہوتی تھی آج اپنی صفوں میں چھپے ہوئے کافر نماؤں سے نمٹنا سب سے پہلے ہوتا ہے لیکن پہلے بھی اسلام کی سر بلندی کیلئے ہوتا تھا اور آج بھی جہاد کا مقصد یہی ہے چاہے دنیا کے جس کو نے میں بھی ہو رہی ہے مقصد اسلام کا نظام رائج کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا طریقہ ٹھیک نہیں ہے لیکن مقصد ان کا بھی شفاف ہے۔ وہ بھی اسلام کا علم بلند کرنا ہی چاہتے ہیں۔

آج صبح سے ہی اس گھر میں شور تھا۔ رحمت اللہ آج مدرسے جا رہا تھا۔ وہ خوش تھا اور سوائے اسکے سب ہی رنجیدہ تھے۔ جمیلہ تو پچھلے پانچ دنوں سے باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔ اسے تو رحمت اللہ کے دور جانے کے خیال سے ہی ہول اٹھ رہے تھے۔ ظفر اور امان تو ناشتہ کر کے رحمت کو پیار کر کے کام پر چلے گئے کہ یہ گھر کام سے ماند کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اور وحید اور اصغر اسکے جانے کے وقت تک کام سے دیر کر رہے تھے۔ مدرسہ ان کے گاؤں میں نہیں تھا۔ قریب کے گاؤں میں بھی نہیں تھا۔ ویسے تو انکے گاؤں میں بھی مدرسہ تھا لیکن فضل اللہ نے پوچھنا چھ کر کے پتا کروایا اور اپنی تسلی کرنے کے بعد ہی اسے بھیجے کا فیصلہ کیا۔ وہ مدرسے جا کر اساتذہ سے ملا۔ وہاں پڑھنے والے طلباء سے ملا۔ اور اچھی طرح مطمئن ہو کر ہی اسے بھیجے کا ارادہ کیا۔ مدرسے جا کر اور وہاں کے طالب علموں کو دیکھ کر تو اسے لگا کہ یہی ایک واحد جگہ ہے جہاں رحمت اللہ کی اصلاح اور بہترین تعلیم و تربیت ممکن ہے۔ وہ وہاں سے بہت مطمئن ہو کر واپس آیا۔

اس تمام عرصے میں جمیلہ کوشش کرتی رہی کہ فضل اللہ کسی طرح رحمت کو نہ بھیجے پر راضی ہو جائے اور اندر ہی اندر وہ رحمت کو بھی سمجھانے اور نہ جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنی بات سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے پر راضی نہیں تھا اور اس کوشش میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ اصغر اور ظفر بھی اسکے ساتھ تھے۔۔ اور یہ کوششیں گھر کے اندر تھیں۔ گھر سے باہر قاری صاحب اپنی بھرپور کوشش کر رہے تھے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک اپنی بات سے ہٹ جائے۔ لیکن باقی سب کی طرح انکی کوششیں بھی بیکار گئی اور آج وہ ان سب کی کوششوں کے باوجود جا رہا تھا۔

آج وہ خلاف معمول فجر کی نماز کے بعد نہیں سویا تھا۔ وہ خوش تھا یا اداس۔ اس بات کا تو اسے خود بھی نہیں پتا تھا لیکن اسے لیٹ کر بھی نیند نہیں آئی۔ تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں آگیا۔ زینت آگ کے

پاس بیٹھی چائے بنا رہی تھی اور جیلہ اسکے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر جیلہ کی آنکھیں پھر برسنے پر تیار ہوئیں۔ جسے اس نے بڑی بے رحمی سے مسل کر صاف کر لیا۔ وہ لکڑی کے چوکے پر انکے پاس ہی بیٹھ گیا۔ شدید سردی کی وجہ سے فضل اور باقی بچے مسجد سے آکر اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ پہلا پراٹھا بنا تو جیلہ نے چنگیر میں رکھ کر چنگیر اسکے سامنے کر دیا۔ اور چائے کی پیالی بھی بھر کر اس کے ہاتھ میں نکھادی۔ لیکن وہ خاموش تھی شاید ناراض تھی۔۔۔

اماں۔۔۔۔۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

ہمم۔۔۔ مختصر جواب آیا۔

اماں ناراض ہو؟؟؟؟؟ اسنے مسکراتے ہوئے پوچھا

وہ چیہ رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

اماں ابا بھی تو نہیں مان رہے نا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں چلا جاؤں۔ اس نے وضاحت پیش کی۔

تو تو کون سا جاہتا ہے میرے پاس رہنا؟؟ وہ اس دن والی بات ابھی تک بھولی نہیں تھی۔

اماں آپ نے بھی کہا۔ قاری صاحب نے بھی کہا لیکن اب انہیں مان رہے تھے۔

تم بھی تو اپنی اماں کے پاس رہنا نہیں چاہتے مگر تو جاؤ جہاں خوش ہو وہاں رہو۔ وہ بہت اداس تھی۔

اماں میں تو تیرے پاس ہی رہنا چاہتا ہوں۔

رحمتے خاموشی سے ناشتہ کر لے۔ تو اگر میرے پاس رہنا چاہتا تو یہ ساری حرکتیں ہی نہ کرتا جتو نے

کی ہیں اور پھر اگر کی بھی تو معافی مانگ لیتا لیکن تو تو اس دن باب کے سامنے بھی دیدے بھاڑ کر کہہ رہا تھا

کہ قاری صاحب سے نہیں بڑھنا اور مرد سے جانا ہے۔ جیلہ کی آنکھوں میں پھر مانی جھلما ایا۔ ماں تھی

--t

وہ ہر جھکائے بیٹھا رہا اور جلیلہ اپنی آنکھوں کو مسل مسل کر آنسوؤں کو بہنے سے روکتی رہی۔

چند نوا لے اور جائے کی پیالی ختم کر کے وہاں پر نکل آیا۔ سب سے پہلے ایک جھونکے سے اسکا انگ انگ

ٹھٹھرا اٹھا۔ جلدی سے جا کر وہ اپنے بستر میں گھس گیا۔ اگرچہ اسے نیند نہیں آرہی تھی لیکن سردی اتنی تھی کہ

کوئی بستر سے ماہر رونے کا سوچ نہیں سکتا تھا۔

ماشتہ تار ہوا تو فضل اور بچے بھی اٹھ کر باورچی خانے میں آ گئے۔ جملہ اور زینت نے سب کو ناشتہ

دو۔ جلد ۱۔ بھی کسی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ اسکے جانے پر خوش تو کوئی بھی نہیں تھا۔

خاموشی سے ناشتہ کرنے کے بعد نظفہ اور اصغہ اسکے پاس آئے۔ وہ کام پر جا رہے تھے۔ نظفہ تو اس

سے کافی بڑا تھا لیکن اصغر اور رحمت کی عمروں میں زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی دوستی بھی

زیا دہچی۔ ظفر اسے پیار کر کے کمرے سے نکل گیا اور اصغر تو اسے کافی دیر تک۔ گلے لگا کر پیار کرتا رہا۔
 دھوپ نکلی تو اسکے جانے کا وقت آ گیا تھا۔ اسے بدر سے چھوڑ کر فضل کو واپس آ کر دکان پر بھی
 جانا تھا۔ اسکے کچھ پرانے اور دو نئے کپڑوں کے جوڑے جو ظفر کچھ دن پہلے ہی لایا تھا وہ رات کو ہی جیلہ
 نے ایک تھیلے میں ڈال دیے تھے۔ اسکا سامان بس اتنا ہی تھا۔
 چلو۔۔۔۔۔ وہ کپڑے بدل کر آیا تو فضل اپنی سائیکل نکال چکا تھا۔ امان وحید اور زینت نے
 اسے پیار کر کے خدا حافظ کیا۔ جیلہ اب بھی خاموش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے
 تھے۔ وہ اپنی ماں کے گلے لگا تو جانے کتنی دیر سے زبردستی آنکھوں میں رو کے جانے والے آنسو ایک
 برسات کی طرح نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔ اس بار اس نے ان کو روکا بھی نہیں۔
 اب چلو جلدی سے دیر ہو رہی ہے۔ فضل اپنی سائیکل باہر نکال چکا تھا دروازے سے جھانک کر وہ
 بولا۔

اور اسے ماں کے گلے سے ہٹا پڑا۔
 کپڑوں اور جوتوں کا تھیلہ فضل پہلے ہی سائیکل پر باندھ چکا تھا۔
 وہ دونوں سائیکل پر بیٹھ کر تقریباً دو کوس چلے۔ وہاں سے رکشے میں بیٹھ کر تقریباً آدھے گھنٹے کی
 مسافت پر وہ بدر سے پہنچ گئے۔ اسے وہاں داخل کر کے فضل اللہ واپس اپنی دکان پر آ گیا۔
 رات کو سب لوگ کھانے کیلئے بیٹھے تو سب نے ایک خلا محسوس کیا۔ وہ تیرا سال کا بچہ آج انکے بیچ
 میں نہیں تھا۔ کھانا انتہائی خاموشی سے کھایا گیا۔ جیلہ ایک ایک نوالہ اٹھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسکے
 بیٹے نے کھانا کھایا ہوگا کہ نہیں۔ کوئی بھی نوالہ اسکے حلق سے آسانی سے نہیں اتر رہا تھا۔ اور زبردستی وہ
 چند نوالے ہی حلق سے اتار سکی۔ فضل اللہ جانتا تھا اسکی اداسی کو لیکن کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ کھانا خاموشی
 سے کھا لیا گیا۔

رحمت اللہ آج پہلی بار اپنے گھر سے باہر اور اپنی چارپائی کے علاوہ کسی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔
 نیند جیسے اسکی آنکھوں کا راستہ بھول گئی تھی۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں بند کر رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد خود ہی
 اندھیرے سے گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ لیکن اندھیرا تو تھا بند آنکھوں سے بھی اور کھلی آنکھوں سے
 بھی۔ اسے ماں یا داری تھی اور ماں کی یاد آتے ہی اسے اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوتی۔ کتنا روکا تھا اسے
 جیلہ نے، کتنا روئی تھی وہ، کتنا تڑپی تھی۔ لیکن کتنی بے حسی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اماں میں
 جانا چاہتا ہوں۔

آنسوؤں سے پیچھا چڑانے کیلئے اس نے آنکھیں زور سے بند کر دیں لیکن پھر خود ہی دوبارہ گھبرا

کر کھول دی۔ اسے اندھیرے میں اپنے ارد گرد دیکھا تو پانچوں لڑکے آرام سے سو رہے تھے۔ وہ سب کے سب اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں تھے۔ اس کمرے میں پہلے سے پانچ لڑکے تھے اور اس کے آنے سے تعداد چھ ہو گئی تھی۔

وہ آنکھیں بند کرنے سے ڈر رہا تھا۔ مبادا ایک بار پھر وہ اندھیرے سے ڈر جائے۔ وہ آنکھیں کھول لے لیما ہوا تھا نگاہیں چھت پر تھیں۔ اور جانے کتنی دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوئی۔ دوبارہ آنکھ کسی کی آواز سے کھلی جو اسے فجر کی نماز کے لیے اٹھنے کا کہہ رہا تھا۔

ابو جب میں بڑا ہو جاؤنگا اور میرے پاس پیسے آجائیں گے تو ہم سب بھی حج کرنے جائیں گے

وہ ماں بیٹا آج ایک عزیز کی حج سے واپسی پر مبارکباد دینے اس کے گھر گئے تھے۔ اس مبارک جگہ کی باتیں اور تعریفیں سنتے ہوئے شاہدہ یک تک اپنی خالہ زاد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا بھی دل مچل گیا ایک بار سروکائناٹ کی چوکھٹ پر سر جھکانے کا۔ اس کی آنکھوں میں ایک الوہی جذبہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور اپنی ماں کی آنکھوں سے اس کے دل کی خواہش جان جانے والے فیصلہ کیلئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی ماں کی اس خواہش سے انجان ہو۔

اور اب رات کے کھانے کیلئے بیٹھ کر وہ اپنے باپ سے یہی بات کر رہا تھا۔ لیکن احسان نے اس کی بات سن کر صرف ایک مسکراہٹ پر ہی اکتفا کیا۔ جانتا تھا کہ اس کی محدود آمدنی میں ایسا خواب دیکھنا بھی اس دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔

ابو منور چچا بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہاں اگر بندہ ایک بار سجدہ کر لے تو دل کو بہت سکون مل جاتا ہے۔ احسان کی طرف سے جواب مانا پا کر وہ ایک بار پھر بولا۔
بیٹا سکون تو اللہ کی عبادت میں ملتا ہی ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی کی جائیں۔
لیکن ابو وہ تو خانہ کعبہ ہے۔ وہ اپنی بات پر اٹکا رہا۔

ہاں بیٹا وہ خانہ کعبہ ہے۔ یہ تو بالکل صحیح کہا۔ لیکن وہاں جانے کیلئے بہت سارے پیسے چاہیے ہوتے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

لیکن ابابو جب میں بڑا ہو جاؤنگا تو پیسے کما لوں گا۔ پھر تو ہم جا سکیں گے۔ وہ غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر بولا۔

اچھا تو میرا بیٹا بڑا ہو کر کیا بننا چاہتا ہے جو اتنے پیسے آجائیں گے کہ ہم حج پر چلے جائیں۔ وہ یکدم

سے موضوع بدلتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولا۔

ابو آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ آپ چاہتے ہیں کہ میں آرمی ڈاکٹر بنوں۔

تو وہ تو میں کہہ رہا تھا نا۔ میرا بیٹا کیا چاہتا ہے یہ بات اہم ہے۔

تو ابو آپ کو پتا تو ہے کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ وہ محبت سے بھرے لہجے میں بولا۔

شاہدہ مسکراتے ہوئے کھانے کے برتن لگا رہی تھی۔ ساتھ میں ان باپ بیٹے کی گفتگو سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔ کھانا لگا کر اس نے نعمان اور شاہدہ کو بھی بلایا اور سب ایک ساتھ کھانے کیلئے بیٹھ گئے۔

بھئی شاہدہ! تمہارا بیٹا کہہ رہا ہے کہ مجھے اور تمہیں حج پر لے کر جائے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے اسکی طرف دیکھا۔ وہ بھی جواب کے انتظار میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تو ٹھیک کہتا ہے نا۔ ہمارا بیٹا انشاء اللہ اتنا کمائے گا کہ ہم ایک بار حج پر تو ضرور جائیں گے۔ وہ پر عزم لہجے میں بولی۔

ہاں ماما جیسے آج منور چچا اور خالہ خوش تھی تو آپکا کتنا دل کیا کہ کاش آپ بھی کبھی حج پر جائیں۔۔۔ وہ تو عام سے لہجے میں بولا لیکن شاہدہ نے نظریں ایسے جھکا لیں جیسے اسکی کوئی چوری فیصلہ نے پکڑی ہو۔ وہ پتا نہیں کیسے اسکے دل کا حال جان جانا تھا حالانکہ آج تو وہ اسکے قریب نہیں بیٹھا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس نے شاہدہ کی آنکھ سے نکلنے والا وہ آنسو نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی وہ اسکا چہرہ پڑھ لیتا تھا۔

ہاں ابو آپ حج پر چلے جائیں۔ اور امی کو بھی لے جائیں۔ چھوٹا نعمان بولا۔

ہاں تا کہ تمہیں سکول نہ جانا پڑے اور تم سارا دن ادھر ادھر گھومتے رہو۔ احسان ہنستے ہوئے بولا۔

ابو میں سکول جانا تو ہوں روز آج بھی تو گیا تھا۔ اسنے احتجاج کیا۔

ہاں جاتے تو ہو لیکن خود نہیں جاتے مازبردستی بھیجے جاتے ہو۔ اس بار شاہدہ بولی۔

تو امی شاہدہ تو جاتی بھی نہیں ہے میں تو پھر بھی جاتا ہوں۔ وہ جتانے والے انداز میں بولا جس پر بے ساختہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

تو میں تو چھوٹی ہوں نا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ بولتا شاہدہ خود بولی۔

حسن کی بہن کو دیکھا ہے؟ وہ اتنی چھوٹی ہے اور پھر بھی سکول آتی ہے۔ تم تو بہت بڑی ہو اس سے اور ابھی تک سکول نہیں جاتی۔۔۔۔

بھائی میں چھوٹی ہوں؟؟؟ مثلاً ملہ نے اشتیاق بھری نظروں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔
ہاں مثلاً تو تم تو ابھی چھوٹی ہو۔ یہ نعمان ویسے ہی بولتا ہے۔ اسکا بھائی بالکل ویسے ہی بولا جیسا وہ چاہ رہی
تھی۔

اور مثلاً لو نے نعمان کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی قاتح جنگ کے بعد اپنے مفتوح کو دیکھتا ہے۔ جیسے
وہ جیت گئی اور نعمان ہار گیا تھا کیونکہ اسکے بھائی نے جو کہہ دیا کہ وہ چھوٹی ہے۔۔

پچو آج کے درس کی ابتداء حضرت زین العابدینؑ کے الفاظ سے کریں گے وہ فرماتے ہیں کہ۔۔۔
: مجھے اتنی تکلیف کر بلا میں نہیں ہوتی جتنی کوفہ والوں کے خاموش رہنے پر ہوتی۔ کوفہ ایک شہر کا نام
نہیں بلکہ ایک خاموش امت کا نام ہے۔ جہاں بھی ظلم ہوگا اور لوگ خاموش رہیں گے وہ کوفی ہیں؛؛۔
تو کوفی سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو کوفہ میں رہے ہیں یا پھر وہ لوگ جنہوں نے حضرت
امام حسینؑ کو کوفہ بلایا اور پھر دھوکہ دے کر پیچھے ہٹ گئے اور پھر ظلم ہوتا رہا ہر کھتے رہے لیکن وہ خاموش
رہے کیونکہ کوفیوں کے اندر ریزید کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی بلکہ آج ہمارے سمیت ساری
امت مسلمہ کوفیوں میں شمار ہوتی ہے۔ ظلم ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں۔ افسوس کرتے ہیں اور پھر بھول کر اپنے
اپنے روزمرہ میں لگ جاتے ہیں۔ امت کے ایک جسم ہونے اور تکلیف محسوس کرنے کا تصور ختم ہو گیا ہے
۔ یہاں پر آنکھوں کے سامنے قتل ہو جاتا ہے اور ہم آنکھیں بند کر کے اسی خون کے اوپر سے اپنے راستے
پر نکل جاتے ہیں اور پھر ظلم تو کر بلا والوں نے کیا لیکن کوفہ والوں نے کیا کیا؟؟؟
انہوں نے زیادہ ظلم کیا کہ وہ ظلم ہوتے دیکھتے رہے لیکن ظلم کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انسان تو
صرف کوشش کر سکتا ہے نتیجے کی ذمہ داری تو ایک ذات پر ہے۔ تو اگر وہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تعداد میں کم
ہونے کے باوجود بھی کامیابی دے گا تو پھر ہمیں ڈر کس چیز کا ہوتا ہے۔ صرف اپنی موت کا؟؟؟

لیکن ہم یقین اس بات کا بھی رکھتے ہیں کہ زندگی اور موت دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے
لیکن پھر بھی ظالم کا ہاتھ روکنے کو آگے نہیں بڑھتے۔ صرف ایسے کہ ہم اس ظالم کے سامنے خود کو کمزور مان
لیتے ہیں۔ زبان سے اللہ کی طاقت کی باتیں کرتے ہیں اور دل سے ظالم کے سامنے آنے سے ڈرتے
ہیں۔ آخر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں دنیا اور اسکی عارضی آسائشیں اتنی عزیز کیوں ہو گئیں ہیں جبکہ ہم
جانتے ہیں کہ اسکے مقابلے میں ایک دائمی زندگی ہمارے انتظار میں ہے۔۔۔

تو اسکی وجہ ہر انسان کو اپنے دل سے پوچھنی چاہئے کہ آج ہر طرف ظلم کا ایک بازار گرم ہے لیکن ہم
میں سے کوئی نہیں ہے جو اللہ کے نام پر لبیک کہہ کر ظالم کا ہاتھ روکنے کو آگے بڑھ جائے تو پھر ہم کس بنیاد

پر اللہ سے امید کریں کہ وہ ہمیں جنت دے گا جس میں حوریں ہوں گی۔ ہم میں سے تو کسی کو جنت اور حوروں سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے ورنہ کوئی ایک تو ایسا ہوتا جو ظالم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کسی شخص نے ظلم کیا ہے اسکا بدلہ بھی اسے اسی طرح دی جائے جیسے کہ اگر کوئی شخص قتل کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے بھی قتل کر دیا جائے بلکہ اسے سدھارنے اور صحیح رستے پر لانے کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا پھر اگر کوئی شخص چوری کرے تو اسکی چوری کرنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن اسکا بہترین حل یہ ہے کہ اسے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تاکہ ایک تو وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کر سکے اور دوسرا ایسے کام کرنے والوں کو سبق مل جائے اور وہ تائب ہو جائیں۔

تو کوئی کون ہیں؟؟؟؟؟؟

کوئی ہم جیسے سب انسان ہیں جو ظالم کے آگے سینہ سپر نہیں ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ظلم اگر ہو رہا ہے تو ہونے دینا چاہیے کیونکہ ہمارے ساتھ تو نہیں ہو رہا لیکن ہم نہیں جانتے کہ ظلم اپنا راستہ بدلتے ہوئے اتنا وقت نہیں لیتا۔ کہ اگر آج ہمارے سامنے کسی کے ساتھ ہو رہا ہے اور ہم خاموش ہیں تو کل کو اپنا راستہ بدل کر ہمارے ساتھ ہوگا اور باقی لوگ خاموش رہیں گے۔

آپ لوگ سوچ رہے ہونگے کہ میں کس ظلم کی بات کر رہا ہوں۔۔۔

تو آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں۔ چند لمحوں میں ہی جان جائیں گے کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ دیکھ لو۔ سود حرام ہے لیکن آج جو سود کا کاروبار کر رہا ہے وہ خوب مزے کر رہا ہے جو منشیات کا کاروبار کر رہا ہے وہ معزز ہیں۔ دین اسلام کا پرچار کرنے والے کو گالیاں پڑتی ہیں، نوجوانوں کو زبردستی منشیات کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔ بے حیائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عام کی جا رہی ہے قرآن کی تعلیمات کو اٹھایا جا رہا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ کی توہین کر دی جاتی ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ صبر سے کام لیتا چاہئے تو ان سارے حالات کے باوجود ہم سب خاموش ہیں۔ ہم میں سے کوئی نہیں ہے جو جا کر انکا گریبان پکڑ سکے۔ کون ہے جو اس ڈھول کی ٹھاپ پر تھرکتے نوجوانوں کو روکے اس سودی نظام کے خاتمے کیلئے کچھ کرے اس بے حیائی کی روک تھام کیلئے کوئی قدم اٹھائے۔ ہم کہنے کو تو کہتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ کی توہین کرنے والوں کو سزا ملنی چاہیے لیکن عملی قدم کوئی نہیں اٹھاتا۔

ہم دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں لیکن اس دعوے میں ہم کتنے صادق ہیں اسکا اندازہ کر لیں کہ ہمارا رسول ﷺ خوش فرماتا ہے کہ تمہارا ایمان تب تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک میں تمہیں تمہاری ساری دولت اور آل و اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جائوں۔

لیکن ہمارا عمل دیکھیں کہ ہمارے سامنے ہی اسی رسول کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور ہم خاموش رہ کر تماشا دیکھتے ہیں اس لئے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے میں تو ہم حق بجانب ہیں کہ ہم نے آنکھ ایک مسلمان شخص کے گھر میں کھولی ہیں لیکن ہمارے ایمان کی طاقت اور حقیقت کا اندازہ اسی بات سے ہوتا ہے کہ ہم برائی کو کیسے اور کتنا روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں نازبان سے بلکہ اب تو یہ حالت ہے کہ ہم برائی کو دل سے بھی برا نہیں سمجھتے۔ تو مطلب یہ کہ ہم تو ایمان کے آخری اور سب سے کمزور درجے پر بھی فائز نہیں ہیں اور اسلی ایمان تو یہ ہے کہ جب ضرورت ہو تو ہم میں سے ہر ایک برائی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے۔ اپنی اور اپنی آل و اولاد کی پروا کیے بغیر۔۔۔۔۔

ابا میں یہاں نہیں رہنا چاہتا مجھے لے چلیں واپس۔ وہ رورہا تھا۔
لیکن کیوں؟؟؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟؟؟ وہ پریشان ہوا۔

اما مجھے بہت ڈر لگتا ہے رات کو اور مجھے اماں بہت یاد آتی ہے مجھے انکے پاس جانا ہے میں یہاں نہیں رہوں گا۔ وہ بہت رور ہاتھا پیسے جیسے بہت عرصے کے آنسو جمع کیے ہوں اور آج وہ برسات ہی برسا رہا ہو۔

لیکن ہوا کیا ہے رحمۃ؟؟؟ تمہیں تو میں خوش چھوڑ گیا تھا۔۔

ابا مجھے رات کو بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔

اچھا ٹھیک ہے بیٹا لیکن میں تجھے ایسے کیسے لے جا سکتا ہوں۔ تمہارے استاد سے بات کرنی پڑے گی نا۔ لیکن تم تو یہاں پڑھنے آئے ہو نا۔۔۔۔۔

ابا میں قاری صاحب سے پڑھ لوں گا روز جایا کروں گا اور کسی سے لڑائی بھی نہیں کروں گا۔ بس مجھے یہاں نہیں رہنا۔۔

فضل اللہ کی پیشانی پر پریشانی کی لکیریں ظاہر ہو گئیں۔ رحمت کو مدد سے میں چھوڑے ہوئے آج اسے تیسرا دن تھا اور آج وہ جیلہ کے بہت اصرار پر اس سے ملنے آیا تھا۔

جیلہ تو کسی کروٹ سکون نہیں لے رہی تھی جب سے رحمتے گھر سے نکلا تھا اور آج تو وہ صبح صبح سے یہی اصرار کر رہی تھی کہ وہ رحمتے کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسکا بیٹا پریشان ہے لیکن وہ عورت تھی۔ مردوں کے مدرسے میں وہ اسے کیسے لے کر آ سکتا تھا۔ سو وہ اسکی ضد سے مجبور ہو کر خود ہی آ گیا تھا اسکی خیریت معلوم کرنے لیکن یہاں آ کر تو نقشہ ہی اسکو پریشان کر گیا۔

جمیلہ کے خدشات بالکل ٹھیک تھے۔ وہ خوش نہیں تھا۔ جانے نہ مائیں اتنی دور بیٹھ کر بھی اپنی

اولاد کے بارے میں کیسے جان لیتی ہیں۔ شاید ہر ماں اپنے آپ میں ایک ولی ہوتی ہے جسکو اللہ تعالیٰ بتاتا رہتا ہے ننانیوں کے ذریعے۔

رحمتے جو اس دن اپنے باپ کو رخصت کرتے وقت کافی خوش لگ رہا تھا آج جی بھر کر رو رہا تھا۔ جس سے فضل کی اتنی پٹائی بھی یہ نہ کہلو اسکی کہ وہ آئندہ ایسے نہیں کرے گا وہ آج خود کہہ رہا تھا۔ اور یہ کایا صرف تین دن میں پلٹی تھی۔

وہ رحمت کو لے کر قاری شہاب الدین کے پاس گیا جن کے پاس وہ رحمت کو چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ کمرے کے بچوں سچ ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ارد گرد پانچ چھ بچے اونچی آواز میں اپنے اپنے سپارے پڑھ رہے تھے۔۔۔

اس نے قریب جا کر سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنے الفاظ جمع کیے اور بولا۔۔۔
قاری صاحب۔۔۔ میں آج اس سے ملنے آیا ہوں تو یہ بہت رو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں خوش نہیں ہے اگر آپ اسے میرے ساتھ واپس جانے کی اجازت دے دیں تو۔۔۔۔۔
بات ادھوری چھوڑ کر وہ انکی طرف دیکھنے لگا۔

فضل تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا کہ اسکی عمر تیرہ سال سے کچھ ہی زیادہ ہے تو اب تم ہی بتاؤ کہ تیرہ سال کا لڑکا اپنی ماں کو یاد نہیں کرے گا تو کیا کرے گا لیکن اسکا حل یہ تو نہیں ہے کہ تم اسکو یہاں سے لے ہی جاؤ۔

نہیں جناب۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن میں پریشان ہو گیا اسکے رونے سے۔
رویہ ہے تو کیا ہوا؟؟؟ بچہ ہے کچھ دن روئے گا پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے پاس تو بہت سے ایسے لڑکے بھی آئے ہیں جو بیس بیس پچیس پچیس سال کے ہوتے ہیں اور پھر بھی بہت روتے ہیں۔ اصل میں پہلی بار اپنے گھر کو چھوڑنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے فضل لیکن یاد رکھو کہ اللہ انعام اتنا ہی دیتا ہے جتنی آپ نے اسکی راہ میں تکلیف برداشت کی ہو۔ سمجھ رہے ہوں میری بات؟؟؟؟؟ وہ واقعی سمجھ رہا تھا
بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں قاری صاحب۔۔۔

یا پھر تم ایک کام کر لو فضل۔۔۔۔ اتنا ہی بول کر وہ خاموش ہو گئے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ اس نے پر تجسس نظروں سے انکی طرف دیکھا۔

تم کچھ دن بعد اپنے بیٹے سے ملنے آیا کرو۔ ایک مہینے تک۔ اس عرصے میں تم جمعے کے روز اپنے گھر بھی لے جا سکتے ہو۔ اگر اس کے بعد تمہیں لگے کہ وہ خوش نہیں ہے اور نہیں رہ سکتا یہاں تو اس کے بعد بے شک اسے لے جاؤ لیکن میں کہتا ہوں کہ کم سے کم ایک مہینے تک اسے اپنے آپکو منسوب کرنے دو۔

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں قاری صاحب۔ بچہ ہے شاید کچھ دنوں میں ٹھیک ہو ہی جائے۔ وہ قائل ہو گیا تھا۔۔۔

اس دنیا میں رونا تو ہر انسان کو پڑتا ہے فضل۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی پہلے روتا ہے اور کوئی بعد میں۔ کسی کا رونا ختم بھی ہو جاتا ہے اور کسی کو ساری زندگی رونا ہی پڑتا ہے۔ وقت کا فرق ہوتا ہے۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔ میں اسے سمجھتا ہوں۔ سمجھ جائے گا ویسے ہی ضد کر رہا تھا جانے کی۔ میں کچھ دن بعد پھر ملنے آ جاؤں گا۔ وہ اٹھ گیا۔

وہ رحمت کے پاس آیا تو وہ شدت سے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں اتنی طلب و کچھ کراہیک لمحے کو اسکا دل کیا کہ اسے لے جائے اپنے ساتھ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اسکی محلے میں شرارتیں یاد آئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے ساتھ لے کر نہیں جائے گا۔

ابا آپ نے بات کی قاری صاحب سے؟؟؟ اس نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ دیکھو جمتے یہاں پر داخل ہو کر کوئی بندہ اتنی جلدی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ قاری صاحب نے مجھے کہا ہے کہ ایک مہینہ تو گزارنا ہی پڑے گا۔ جھوٹ بولتے ہوئے فضل اللہ عدالت میں کھڑے ایک مجرم کی طرح نظر آنے لگا۔ جو نظریں چا کر اقرار جرم کر رہا ہو۔

لیکن ابا میں نہیں رہنا چاہتا یہاں۔ آپ کہو نا ان سے۔ وہ ایک بار پھر روہانسا ہو گیا۔ بیٹا وہ نہیں جانے دے رہے لیکن انہوں نے مجھے یہ اجازت دی ہے کہ میں تم سے ملنے آ سکتا ہوں کسی بھی وقت اور ایک مہینہ گزار لو جمتے اگر اسکے بعد بھی اچھا نہ لگا تو چلے جائیگے اور میں آتا رہوں گا ان دنوں میں۔ اس نے دانستہ اسکے گھر جا سکنے والی بات نہیں بتائی مبادا وہ اسے صرف جمعے کے دن کیلئے لے کر جائے اور وہ پھر آئے ہی نا تو۔۔۔۔

وہ ایک بار پھر عدالت میں کھڑے مجرم کی طرح نظر آنے لگا۔ وہ رو رہا تھا۔ کوئی بھی بات کیے بغیر اور اسکے آنسو زمین پر گرنے کی بجائے فضل کے دل پر گر رہے تھے لیکن وہ کیا کرنا۔ اسے سمجھا کر اور اپنے دل پر جبر کر کے مدرسے سے نکل آیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ورنہ اسکے آنسو دیکھ کر شاید خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔۔۔ وہ تیز تیز قدموں سے اڑے پر پہنچا۔۔۔

اب اسے گھر جا کر جیلہ کو بھی تسلی دینی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک معصوم بچے کو تو وہ بہلا چکا ہے لیکن جیلہ کو بہلانا اتنا آسان نہیں ہوگا اور رحمت کی اداسی کا وہ اسے کسی قیمت پر نہیں بتا سکتا تھا ورنہ اسی وقت اسکی ضد شروع ہو جائے گی اسے واپس لانے کی سوغاتیں اسی میں تھیں کہ وہ اسے نہ بتاتا۔

گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی جیلہ نیم کے درخت کے نیچے چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شاید اسی

کا انتظار کر رہی تھی۔ اسکی نظریں فضل پر ہی جمی تھیں لیکن وہ اپنے حواس مجتمع کر چکا تھا۔
رحمتے بالکل ٹھیک ہے جیلہ۔ میں مل آیا ہوں اسے۔ اس نے سوچا ہوا جملہ بولا۔
وہ خوش ہے؟؟؟؟؟ اس نے نظریں فضل پر گاڑ کر ایسے لہجے میں پوچھا کہ مجبوراً اسے اپنی
نظریں چرائی پڑی۔ ورنہ وہ واقعی اسکا جھوٹ پکڑ ہی لیتی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔
ہاں خوش ہے لیکن کہہ رہا تھا کہ ابھی اسکے دوست نہیں بنے اسلیے اکیلا تھا اور ہاں اسکا استاد تو اس
سے بہت خوش تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بہت اچھے سے دل لگا کر پڑھتا ہے۔
اس نے جیلہ کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ وہ مطمئن ہوئی یا نہیں یہ تو وہ نہیں
جانتا تھا لیکن اسکے بعد وہ کچھ بولی نہیں اور یہی غنیمت جان کر وہ اپنی سائیکل نکال کر دکان پر چلا گیا۔

قاری صاحب میں کل رحمت سے ملنے گیا تھا اسکے مدرسے۔۔
تو ٹھیک تھا وہ؟؟؟؟
ٹھیک تو تھا لیکن پریشان تھا۔ رور ہا تھا۔ واپس آنا چاہتا تھا۔۔
تو لائے کیوں نہیں اسے؟؟؟؟ انہوں نے پوچھا
کیسے لاتا قاری صاحب؟؟؟؟ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کتنی مجبوری میں اسے بھیجا ہے۔۔
مجھے بھی تو کوئی خوشی نہیں ہے نا اسے دور بھیج کر۔۔۔
تو تمہیں کیا اس بات کا پتا ہے کہ وہاں پر وہ ٹھیک ہو جائے گا؟؟؟؟
دیکھو فضل ہر مجبوری کا حل دوری نہیں ہوتا۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کو فاصلوں کی نہیں محبتوں کی
ضرورت ہوتی ہے اور محبت میں جتنی طاقت ہے وہ سختی میں نہیں ہے۔۔ وہ بچہ ہے ٹھیک ہے
برا کرنا تھا لیکن اسکا حل یہ نہیں تھا۔۔
آگ کو جتنے کم میں ہی بجھا دیا جائے اتنا ہی بہتر رہتا ہے قاری صاحب۔ اس سے پہلے کہ وہ آپکا سب
کچھ جلا دے اس پر پانی ڈال ہی دینا چاہئے۔۔
قاری صاحب نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔۔ بات اس نے بہت گہری کی تھی۔
لیکن پھر بھی میں نے سوچا ہے کہ میں اسے ایک مہینہ تک دیکھوٹکا اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو ٹھیک ورنہ لے
آؤنگا اسے۔ اس نے اطلاع دی
اسے ابھی لے آؤ فضل۔ ابھی لے آؤ اسے۔ وہ آج بھی اپنی بات پر قائم تھے۔ پہلے روز سے ہی
اسکے جانے کے خلاف تھے اور آج بھی تھے۔

لیکن کیوں قاری صاحب؟؟؟ اگر وہ خوش رہتا ہے تو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اچھا ہے ماکہ وہ کچھ پڑھ لے۔

تم پیچھتاؤ گے فضل۔ بہت پیچھتاؤ گے لیکن شاید اس وقت پھر وقت دوبارہ نہیں آئے گا۔ میرا آج بھی وہی مشورہ ہے کہ اسے لے آؤ۔ اگر اتنا ہی شوق ہے مدرسے بھیجے کا تو کچھ سالوں بعد بھیج دینا جب وہ بڑا ہو جائے۔۔

لیکن قاری صاحب تب انکی عادتیں فطرت بن چکی ہوں گی۔ اور جو بدلتی ہیں وہ عادتیں ہوتی ہیں۔ فطرت بھی بھلا کبھی بدلتی ہے؟؟؟

وہ ایک بار پھر قاری صاحب کو چونکا گیا۔۔۔

اچھا دیکھتا ہوں جناب۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ اسے لے آؤں اگر وہ ٹھیک نہ ہو سکا تو۔ چلتا ہوں خدا حافظ۔۔۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کر جانے لگا۔۔۔ قاری صاحب انکی پشت کو دیکھتے رہ گئے۔۔۔

ہارون بھی تو ایسا ہی تھا۔۔۔ وہ بھی تو پہلے کچھ دن مدرسے میں بہت رویا تھا۔۔۔

کاش اب اتم مجھے اس وقت گھر لے آتے۔ قاری صاحب کی مان کر یا میرے آنسوؤں کو دیکھ کر تو آج میں اس حال میں نہ ہوتا۔۔۔۔۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ماضی کی پتھر ملی زمین پر ایک بار پھر ننگے پاؤں چلنے لگا۔۔۔ اسکا ماضی اور حال دونوں ہی ننگے پاؤں خاردار تاروں پر چلنے جیسے تھے۔ وہ ماضی جو اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا آج اسے یاد آ رہا تھا اور وہ حال جس پر کچھ دن پہلے اسے ماز تھا حقیقت کھل جانے کے بعد اسے ایک آگ کا آلاؤ لگنے لگا تھا۔

آدم و حوا کو شیطان نے بھڑکایا۔ انہوں نے مافرمانی کی۔۔۔ تو انہیں بے لباس زمین پر بھیج دیا گیا۔ آج مسلمان اپنی مرضی سے اپنے کپڑے اتار رہے ہیں اور جو پہنتے ہیں وہ بھی نہ پہننے کے برابر ہیں۔ کہیں پر اتنے چھوٹے ہیں کہ آدھے جسم کو بھی نہیں چھپا پاتے اور کہیں پر اتنے پتلے کہ ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔

آدم اور حوا تو ننگے ہو گئے تو اللہ نے زمین پر بھیج دیا۔ اب ابنی آدم اور بنت حوا دوبارہ ننگے ہو رہے ہیں اور اپنی خوشی سے ہو رہے ہیں تو زمین کے نیچے تو کچھ ہے بھی نہیں سوائے موت کے اور پھر

پاتال یا پھر دوزخ۔۔

پہلے زمانے میں جب لوگوں کو اپنے جسموں کو ڈھکنا نہیں آتا تھا تو وہ نگے رہتے تھے پھر ترقی ہوئی اور لوگوں نے اپنے آپ کو ڈھکنا شروع کیا۔ اور ترقی ہوئی تو کام مزید بھی آسان ہوا جب لوگوں نے کپڑے بنانے سیکھ لیے۔ تو قابل غور بات یہ کہ تب ترقی کا معیار یہ تھا کہ جو امیر اور ترقی یافتہ ہوتا تھا وہ اپنے جسم کو ڈھک لیتا تھا اور جو نہیں کر پاتا تھا وہ نگارہتا تھا لیکن آج ہزاروں سال بعد خیالات بالکل الٹے ہو گئے ہیں۔ آج جو امیر اور ترقی یافتہ ہے وہ نگا نہیں تو نیم نگا تو ضرور گھومتا ہے اور جو غریب ہے وہ اپنا جسم ڈھک لیتا ہے۔ امیر کم کپڑے پہنتا ہے غریب زیادہ کپڑے پہنتا ہے۔۔

ہمارے رسول ﷺ نے تو مرد کے لیے بھی حیا والے لباس کو پسند فرمایا ہے تو پھر عورت جس کو سختی سے اپنے آپ کو غیر مردوں سے چھپانے کی تلقین کی گئی ہے وہ اس بے لباسی میں کیسے اللہ کی رحمت کی حقدار ہو سکتی ہے۔۔۔۔

میں ایک بار تبلیغ پر گیا۔ اسی ملک کے کسی علاقے میں۔ وہاں میں نے عورتوں کی ایک جماعت سے دوران تبلیغ کہا کہ آپ پردہ کیا کریں۔ بے پردگی بذاتِ خود ایک بہت بڑا گناہ ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ بہت سے اور بڑے بڑے گناہوں کا تحفہ لاتی ہے تو ایک خاتون بھڑک اٹھی۔ کہتی ہیں مولوی صاحب آپ نے ہمارے کردار کے بارے میں ایسی بات کیوں کی۔ آپ نے بغیر کچھ جانے بوجھے الزام لگایا ہے جب کہ کردار کا پردے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔

میں نے کہا بی بی آپ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہوگی لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کی بیبیوں کو بھی پردے کی تلقین کی ہے۔۔۔ ارشاد ہے کہ۔۔

اے نبی کی بیویوں! کسی نامحرم سے بات نہ کیا کرو اور اگر مجبوری میں کرنی پڑ جائے تو آرام سے نہیں بلکہ سخت آواز میں اور پردے کے پیچھے سے کرو تا کہ اسکے دل میں کوئی غلط خیال جنم نہ لے سکے۔

تو بی بی۔۔ اب جب اللہ نے خود نبی کی بیویوں کو پردے کی تلقین کی ہے تو آپ یہ کہیں گی کیا کہ اللہ نے ان پر الزام لگایا ہے؟؟؟؟ یا پھر اللہ کو نبی کی بیویوں کے کردار پر شک تھا؟؟؟ یا پھر آپ کا کردار حضرت عائشہؓ سے زیادہ منہبوط ہے؟؟؟

لیکن آج تو بات پردے سے بہت آگے چلی گئی ہے۔ مخلوط تعلیمی ادارے بنائے جا رہے ہیں اور پھر ان میں جو حالات ہوتے ہیں وہ کسی باعمل مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے لڑکے اور لڑکیوں کا آزادانہ ملاپ ہوتا ہے۔ نہ عورت کا دل گھبراتا ہے اور نہ مرد کی نگاہ میں حیا دکھائی دیتی ہے اور پھر یہ سب یہاں سے بھی آگے نکل کر آزاد فضاؤں میں بھی ہوتا ہے اور محبتوں کے نام پر پارکوں بازاروں

ہوٹلوں اور چوراہوں پر بے حیائی عام ہے۔ اب جہاں دو جوان انسان ہونگے وہاں انکے ساتھ شیطان تو ضرور آئے گا۔۔۔

اور ہم یہ کہ یہ سب سر عام جاری ہے اور کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ہے جو اسکو روکنے کی کوشش کرے اور کیوں کرے؟؟؟؟؟ یہاں پر تو ہر ایک خود اسی کو پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے۔۔۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والے گروہ میں فحاشی پھیلے۔ وہ دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہیں

النور: ۹۱

اب آخرت میں جس عذاب کے وہ لوگ مستحق ہیں وہ تو اللہ آخرت میں ہی دے گا لیکن وہ دنیا میں بھی عذاب دینے پر قادر ہے۔۔۔

قوم لوط بھی ہماری قوم کی طرح بے حیائی کی لت میں مبتلا تھی۔ وہ لوگ ایسے گناہ کا شکار تھے جسے ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ جنسی تسکین کے لیے عورتوں کی بجائے مردوں کو استعمال کرتے تھے۔ چوریاں ڈکیتیاں عام تھیں اور فحاشی کھلے مجلسوں میں کی جاتی تھی۔ حضرت لوطؑ نے ان غلط کاریوں سے باز آنے کو کہا لیکن وہ ماننے کی بجائے انہی کے دشمن ہو گئے۔۔۔ وہ اپنی گناہوں میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں اللہ کے نبی کی پکار اپنی لذتوں میں مداخلت محسوس ہوئی۔ اور انہوں نے بستی سے نکالنے کی دھمکی دی۔۔۔

پیغمبر تبلیغ کرتے رہے لیکن اپنے خاندان کے چند افراد کے علاوہ کسی کو راہ راست پر نہ لاسکے حتیٰ کہ انکی اپنی بیوی نے بھی ایمان لانے سے انکار کیا۔۔۔

بے حیائی کے اس بازار اور اپنے نبیؑ کی بے عزتی پر اللہ کی شان کو بھی تو غیرت آتی تھی ما۔ آخر وہ کب تک برداشت کرتا کہ جس زمین کو اسنے پاک صاف بنایا اسکو وہ لوگ اپنی حرکتوں سے آلودہ کرتے سو اللہ نے اپنے عذاب کا ذکر قرآن میں کچھ اس طرح کیا ہے۔۔۔۔۔

پھر ہم نے لوط اور اسکے خاندان کو نجات دی۔ سوائے انکی بیوی کے۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔ اور ڈرے ہوئے لوگوں پر بدترین بارش برسائی گئی۔۔۔۔

تو اللہ آج ہم لوگوں پر کیوں عذاب نہیں بھیج رہا۔ انکی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ نے وعدہ کیا تھا کہ انکی امت پر عذاب نہیں آئے گا لیکن عذاب صرف یہ تو نہیں ہے کہ پتھروں کی بارش

ہو جائے۔ عذاب توقط اور خشک سالی بھی ہے۔ عذاب تو سودی نظام بھی ہے جو ایک بار جکڑنے کے بعد قہر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ عذاب تو غربت بھی ہے۔۔۔

ہاں تو اپنے موضوع پر دوبارہ آتے ہیں۔ بات کر رہے تھے فحاشی اور بے حیائی کی جس میں اب ہم اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ پیچھے پلٹنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔۔۔

سر سے چادر کمانے کو اچھا سمجھا جانے لگا۔ چھوٹے اور بے پردہ لباس کو ترقی سمجھا جانے لگا۔ بازاروں میں خواتین کا رش بڑھنے لگا اور اسے آزاد خیالی کہا۔ طلاقیں عام ہو گئی تو اسے زندگی گزارنے کی آزادی کہنے لگے۔ خواتین کو چار دیواری کا تحفظ نہ کرانے اور کام کروانے کو اشتراکی عمل کہا۔ زنا خطرناک حد تک بڑھا تو اسے آزادی نسواں کہنے لگے۔ مادر پدر آزاد ماحول میں پلنے کو آج کے دور کی ضرورت سمجھا۔ تو جناب کیا اسلام آج کے دور کیلئے نہیں بنا؟؟؟؟

سوچ لو کہ جس نامحرم کو آواز سنانا بھی بغیر سخت ضرورت کے جائز نہیں ہے آج بازاروں میں سر عام عورتیں خریداری کرنے آتی ہیں اور مردوں کے ساتھ ہنس کر بھاؤناؤ کر رہی ہوتی ہیں۔ اور مرد کیلئے جس عورت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دوسری نظر ڈالنا حرام ہے آج عورت کو نیم ننگی حالت میں دیکھ کر خوشی ہوتے ہیں۔ لیکن سوچ کی بات یہ ہے کہ ہم ایسے کیوں ہوئے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو باعمل مسلمان کیوں نہیں ہیں۔ ہم اس معاشرے میں اس طرح کیوں رہ رہے ہیں اور اگر رہتے ہیں تو اسکو بہتر کرنے اور بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کم سے کم اپنے حصے کا دیا تو جلا کر جاسکتے ہیں نا۔۔ اللہ فرماتے ہیں۔۔۔

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہو۔ تم نیک باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔۔۔

ال عمران

۱۱۱

اس آیت پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں پر بحیثیت مسلمان فرض کر دیا گیا ہے کہ ہم نیک باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں لیکن اسکے علاوہ ایک اور ہم بات یہ کہ تم وہ امت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہو۔۔۔ مطلب یہ کہ تمہیں بھیجا ہی اسی لیے ہے کہ تم بری باتوں سے روکو اور اگر تم یہ نہیں کرو گے تو تمہارے پیدا کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روکنے سے کیا مراد ہے۔ تو یہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے سمجھ سکتے ہیں۔۔۔ کہ تم میں سے اگر کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ نہیں کر سکتا تو اسے

زبان سے روکنے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اسے دل سے ہی برا سمجھے لیکن یہ ایمان کا سب سے آخری درجہ ہے۔۔

ہاتھ سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے زور بازو سے روکے جیسے نبی ﷺ نے اور صحابہ کرام نے جنگیں لڑی ہیں۔ جیسے محمد بن قاسم برائی کو ختم کرنے میں لگا دیا۔ بالکل اسی طرح اللہ چاہتا ہے کہ ہم اسکی خاطر برائی سے لڑیں۔ اپنے بازوؤں سے۔ پھر کامیابی اور ناکامی کی ذمہ داری اس نے ہم پر نہیں ڈالی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسکا بندہ اسی کی خاطر قدم اٹھائے اور وہ اسکی مدد نہ کرے۔ اسکے جانثار تین سو تیرا تھے تو بدر میں ہزاروں کے مقابلے میں فاتح تھے۔ آج کروڑوں ہیں اور محکوم ہیں۔۔۔ کیوں؟؟؟؟

اسیے کہ آج اللہ کی خاطر سرکنوانے کا شوق نہیں رہا۔ دنیا کی عارضی خوشیاں اہم ہو گئی اور آخرت کی دائمی خوشیوں کی لالچ نہیں ہے۔ آج فرشتے مدد کو کیوں نہیں آتے اگر آج بھی وہ فضا بنے گی۔۔۔
ع فضا بنے بد پر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو۔۔۔

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی۔۔۔
آج اس ملک کے کونے کونے پر ہر دو قدم میں فلموں کے بے حیائی اور فحاشی سے بھرپور پوسٹرز لگے ہیں۔ ہمارے ارباب اختیار اور عوام تو اب لگتا ہے کہ بے حس ہو چکے ہیں جو اس کھلی بے حیائی پر خاموش تماشائی بنی ہے لیکن ساتھ میں علماء بھی اندھے ہو چکے ہیں جنہیں یہ سب نظر نہیں آتا۔۔۔
فیصلہ اب ہم سب کو کرنا ہے کہ ہم اس بے حیائی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں یا خاموش رہ کر اللہ کے عذاب کا انتظار کرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ فحاشی کا اثر آپ اور ہم سب کے گھروں پر بھی ہوگا۔ یہ ہوتی نہیں سکتا کہ معاشرے میں بے حیائی عام ہو اور آپ محفوظ رہیں۔۔۔

صبا۔۔ تمہیں کوئی جا دو ٹو نہ آتا ہے؟؟؟

کیا مطلب؟؟؟

مطلب یہ کہ تمہیں کوئی جا دو وغیرہ آتا ہے جس سے کسی کو اپنے قابو میں کیا جاسکے۔؟؟
نہیں تو۔ میں آپ کو کوئی جا دو گرنی لگتی ہوں کیا؟؟؟ وہ آئینے کے سامنے بال بنا رہی تھی۔۔
دیکھنے میں تو نہیں لگتی لیکن کام سے لگتا ہے کہ کوئی منتر آتا ہے تمہیں جس سے سامنے والا سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ نظریں اسکے شانوں سے نیچے تک آتے ہوئے بالوں پر گناڑتے ہوئے بولا۔
میں نے ایسا کیا کیا ہے؟؟؟ کس کو سحر زدہ کیا ہے میں نے؟؟؟؟؟؟ اسکا منہ بن گیا۔

امی کو ابو کو کامران کو اور سب سے زیادہ تو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اس مایوس کو خردہ کر دیا ہے۔ کسی کو اس گھر میں صبا بی بی کے علاوہ کوئی اور نہیں دکھتا۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ لیکن وہ انکی بات پر کھل کر ہنسی۔

تو آپ جیلز ہو رہے ہیں؟؟؟؟
نہیں میں کیسے جیلز ہو سکتا ہوں۔ جس شکاری کا شکار میں خود بھی ہوں اس سے جیلز کیسے ہونگا۔۔۔

وہ اپنے بال سنجال کر بستر کے دوسری طرف آ کر بیٹھ گئی۔ اور تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے سونے کی تیاری کرنے لگی۔۔۔

ہاں ارسل مجھے منتر آتا ہے۔ اور ایک نہیں بہت سے منتر آتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی جادو کا نہیں ہے۔۔۔ وہ سب محبت کے منتر ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ محبت کے منتر زیادہ طاقتور ہوتے ہیں جادو کے منٹروں سے۔۔۔

محبت تو میں بھی کرتا ہوں سب سے۔۔۔ وہ پھر تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔
تو آپ کو کس نے کہا کہ آپ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ آپ کرتے ہیں تو سب آپ سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔۔۔

تم بھی؟؟؟؟ وہ انکی طرف جھکتے ہوئے بولا۔۔۔
میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ وہ اپنے جملے کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔
تو تم نے کہا کہ سب مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ سب میں تم نہیں آتی کیا؟؟؟؟ وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والوں میں نہیں تھا۔

اپنی بات نہیں کی میں نے۔ امی ابو کی بات کی ہے۔۔۔ وہ شرماتے ہوئے بولی لیکن اپنے بہانے کے بھونڈے ہونے کا احساس اسے بہت پہلے ہو چکا تھا۔۔۔

وہ ایک زوردار قبیلے کے ساتھ ہنسا۔ اور وہ ہر جھکائے مسکراتے ہوئے اسکا ساتھ نبھارہی تھی۔۔۔
ویسے صبا ایک بات تو بالکل سچ ہے کہ شا دی سے پہلے میں اچھا خاصا کام کا آدمی تھا۔ کام بھی کرتا تھا، دوستوں کو بھی وقت دیتا تھا، کبھی کبھی لیتا تھا لیکن شا دی کے بعد تو صرف گھر کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ آفس کا کام بھی مشکل سے کرتا ہوں۔ وہ مصنوعی اداس لہجے میں آہ بھرتے ہوئے بولا۔

تو میں نے تو آپ سے نہیں کہا کہ آپ سب کچھ چھوڑ دیں۔ دوست چھوڑ دیں، کھیلنا چھوڑ دیں۔ وہ بھی خفا ہو گئی۔

تو میرا خود دل نہیں کرتا تا تم نے تو نہیں کہا لیکن مجھے پتا ہے کہ میں آفس میں کتنی بار گھڑی دیکھتا ہوں صرف اس لیے کہ جلدی سے وقت گزر جائے اور میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ شاہ دی نے ارسل نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔۔ وہ شعر کی تذلیل پر غالب کی بددعا میں سمیٹتا ہوا بولا۔۔۔

صبا خوب ہنسی۔۔۔

ارسل شعر غلط پڑھا ہے آپ نے۔۔ غالب نے شادی نہیں عشق بولا تھا۔۔
تو وہ غالب نے بولا تھا۔۔ یہ تو استاد ارسلان اللہ خان نے کہا ہے۔ بس اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔۔

وہ ہنسی اس انوکھی منطق پر۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے سے ہی دیکھ رہا تھا۔۔ اچانک وہ سنجیدہ ہوا۔۔
صبا تم جانتی ہو کہ تم میری زندگی میں کیا حیثیت رکھتی ہو؟؟؟؟؟؟؟
وہ نگاہیں اٹھا کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔ نظریں ہی سوال تھا۔
صبا اگر آج میں تمہارے بغیر اپنی زندگی تصور کروں تو میرے پاس کوئی مسکراہٹ نہیں ہوگی۔ میں
سانس تو لوں گا لیکن جی نہیں پاؤں گا۔ مجھے خند تو آئے گی لیکن تمہارے نہ اٹھانے کے ڈر سے شاید میں سو نہیں
پاؤں۔ میں کام کرتے ہوئے چائے تو پیوں گا لیکن ذائقہ مجھے محسوس نہیں ہوگا۔ میں بانیک تو چلاؤں گا لیکن
شاید کسی ایکسڈنٹ میں مر ہی جاؤں گا اور-----

بس کریں ارسل۔ یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مرنے کی بات کیوں منہ سے نکالتے ہیں۔۔۔
وہ جو پہلے انکی باتوں پر خوشی سے نہال ہو رہی تھی یکدم لفظ 'مر جاؤ' نگا پر تڑپ کر بولی۔۔۔
تو تم یہ حیثیت رکھتی ہو میری زندگی میں۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔
وہ خاموش رہی۔ اسکا محبت بھرا لہجہ اسے سرشار کر رہا تھا۔۔۔
اچھا چلو سو جاتے ہیں اب۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔ وہ لیٹتے ہوئے بولا۔ وہ بھی سونے کیلئے لیٹ گئی۔۔۔

صبا میں نے تمہیں بتایا ہے؟؟؟؟؟
کیا؟؟؟؟؟ وہ حیران ہوئی۔۔۔

کہ اگر تم نہیں ہوتی تو میں کسی دامن کی عورت کو بانیٹ پر بھی نہیں بٹھاتا۔۔۔

ارسل۔۔۔۔۔ اس کا دل کیا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ وہ تنگ کر رہا تھا۔۔۔

لیکن وہ تو اپنی بات مکمل کر کے کروٹ لے بھی چکا تھا۔۔۔

ایک گہری مسکراہٹ صبا کے ہنڈوں پر پھیل گئی۔۔۔

رحمت تم اداس کیوں رہتے ہو؟ کسی سے بات بھی نہیں کرتے اور الگ الگ سے رہتے ہو۔۔۔

وہ خاموش رہا۔ آج کل ایسے ہی چپ چاپ سا رہتا تھا۔

میں تم سے کہہ رہا ہوں رحمت۔۔

ہاں سن رہا ہوں۔ میں تو الگ نہیں رہتا۔۔

اچھا چلو اگر الگ نہیں رہتے تو اب چلو میرے ساتھ باہر۔ سب لڑکے چلے گئے ہیں۔ کھیل کود رہے

ہیں۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔۔۔

نہیں میں نہیں جا رہا۔۔

چلو مایا ر۔۔ جلدی کرو۔ پھر واپس آ کر مغرب بھی پڑھنی ہے۔ چلو چلو جلدی کرو۔ جلدی سے

جوتے پہنو۔۔۔

وہ اسے زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ مدرسے کے پیچھے بنے ہوئے ایک چھوٹے میدان میں لے

گیا۔ وہاں اور بھی بہت سے مختلف عمروں کے بچے تھے جو اسی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ وہ سارے

مختلف کھیلوں میں مشغول تھے۔ رحمت جا کر میدان کے کونے میں پڑی ہوئی ایک اینٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ

سب کو کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اے رحمت اٹھ جاؤ۔۔ آ جاؤ کھیلتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ثاقب پھر اسکے پاس آیا اور

اسے زبردستی اپنے ساتھ اٹھا کر لے گیا اور اسکے بہت منع کرنے کے باوجود بھی اسے اپنے ساتھ کھیل میں

مثال کر لیا۔۔

شام ہوئی تو سب لڑکوں کے ساتھ وہ بھی میدان سے لوٹ آیا۔ مغرب کی نماز پڑھی اور کھانے کیلئے

چلا گیا۔ وہ خوش تو نہیں ہوا تھا لیکن اسکی اداسی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ بچہ ہی تو تھا۔ کھیل کود کر خوش ہو گیا تھا۔۔

یہ اسے کبھی پتا نہیں چلا کہ اس دن فضل اللہ کے رخصت ہونے کے بعد مولوی صاحب نے ثاقب

کو بلایا اور اسکی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کسی بھی طرح سے رحمت کو اداس نہ ہونے دے۔ اسی لیے وہ زبردستی

اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور باقی سارے کاموں میں بھی اسے اپنے ساتھ مثال کرتا تھا۔ عمر کے لحاظ سے

وہ رحمت سے بڑا تھا لیکن اپنی فطرت کے مطابق وہ بہت جلدی رحمت کا دوست بن گیا۔

ایک ہفتے بعد فضل اس سے ملنے آیا تو اسے نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ اگرچہ چپ چاپ وہ اب بھی

تھا لیکن آنسو جو پچھلی دفعہ اسکی آنکھوں سے ندی کی طرح بہہ رہے تھے انکا اس بار نام و نشان بھی نہیں

تھا۔

فضل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ وہ خوش تو نہیں تھا لیکن ایک ہفتے بعد اگر وہ ناخوش نہیں تھا تو یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔۔۔ وہ اس سے مل کر واپس گھر آ گیا۔۔۔

اگلے ہفتے پھر گیا تو اس بار اصغر کو بھی اپنے ساتھ لے کر گیا۔ اس بار بھی وہ مطمئن ہو کر لوٹا۔ وہ ادا اس نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مولوی شہاب الدین سے بھی ملا۔ لیکن انہوں نے فضل کی خلاف توقع اسکی کوئی شکایت نہیں کی بلکہ اسکے رویے اور ذہانت کی تعریف کی۔۔

اگلے جہتے وہ اس سے ملنے گیا۔ آج اسکا ایک مہینہ پورا ہونے والا تھا اور حسب وعدہ فضل کو آج اس سے پوچھنا تھا کہ وہ خوش ہے یا ناخوش؟ دوسرے لفظوں میں وہ یہاں رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟؟؟؟ وہ اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ آیا۔۔۔

کیسے ہوا بابا؟؟ اماں کیسی ہے؟؟ سلام کرنے کے بعد وہ پوچھا۔

میں ٹھیک ہوں بیٹا۔ تیری اماں بھی ٹھیک ہے۔ تو کیسا ہے؟؟؟

میں ہلکل ٹھیک ہوں ابا۔۔

ابا اب میں ٹھیک ہوں اور خوش بھی ہوں۔ آپ دکان چھوڑ کر ہفتے مت آیا کریں۔۔

فضل جس سوال کے پوچھنے پر تجھک رہا تھا وہ اس نے بہت آرام سے جواب دے دیا۔۔

تو تم گھرواپس نہیں جانا چاہتے؟؟؟؟؟ اے ایک بار پھر پوچھا۔

نہیں اباب میں خوش ہوں۔۔ دوست بھی بن گئے ہیں میرے بہت سارے۔۔ وہ مطمئن لہجے

میں یوں۔

اچھا چلو یہ تو اچھی بات ہے کہ تو خوش ہے۔۔ لیکن آج تجھے گھر لے جانا ہوں۔ تیری اماں بہت
یا د کرتی ہے تجھے۔۔۔ پرسوں صبح چھوڑ جاؤنگا تجھے یہیں۔۔۔

لیکن ابا ابھی تو میں ٹھیک ہوا ہوں۔ پھر گھر جاؤں گا اور واپس آ کر پھر خفا رہوں گا۔۔

تو کیا تو گھر کبھی جائے گا ہی نہیں؟؟ وہ متفکر ہوا

نہیں ابا جاؤنگا لیکن آج نہیں۔۔

پھر۔۔۔۔۔ وہ یہ نشان تھا

ایسا کرتے ہیں اب کہ آپ جب اٹھیں بار آؤ گے تو میں آپ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ تب تک میں

استنا ہو جاؤ گا کہ واپس آ کر روؤ گا نہیں۔۔

فضل نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ کافی بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔

ٹھیک سے جیسا جو تیری مرضی۔ یہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں تیری ماں نے دی تھی یہ لے لے۔ فضل نے

پاس پڑی ہوئی گھٹری کی طرف اٹھا رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھا۔ اور گھٹری میں سے چیزیں نکال کر چادر اپنے باپ کو پکڑا دی۔

اور اسے پیار کر کے فضل رخصت ہو گیا۔

اسلام ہمارا دین ہے، ہمارا مذہب ہے، ہماری زندگیوں کا مقصد ہے۔ اسلام اس دنیا میں مغلوب اور کمزور رہنے کیلئے نہیں آیا بلکہ اسلام کی آمد کا اہم مقصد غلبہ ہے۔ اللہ خود اپنی کتاب میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہ دین سب ادیان پر غالب آئے گا۔ اسلام کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ کوکلی کوچوں کے علماء غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلام جہاد کے بغیر پھیلا ہے لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ اسلام صرف اخلاق کے زور سے پھیلا ہے جبکہ انکی لاعلمی یا نظر پوشی تو دیکھ لیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث انہیں بھول گئی ہے جس میں نبی خود اپنا اخلاق اپنی تلوار کو قرار دیتے ہیں۔ آج دنیا کو یہ تو بتایا جا رہا ہے کہ اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا ہے لیکن یہ نہیں بتایا جا رہا کہ اخلاق کیا ہے؟؟ اب جب اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اسلام نے غالب آنا ہے تو اس کا واحد اور ضروری حل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار نبوی کا بہت کلیدی کردار ہے۔ انکی اور مدنی ادوار کا مشاہدہ اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ملتی تھی تب تک مسلمانوں کی تعداد محض سینکڑوں میں تھی لیکن جب جہاد کی اجازت ملی تو دنیا نے دیکھا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کے تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی تھی۔

لیکن مولوی صاحب۔۔ اسلام میں تو جبر کی اجازت نہیں ہے نا؟؟؟؟

ہاں اسلام میں جبر کی اجازت نہیں ہے لیکن تب تک جب تک کوئی اسلام کے دائرے سے باہر ہو۔ مطلب یہ کہ جب تک اس نے اسلام قبول نہ کیا ہو تب تک اس پر کوئی جبر نہیں ہے اسلام قبول کرنے کیلئے یعنی کہ آپ اسے اسلام قبول کرنے کیلئے مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن جس وقت کسی نے زبان سے لا الہ پڑھا اسی وقت اس پر جبر شروع ہو گیا۔ مطلب یہ کہ اب اس نے ہر حال میں اسلام کے متعین حدود میں ہی رہنا ہے۔۔۔

آپ لوگوں نے کبھی وہ حدیث سنی ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز سکھا دو اور پڑھنے کی ترغیب دو اور جب آٹھ سال کا ہو جائے تو اسے زبردستی پڑھاؤ۔ مار کر پڑھانے کی اجازت بھی ہے۔

یا آپ نے کبھی سنا ہوگا کہ اگر کوئی عورت اپنی حدود میں نہیں رہتی تو شوہر کو چاہئے کہ اسے سمجھائے
بجھائے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کے ساتھ ہلکی مار بھی کر سکتا ہے۔

تو ان سے اور ان جیسی کئی اور باتوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں جبر کی اجازت تب تک
نہیں ہے جب تک کوئی مسلمان نہیں بن جاتا۔ جب وہ مسلمان ہوتا ہے یا مسلمان ہو جاتا ہے تو اس سے
زبردستی وہ سب کام کروانے چاہیے جو ایک مسلمان کا فرض ہے اگر تو وہ نہیں کرتا تو۔۔

جہاد سے کس مسلمان کو محبت نہیں ہے؟ ہر مسلمان چاہتا ہے کہ اسلام کا دنیا میں غلبہ ہو۔ اس
مقصد کیلئے بہت ساری جہادی تنظیمیں بنی۔ سب کا مقصد اسلام کا غلبہ ہی ہوتا تھا لیکن چونکہ وہ کچھ خاص
لوگوں کی بنائی ہوئی تھی تو باقی لوگ انکی مدد نہیں کرتے تھے۔ نتیجے کے طور پر وہ کچھ عرصہ چل
کر خود بخود ختم ہو جاتی تھی۔

اس سب کا بہترین حل یہ ہے کہ ۷۵ ممالک کی فوج کو ملا کر ایک مشترکہ فوج تشکیل دی جائے۔ ان
سب ممالک کی مشترکہ فوج ستر لاکھ بنتی ہے۔ اتنی بڑی فوج تو پوری دنیا کو فتح کرنے کیلئے بھی کافی سے
زیادہ ہے۔ لیکن یہ ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ اغیار کی سازشوں سے ان ملکوں پر ایسے حکمران مسلط ہیں
جنہیں اسلام کی سر بلندی سے زیادہ اپنے مفادات اور اغیار کی خوشی سے غرض ہے۔۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ سب لوگ اپنی خدمات حکومت اسلامی کے سپرد کر دیں۔ پھر حکومت جن لوگوں
کو چاہے قتال کیلئے منتخب کر لے اور جن کو چاہے کوئی اور ذمہ داری دے دے لیکن یہاں پر جیسے کہ عرض
کیا گیا ہے کہ حکمران اپنے مفادات کا حصول چاہتے ہیں سو جو لوگ چاہتے ہیں وہ جس شکل میں بھی چاہیں
بذات خود جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں اور جہاد کی یہ شکل دائمی اورابدی ہے۔

جیسا کہ ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔۔۔

تین چیزیں ایمان کی جڑ ہیں۔ پہلی اس شخص سے ہاتھ اٹھا لیا جولا الہ کا اقرار کرے۔ دوسرا جہاد
ہے۔ یہ جاری ہے جب سے اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے اور ازل تک چلے گا۔ حتیٰ کہ میری امت کا آخری
بندہ دجال سے لڑے گا۔ اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل منسوخ نہیں کر سکتا۔۔ تیسری چیز
اقتدار پر ایمان ہے۔

اب اس حدیث پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی یہ
بتا دیا تھا کہ جہاد ابد تک جاری رہے گا۔ اسے کوئی ظالم حکمران نہیں روک سکتا چاہے کوئی کتنی بھی کوشش کر
لے۔ اور اس حدیث میں جہاد سے مراد نفس سے جہاد نہیں ہے بلکہ اپنے دین کی سر بلندی کیلئے بے دین
افراد سے جہاد ہے۔۔

اب جہاد میں کس طرح کرنا ہے یہ بتانا تو بعد میں ہوگا لیکن سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ آج کل کے حالات میں جہاد کس سے کرنا ضروری ہے اور کیوں ضروری ہے۔۔

تو سب سے پہلے آتے ہیں ان میں وہ سب لوگ جو نام کے تو مسلمان ہیں لیکن اپنی زندگی کو کافروں کی طرح گزار رہے ہیں۔ اور ان کا یہ رویہ کسی لاعلمی کے سبب نہیں بلکہ انکی اپنی پسند سے اختیار کر رہے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کافرانہ روش پر گزار رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرف راغب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔۔

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لے آئے لیکن دراصل یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔

اور پھر آگے فرماتا ہے کہ۔۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار وہی فساد ہی ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

تو بچوں اس آیت پر غور کرو تو صاف پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے یہودی جو نام کو ایمان لے آئے تھے اور پیٹھ پیچھے اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور آج کل کے برائے نام مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ بھی اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے تھے اور آج بھی سب اللہ کو دھوکہ دینے کے درپے ہیں۔ انکو بھی لگتا تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اب وہ جو چاہیں کرتے رہیں اللہ ان سے باز پرس نہیں کرے گا اور آج بھی سب کو یہی لگتا ہے؟؟؟ لیکن وہ ذات جو شہ رگ سے بھی قریب ہے انسانوں کے کیسے دھوکے میں آسکتی ہے؟؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے تھے۔ ان کے دلوں میں نفاق تھا اور پھر اللہ نے انکے منافقت اور جھوٹ میں اور بڑھا دیا اور ایک دردناک عذاب کی نوید بھی سنا دی۔

اور دوسری بات یہ کہ یہی لوگ خود بھی گمراہ تھے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ جیسے کہ آج کل کے یہ برائے نام مسلمان خود تو گمراہی کے رستے پر چل ہی رہے ہیں ساتھ میں دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے پھرتے ہیں۔ جیسا کہ آج جو سود کھا کر گناہ کمارہا ہے وہ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتا ہے کہ اس سے مال میں اضافہ ممکن ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی کوئی بھی حرام اور حلال میں فرق کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ زنا اور بے حیائی عام ہے لیکن کوئی بھی اسے روکنا تو دور برا سمجھنے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ اور اللہ ان سب سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ ہمیں پہلے ہی بتا چکا ہے کہ اگر ان لوگوں سے کہو گے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو یہ لوگ الٹا الزام دیتے ہیں کہ فساد تو تم لوگ پھیلاتے ہو ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔۔

جیسا کہ اوپر کی آیت میں فرمایا کہ ایسے لوگ مومن نہیں ہیں۔ سو ایسے لوگوں کو ہم مسلمان نہیں سمجھ سکتے جن کو اللہ نے اپنی امت میں شامل نہ کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ اسی لیے کہ یہ لوگ دل سے مسلمان نہیں ہیں۔۔۔

بھلا اللہ کے احکامات کے خلاف جانے والے بھی اصلاح کرنے والے ہو سکتے ہیں؟؟؟
کبھی بھی نہیں۔۔۔ کیوں کہ اسلام اصلاح کرنے والا دین ہے اور جو لوگ اللہ کے ساتھ دھوکہ کرنے والے ہیں وہ بھلا کیسے اصلاح کر سکتے ہیں۔

اب اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور آیت پڑھتے ہیں۔ جس میں اللہ فرماتا ہے کہ۔۔۔
بے شک کافروں کے لیے برابر ہے کہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور انہیں بڑا عذاب ہوگا۔

اب اس آیت میں مراد وہی منافق لوگ ہیں جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں دل سے اللہ اور رسولوں سے دھوکہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تو اللہ فرماتا ہے کہ اگر آپ انہیں ڈراؤ گے تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ یہ اپنی گمراہی میں بہت بڑھ چکے ہیں۔ اور اللہ نے ان کی دلوں کی سختی کو اور بڑھا دیا ہے۔ انکو اچھے برے کی سمجھ نہیں آتی۔ ایسے لوگوں کو آپ جتنی بھی تبلیغ کرو گے وہ سیدھے راستے پر نہیں آئیں گے۔ کیونکہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔۔۔

تو ایسے لوگوں کے ساتھ رسول ﷺ نے کیا کیا مولوی صاحب؟؟ حیدر نے پوچھا۔
انہوں نے جہاد کیا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کیا انہوں نے۔ کیونکہ اللہ نے انکو ان آیات میں بتا دیا تھا کہ آپ چاہیں جتنی بھی کوشش کر لیں ان لوگوں کے دل نہیں پھیر سکتے۔ اور یہ لوگ فساد پھیلاتے رہیں گے۔ سو ایسے لوگوں کو تبلیغ کرنے سے بہتر ہے کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے۔۔۔

چلو بیٹا آج تو گھر چلو میرے ساتھ۔۔۔ تیری اماں بہت یاد کرتی ہے تجھے اور آج تو میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ تجھے لے کر آؤں گا۔۔۔

ٹھیک ہے ابا۔۔۔ میں مولوی صاحب کو بتا کر آتا ہوں۔ وہ چلا گیا
فضل اللہ دو ہفتے بعد آیا تھا۔ آج تو صبح جیلہ کو بتایا کہ وہ رحمت کو ملنے جا رہا ہے تو اس نے تو ضد ہی پکڑ لی کہ وہ رحمت کو اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اسی لیے اس نے رحمت سے ملتے ہی اسے ساتھ جانے کو کہا۔ بغیر کوئی دوسری بات کیے۔

وہ واپس آیا تو پکڑے ہڈ لے اور اس کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ فضل اسے لے کر سیدھا گھر کیلئے

روا نہ ہو گیا۔

گھر پہنچا تو جیلہ کو اپنا انتظار کرتے ہوئے ہی پایا۔ وہ جانتا تھا کہ آج جب اسے رحمت کو لے کر آنا ہے تو وہ صبح سے انہی کا انتظار کر رہی ہوگی۔۔۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے جیلہ دوڑ کر انکے پاس آئی اور رحمت کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔ اسکی آنکھوں کی نمی فضل سے چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ بھی اپنی ماں سے ایسے ملا جیسے صدیوں بعد ملا ہو۔ اور جیلہ کا تو وہ حال تھا جو ہر ماں جانتی ہے جسکا بیٹا زندگی میں پہلی بار اس سے ڈیڑھ مہینہ دور رہا ہو۔

فضل اپنی سائیکل لے کر دکان پر چلا گیا۔ گھر پر صرف زینت اور وہ ماں بیٹا رہ گئے۔ اسکی آمد کا سن کر زینت بھی باورچی خانے سے نکل آئی۔ وہ رحمت کو بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ وہ تینوں جا کر اسی نیم کے درخت کے نیچے چار پائی پر بیٹھ گئے۔ زینت تو ہانڈی دیکھنے چلی گئی کیونکہ آج اس گھر میں اوقات کے مطابق اچھا کھانا بننا تھا۔۔۔

رحمتے تو کھاتا تو ہے ماں ہاں؟؟؟ کھانا ملتا ہے تجھے؟؟ مجھے تو لگتا ہے کہ تو کھاتا ہی نہیں ہے دیکھو تو کتنا سامنے نکل آیا ہے۔۔۔ جیلہ ہر ماں کی طرح فکر مند ہوئی۔

ہاں اماں ملتا ہے اور میں تو پیٹ بھر کر کھاتا ہوں۔۔۔

تو تو اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے؟؟؟

اماں میں ٹھیک ہوں اور بالکل ٹھیک سے کھانا کھاتا ہوں۔۔۔

اور پھر کتنی دیر تک وہ ماں بیٹا باتیں کرتے رہے۔ اتنی کہ کھانا بن گیا اور ان تینوں نے اسی درخت کے نیچے کھا بھی لیا۔ کھانے کے دوران بھی وہ باتیں کرتے رہے۔ جیلہ کی حالت تو کوئی بھی دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ اسکا بیٹا سالوں بعد لوٹ کر آیا ہے۔

عصر کی نماز پڑھنے گیا تو قاری ادریس سے بھی ملا۔ وہ بہت تپاک سے ملے۔۔۔

ارے رحمت بیٹا کیسے ہو؟؟؟ کب آئے ہو؟ نماز سے فارغ ہو کر وہ جیسے ہی انکے پاس گیا تو وہ

حیران ہوتے ہوئے بولے۔

قاری صاحب آج ہی ابا کے ساتھ آیا ہوں۔۔۔

واپس جانا ہے؟؟؟ انہوں نے پوچھا

جی قاری صاحب پر سوں ابا کے ساتھ جاؤں گا۔

خوش ہو وہاں رحمت اللہ؟؟؟ انکی آنکھوں میں کچھ عجیب قسم کا سوال تھا۔

جی خوش ہوں۔ پہلے اداس تھا لیکن اب تو ٹھیک ہوں۔۔۔

سبق پڑھتے ہو؟

جی۔ جواب مختصر تھا۔

کون پڑھاتا ہے؟؟؟ وہ جانے کیا پوچھنا چاہ رہے

مولوی شہاب الدین۔۔

ہم۔ انہوں نے لمبی سانس لی۔۔

رحمت بیٹا میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ واپس آ جاؤ مت رہو وہاں پر۔ اگرچہ یہ بات میں پہلے تم سے اور تمہارے والد کو کہہ چکا تھا لیکن تم دونوں نے نہیں مانی اور آج پھر کہہ رہا ہوں۔۔

لیکن کیوں قاری صاحب؟؟؟ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟؟ وہ حیران ہوا۔ آخر قاری صاحب بروقت اسے منع کیوں کرتے ہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے مدرسے میں پڑھنے میں۔

اسکی ایک وجہ ہے رحمت جو میں تمہیں منع کرتا ہوں لیکن بتا نہیں سکتا۔ تم بچے ہو ابھی۔ انہوں نے مبہم سی بات کی۔

لیکن اب میں سبق شروع کر چکا ہوں اب چھوڑو نہیں سکتا۔ وہ اب بھی اپنے اسی ارادے پر قائم تھا جو آج سے ڈیڑھ مہینے پہلے تھا۔

تو وہی سبق تم دوبارہ یہاں شروع کر لو گے۔ میں پڑھاؤنگا تمہیں۔

لیکن کیوں قاری صاحب؟؟؟ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں کہ میں مدرسے میں نہ پڑھوں؟؟؟

قاری صاحب کچھ نہیں بولے۔ اسی ایک سوال کا جواب ہی تو نہیں تھا انکے پاس۔

اچھا چلو بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔ خوش رہو۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے اسکے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ بھی انکے ساتھ اٹھ گیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں قاری صاحب کو مدرسے سے اتنی چڑ ہے؟؟؟؟ یہی سوچتے ہوئے گھر پہنچ گیا

بابا آپ کا گھر کہاں ہے؟؟؟؟

کیوں بیٹے میرے گھر کا پتا کر کے کیا کرنا ہے؟؟؟ بابا ہنستے ہوئے بولے۔

ویسے ہی۔ آپ اکیلے رہتے ہیں؟؟؟ اس نے پھر پوچھا۔

نہیں بیٹا۔ میری ایک پوتی رہتی ہے میرے ساتھ۔ بابا نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

تو بابا وہ کہاں ہے ابھی آپ تو یہاں ہیں تو۔۔۔۔۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ سکول گئی ہے۔ بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔

وہ کوئی کلاس میں ہے؟؟؟؟ اسنے ایک بار پھر پوچھا۔۔

پانچویں میں۔۔

مجھ سے دو کلاسیں آگے ہے۔۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

ہاں بیٹا لیکن وہ تمہاری طرح کھیلتی نہیں ہے؟؟؟؟ انہوں نے اسکے گال پر پیار کرتے ہوئے بولا۔
کیوں؟؟؟

اسیے کہ وہ سکول سے آنے کے بعد گھر کا کام کرتی ہے کھانا بناتی ہے اور بس مجھ سے باتیں کرتی ہے

--

اسے کھانا بنانا آتا ہے؟؟؟؟ وہ حیران ہوا۔

ہاں بیٹا اسے کھانا بنانا آتا ہے۔۔

لیکن وہ کھیلتی کیوں نہیں؟؟ اسکے پاس کھلونے ہیں؟؟؟ اس نے ایک بار پھر پوچھا

نہیں بیٹا اسکے پاس کھلونے نہیں ہیں۔ گڑیا بھی وہ اکثر مانگتی ہے لیکن میں نہیں لے جاسکتا۔۔

اتنے میں سکول میں وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ وہ اپنی کلاس کی طرف بھاگا۔ اپنے وقت پہ چھٹی ہوئی تو اپنے گھر چلا گیا۔

طوبی! تم مجھے ایک گڑیا دے سکتی ہو؟؟؟ شام کو وہ طوبی سے بولا۔

کیوں؟؟؟؟ اس نے حیرت سے پوچھا

ویسے ہی۔ بس مجھے چاہئے۔ آٹھ سال کا ہو کر بہت بڑا سوچ رہا تھا۔

نہیں میں تمہیں اپنی گڑیا کیوں دوں؟؟؟ میں نہیں دوں گی۔۔

پلیز طوبی! مجھے چاہئے، وہ لیے بغیر نہیں چھوڑ رہا تھا۔۔

ایک شرط پر دوں گی۔۔

وہ کیا؟؟؟ وہ حیران ہوا۔

تم مجھے اپنا وہ بیگ دو گے جو تم نے کچھلی دفعہ پاپا کے ساتھ جا کے لیا تھا اور جو مجھے بہت پسند ہے لیکن تم مجھے نہیں دیتے۔۔

کیا؟؟؟ پاپا گل ہو کیا؟؟؟ وہ میں کبھی نہیں دوں گا وہ مجھے پسند ہے۔۔

تو میں بھی گڑیا نہیں دوں گی۔۔ وہ بھی انک گئی تھی۔

طوبی! پلیز مجھے چاہئے۔ تم بے شک میری گھڑی لے لو جو پاپا نے دی تھی یا میرا ویڈیو گیم لے لو یا میری وہ گاڑی لے لو۔ اسنے سامنے پڑی کھلونا گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں میں نہیں دو گئی اپنی گڑیا تم جہاں سے لے لو۔۔

نہیں وہ چھوٹی ہے تم دے دو پلیز۔۔ اب وہ باقاعدہ التجا کر رہا تھا۔

مجھے اگر اپنا بیگ دو گے تو گڑیا دو گئی ورنہ نہیں۔۔

وہ چپ ہو گیا۔ کسی قیمت پر اپنا بیگ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بیگ تو اس نے بہت شوق سے خریدا تھا۔ تقریباً ایک مہینے پہلے خاور کے ساتھ بازار گیا تھا تو اس نے بہت پسند سے وہ بیگ لیا تھا۔ اور اس بیگ کی تو اس کے دوستوں نے بھی بہت تعریف کی تھی۔ اور تو اور طوبی کو کتنا پسند تھا وہ بیگ۔ اور وہ اس سے کتنا مانگ رہی تھی لیکن اس نے نہیں دیا۔ اور آج وہ اس سے گڑیا کے بدلے وہی بیگ مانگ رہی تھی۔۔ جاؤ نہیں دونگا بیگ۔ میں دوسری گڑیا خرید لوں گا۔ وہ غصے میں بولا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ فائدہ اٹھا رہی تھی۔

ہا ہا ہا۔۔۔ بھیا تم گڑیا خریدو گے؟؟؟؟؟ وہ حیران ہوتے ہوئے بہت ہنسی۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر چلا گیا۔

وہ رات تک طوبی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ناراض رہا کہ بٹاید وہ اسے دے دے لیکن اس نے نہیں دی۔۔

دفع کرو میں نہیں لوں گا اس سے، میں دوسری لے لوں گا۔ اس نے غصے میں سوچا۔

طوبی تم مجھے گڑیا دے دو اور میرا بیگ لے لو۔ وہ لوگ سونے کیلئے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ تھوڑی دیر بعد طوبی اور جہاں کے کمرے میں آیا۔۔

کیا واقعی بھیا؟؟؟ آپ مجھے اپنا بیگ دے رہے ہیں؟؟؟؟؟ وہ اچھل ہی تو پڑی۔ اسے گڑیا کی ایسی کیا ضرورت تھی جو وہ اپنا پسندیدہ بیگ دے رہا تھا اس کے بدلے میں۔

ہاں تم لے لو۔ اگر چاہتی ہو تو ابھی میں اپنی بکس نکال دیتا ہوں۔ صبح پھر دیر ہو جائے گی لیکن تم مجھے اپنی گڑیا بھی ابھی دے دو۔ وہ بٹاید ہر قیمت پر گڑیا لے لینا چاہتا تھا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کل پھر ماما صبح ڈانٹے گی۔ تم مجھے ابھی دے دو۔۔ وہ بھی تیار تھی۔ وہ بیگ صبح اپنی دوستوں کو دکھانے کے خیال سے وہ بہت خوش تھی سو اسے اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ ایک گڑیا کیلئے اپنا بیگ کیوں دے رہا ہے۔۔۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے اپنا بیگ خالی کیا اور اپنا سامان دوسرے اپنے پرانے بیگ میں منتقل کر کے وہ اس کے کمرے میں گیا اور اسے بیگ دے کر گڑیا لے آیا۔۔

اگلے دن اس کے پاس پرانا بیگ اور طوبی کے پاس اس کا نیا بیگ دیکھ کر خاور اور شمیدنا اچھے خاصے حیران

ہوئے اور پوچھا بھی۔ وہ اس بیگ کیلئے اسکی پسندیدگی جانتے تھے اسیجے حیران ہوئے۔۔۔
 باپا میں نے طوبیٰ کو دے دیا ہے۔ اس نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔
 بابا یہ گڑیا لے لیں اور اپنی پوتی کو دے دیں۔ میں نے اپنی بہن سے لی ہے۔
 اور سکول کے وقفے کی جیسی ہی گھنٹی بجی۔ وہ بھاگتا ہوا بابا کے پاس آیا۔ وہ اپنا بیگ اپنے ساتھ
 لایا تھا۔ کسی کو دکھانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیگ میں کیا لایا ہے۔ فیضان کو بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔
 کریم دادیک تک اسے دیکھتا رہا۔۔۔

بابا یہ گڑیا بولتی بھی ہے۔ اس نے خوشی سے اسے بتایا۔۔۔
 کریم دادی پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ بولتا بھی تو کیا؟ بس پانی کے کچھ قطرے تھے جو اسکی آنکھوں سے
 نکل کر گالوں پر بہہ گئے۔ جانے یہ لڑکا کتنی دفعہ مجھے رلائے گا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے
 سوچا۔۔۔

بیبا یہ تم اپنی بہن کو دے دو۔ میری پوتی کو اسکی عادت نہیں ہے۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔
 عادت پڑ جائے گی بابا آپ اسے دے دیں۔ اسے اچھی لگے گی۔ دیکھیں یہ اسطرح گانا گاتی ہے۔
 اس نے گڑیا کے پیچھے لگا ہوا ایک ایک چابی نما پر زہ گھمایا اور گڑیا رکھ دی تو وہ واقعی گانے لگ گئی۔۔۔
 بابا میری بہن کے پاس اور بھی ہیں اس نے یہ مجھے دے دی۔ یہ تو وہ بتا ہی نہیں پایا کہ اس گڑیا کی
 اس نے کیا قیمت دی ہے۔ اپنا پسندیدہ بیگ دیا تھا اسکے بدلے میں۔

بابا ابھی تک کچھ نہیں بولا۔ وہ بولنے کے قابل کہاں رہا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی میں لوگوں کی
 نظروں میں اپنے لیے زیادہ تر تو حقارت ہی دیکھی تھی لیکن بہت کم لوگوں کی نظروں میں رحم بھی
 دیکھا تھا جو اسے اس حقارت سے زیادہ تکلیف دیتا تھا۔ وہ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خود پر پڑنے والی نظروں
 اور چہروں کے تاثرات کو سمجھ چکا تھا۔ کم سے کم اتنا تو کہ کون اسکے بارے میں کیا سوچتا ہے۔۔۔

لیکن یہ لڑکا اسے بہت حیران کرتا تھا۔ اسکی نظروں میں نہ تو حقارت تھی نہ ہی رحم۔ یہ تو احترام
 اور عزت کی نظر تھی جس کے سوچ کو بھی وہ عرصہ پہلے اپنے بیٹے کی لاش کے ساتھ دفن کر آیا تھا۔۔۔ اور اپنی
 پوتی کی بے انتہا فرمائش پر بھی وہ اسے گڑیا نہیں لے کر دے سکا تھا لیکن آج یہ بچہ اسکی پوتی کیلئے
 گڑیا لایا تھا۔

اکثر اوقات جب انسان اپنے لیے لوگوں کی نظروں میں ایک ہی تاثر دیکھتے دیکھتے اچانک
 دوسرا دیکھ لے تو وہ اس سے سنبھلا نہیں جاتا اور آنسو اسکی آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں۔ اور غریب کے
 آنسوؤں کو تو نکلنے کا بھی بہانہ ہی چاہئے ہوتا ہے۔ چلوں پر ہوتے ہیں، ادھر تیز ہوا چلی اور ادھر وہ بہہ نکلے

آپ کو پسند نہیں آئی؟؟؟ وہ آنکھوں میں سوال لیے کھڑا تھا۔ بچہ تھا۔ اسکے رونے کی وجہ نہیں جان پا رہا تھا اور اندازہ لگا رہا تھا کہ اسے گڑیا پسند نہیں آئی۔ اسکی آواز پر کریم داد سوچوں کی دنیا سے نکل آیا۔

نہیں بیٹا نہیں۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مم مجھے بہت پسند ہے اور وہ بھی بہت خوش ہوگی دیکھ کر۔ وہ سنا باجرہ۔ میری پوتی۔۔۔۔۔ بابا بہت بے ربط الفاظ بولا۔

ٹھیک ہے باباجی۔ اب میں چلتا ہوں۔ فیضان کو بھی نہیں بتا کر آیا۔ اس نے اپنی جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکالا اور بابا کی پچھلی ہوئی جھولی میں ڈال کر واپسی کیلئے قدم بڑھائے۔

کریم دادا سے ہفتوں کی طرح دیکھتا رہا۔ کچھ بھی نہیں بولا بس اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اور پھر آنکھوں کو مسلتے ہوئے پلموں پر آئی ہوئی نمی کا راستہ روکا۔

گانے والی گڑیا اسکے پاس ہی زمین پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ویسی ہی کھڑی تھی جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ کریم دادا نے جلدی سے اسے اپنی چادر میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ مبادا انکی پوتی کی اتنی بڑی خوشی کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اور وہ جانتا تھا کہ غریبوں کی خوشیوں کو نظر بھی تو بہت جلدی اور آسانی سے لگتی ہے۔

مجاہد اللہ کو در سے میں آئے ہوئے تقریباً تین مہینے ہو گئے تھے۔ ان مہینوں میں اس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ گھر چلا جائے۔ اسے بہت زیا دہ تو نہیں لیکن کبھی کبھی اپنا گھریا ضرور آتا تھا اور ان لمحات میں اس کا شدید دل کرتا اپنے گھر اور اپنے گاؤں جانے کا۔ آج بھی صبح کی سیر کے بعد اس نے علی حیدر سے کہا۔۔۔

حیدر میرا بہت دل کر رہا ہے کہ میں گھر جاؤں۔ کچھ دن اپنے گھر میں گزارنا چاہتا ہوں یا۔۔۔۔۔
ہاں تو جاؤنا۔۔۔ قاری صاحب سے بات کر لو اور پھر جاؤ۔
ہاں سوچ رہا ہوں کہ آج کر لوں۔۔۔

مجاہد قاری صاحب ٹھیک کہتے ہیں ماکہ اگر ہم ساری برائی کو ختم نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے حصے کا کچر اتو صاف کر سکتے ہیں ما ---
 کیا مطلب؟؟؟؟؟

کل زمین اور گل میری تبلیغ سے واپس آئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس ملک میں تو ہر بندہ اسلام کے مطابق زندگی گزارنے سے مالاں ہے۔ انہوں نے جس جس کو بھی روکنے کی کوشش کی سب نے یہی کہا کہ

یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے تم لوگ اس میں مداخلت نہ کرو۔۔۔

تو۔۔۔ اسے حیرانی سے پوچھا۔۔۔

تو کچھ نہیں لیکن مجھے تو قاری ثناء اللہ کی ساری باتیں دل پر لگی ہیں۔۔۔

ہاں یا باتیں تو وہ ٹھیک کرتے ہیں اور پھر بڑے مولانا صاحب تو سو آنے کی بات کرتے

ہیں۔۔۔

میں ایک بات بتانا ہوں تمہیں مجاہد۔ میری بہت بچپن سے خواہش تھی کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، کہیں کسی کافر سے لڑتے لڑتے اور میری کوشش ہو کہ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مارنا چاہے اور پھر میں دو چار کو جہنم واصل کر دوں اور خود بھی شہید ہو جاؤں۔

ہاں یا رجہا دا ور شہادت کا شوق کس مسلمان کو نہیں ہوتا۔ جو اپنے اللہ اور نبی ﷺ سے عشق کرے گا وہ جہاد سے بھی اتنا ہی عشق کرے گا۔۔۔

لیکن جہاد تو ضروری نہیں ہے کہ کافروں سے ہی کیا جائے اور بھی تو طریقے ہیں۔۔۔

رہنے دو یا راب مجھے وہ جادو بالنفس اور جہاد بالقلم نہ شروع ہو جانا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ مسلمان قوم اب تبلیغ سے سدھرنے والی نہیں ہے۔۔۔

ہاں اس دن مولانا صاحب بھی تو کہہ رہے تھے کہ وہ بہت سے شاگردوں کو بھیجتے ہیں لوگوں کی اصلاح اور انہیں اللہ کی طرف لانے کیلئے لیکن کوئی نہیں سمجھتا اور سب ماکام ہی ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں ایک ہی حل رہ جاتا ہے ماکہ جہاد کیا جائے۔۔۔

اور یہی باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے دس سے بچے لے گئے۔

جمعے کا دن تھا اور بڑے مولانا صاحب کا درس تھا۔ شتے سے فارغ ہو کر وہ پانچوں بھی درس کیلئے بیٹھ

گئے۔۔۔

مولانا صاحب اپنی ازلی رعب دار شخصیت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ روشنی کا ایک ہالہ انکے چہرے کا طواف کرتا ہے لیکن جتنی بڑی شخصیت تھی اتنی ہی اللہ نے سادگی بھی دی ہوئی تھی۔ گاؤں کیلئے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور نہایت بھاری لیکن پر نور آواز میں درس شروع کیا۔

اس دنیا کا نظام سزا اور جزا کے عمل پر چلتا ہے۔ سزا نہ ہو تو جزا نہیں ملتی۔ میری بات کی مثال اس طرح لے لیں کہ اگر کسی بچے کو اس کے والدین ہمارے پاس چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ یہاں سے عالم بن کر نکلے گا اور اپنے دین اور علم کی روشنی پھیلانے کا لیکن یہاں آ کر وہ نہیں پڑھتا۔ وہ بچہ ہے اور وہ کبھی بھی پڑھنا نہیں چاہتا لیکن ہم اسے زبردستی پڑھاتے ہیں اور یہ زبردستی بھی تب تک نہیں ہو سکتی جب تک اسے

سزا کا خوف نہ ہو۔ تو یہاں دو چیزیں آتی ہیں۔ ایک سزا اور دوسرا سزا کا خوف۔۔۔
ایک ہوتی ہے سزا اور وہ جس کو ملتی ہے وہ سبق سیکھ جاتا ہے اور پھر آئندہ وہ غلطی نہیں کرتا۔۔۔
جیسے کہ عرب میں چوری کرو تو ہاتھ کاٹ دیے۔ زنا کرو تو سنگسار کر دیا۔ جو سزا اسلام تجویز کرتا ہے وہ
اگر دینی شروع ہو جائے تو اس معاشرے کے آدمی سے زیادہ جرائم ختم ہو جائیں گے لیکن بد قسمتی سے یہاں
پر ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہاں پر با اختیار وہ ہے جو سب سے زیادہ گرا ہوا ہے، معزز وہ ہے جو با اختیار ہے
غریب کو کون پوچھتا ہے؟؟؟

ہمارے پیغمبر نے اور صحابہ نے جو زندگی گزاری ہے اسی کی ضرورت ہے ہمیں۔ انہوں نے جنگیں بھی
لڑیں اور امن میں بھی رہے۔ خوشیاں بھی دیکھیں اور غم بھی سہے تبلیغ بھی کی لیکن جب کوئی نہیں مانا تو انہوں
نے اس کے خلاف جہاد بھی کیا۔ آج بھی عیسائی اور مشنری لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں تو سارا کچھ جاننے ہو جھتے
بھی سب خاموش ہیں۔۔۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا۔ کیونکہ ہماری سرکار مسلمان نہیں ہے۔۔۔
جو لوگ کہتے ہیں کہ جو جیسے چل رہا ہے اسے ویسے چلنے دو میں انہیں مسلمان نہیں مانتا۔ ایک مسلمان
کیسے کہہ سکتا ہے کہ جو جیسے چل رہا ہے اسے ویسے چلنے دو۔ مسلمان کا شیوہ تو اللہ کے دین کی سر بلندی
اور بول بالا کرنے کیلئے اپنے گھوڑے دریاؤں میں ڈالنا ہے۔ پھر آج سب کیوں کہتے ہیں کہ جو جیسا ہے
ویسے رہنے دو۔۔۔

اصلاح ہمیشہ اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جب گھر ہی بگڑا ہوا ہو تو باہر کسی کو کیا تبلیغ
کا فائدہ۔ سمجھنا ہے تو پہلے اپنے گھر والوں کو سمجھاؤ۔ ہمارے رسول ﷺ کے طریقے کو دیکھیں کہ کس
طرح انہوں نے اصلاح اپنے گھر سے شروع کی۔ بلکہ اپنے گھر نہیں بلکہ اپنے آپ سے شروع کی۔ لیکن
اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ دوسروں کو کوئی اچھی بات ہی نہ سمجھاؤ۔ ضرور سمجھاؤ اگر نہیں سمجھتا تو زبردستی
کرو لیکن اسلام کا حکم منو! آپ اس سے۔۔۔

ہمارے ہی ﷺ فرماتے ہیں کہ۔۔۔
اللہ کی قسم اگر تیرے ذریعے کسی ایک آدمی کو ہدایت مل جائے تو تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر
ہے۔۔۔

تو ہدایت کیسے ملے گی؟ تب جب آپ اپنے آپ کو وقف کرو گے کہ آپ نے اپنے ذریعے کسی کو
ہدایت دینی ہے۔ اسے برے کاموں سے روکنا ہے چاہے وہ تبلیغ کے ذریعے ہو یا پھر زبردستی۔ پہلے تبلیغ
کرو۔ اسے سمجھاؤ، اسے روکو لیکن اگر وہ نہیں سمجھتا تو اسے زبردستی روکو۔ ہمارے نبی نے بھی ایسا ہی کیا ہے
۔ نبیاشی کو خط لکھا۔ اسے اسلام کی دعوت دی لیکن وہ اکرنا رہا، نہ مانا تو لشکر کے ساتھ گئے۔

یہ جوگلی کلی کے علماء ہیں یہ گمراہی کے پلندے ہیں۔ کہاں لکھا ہے کہ برائی کو زبردستی مت روکو۔ جب اللہ کے ہاں خود یہی دستور ہے تو ہم کون ہوتے ہیں اس دستور کو بدلنے والے۔ پچھلی امتوں پر نظر ڈالو۔ اللہ کا یہ قانون ہے کہ پہلے سمجھاؤ روکو برے کاموں سے اور اپنی طرف سے جتنا ہو سکتا ہے اتنا کرو لیکن اگر کوئی نہیں سمجھتا اور اڑھتا ہے تو زبردستی کرو۔ اللہ نے حضرت شعیبؑ کو بھیجا کہ ملاوٹ سے روکو، حضرت لوطؑ کو بھیجا کہ بے حیائی سے روکو، حضرت صالحؑ کو بھیجا اور ان سب نے اپنی پوری کوشش کی اپنی قوم کو سمجھانے کی لیکن کوئی نہیں مانا۔ اصل میں یہ برائی جو ہوتی ہے مایہ سونے جیسی ہوتی ہے۔ دور سے ہی بندے کو نظر آ جاتی ہے اور اپنی طرف کھینچتی بھی ہے اور جب بندہ قریب جاتا ہے اور خرید لینا ہے پھر تو بھلے کوئی اسکی جان بھی لے لے وہ اپنی ملکیت سے دستبردار کبھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک گہرا ڈھلوان خندق ہے جس میں جتنا اترتے جاؤ گے اتنا ہی مشکل سے باہر آ سکو گے اور کبھی کبھی تو آپ اتنی گہرائی میں اتر جاتے ہو کہ نکلنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

اور یاد رکھو کہ گناہوں کی آخری حد کے پار کوئی ساحل نہیں ہے۔ ایک گہرائیوں ہے جس کے اوپر کوئی ڈھکن بھی نہیں ہے۔ وہ کبھی بھرتا بھی نہیں ہے اور گناہوں کی زندگی اور اس کنویں کے بچ میں صرف موت ہے۔۔۔۔۔

آپ نے کبھی سنا ہے کہ جو انسان سگریٹ پیتا ہے وہ اپنے آپ کو تو نقصان دیتا ہے لیکن ساتھ میں وہ انسان بھی نقصان میں رہتا ہے جو اسکے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے چاہے وہ سگریٹ نہ بھی پیے۔ مطلب یہ کہ نقصان میں ایک تو وہ رہا جو پی رہا تھا لیکن نقصان میں وہ بھی رہا جو اسکے ساتھ تھا جسے اس شخص کی غلطی کا پتا تھا لیکن اس نے نہیں روکا۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ ایک تو وہ شخص ہے جو گناہ کر رہا ہے۔ وہ تو گناہگار ہے ہی لیکن گناہگار وہ بھی ہے جو گناہ ہوتے دیکھتا رہا اور پھر بھی خاموش رہا۔ جیسے اگر کوئی ظلم آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو اور آپ ہوتے دیکھتے رہیں تو آپ بھی اس ظلم میں شریک ہو گئے۔

ہم میں سے ہر ایک خود کو مسلمان کہتا ہے۔ اپنے نام کے آگے محمد اور پیچھے اللہ لگا کے سب کو خوشی ہوتی ہے لیکن انہوں نے جو کہا اس پر کوئی بھی عمل کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اللہ تو فرماتا ہے کہ تم وہ امت ہو جو برے کاموں سے روکتے ہو۔ اور تم بہترین امت ہو۔

مطلب یہ کہ اللہ نے خود فرما دیا کہ تم بہترین امت تو ہو لیکن اس امت میں شامل ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تم نیکی کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو پھر تمہارا شمار اس امت میں نہیں ہوگا جو بہترین ہے۔۔۔

اور نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا طریقہ بھی اسکے ہی ﷺ نے بتا دیا ہے۔ کہ برائی

کوزیر بازو سے روکوا رہے ہیں ہو تو زبان سے روکوا تا بھی نہیں کر سکتے تو دل سے برا سمجھو۔۔۔
 تو جب اللہ اور اس کا رسول فرماتا ہے کہ برائی اور گناہ کو روکو تو اس بات کو ماننے کی کیا تک رہ جاتی
 ہے کہ سب کی اپنی اپنی مرضی ہے۔ یا درکھو کہ اسلام کے چھنڈے کے پیچھے آنے کے بعد کوئی مرضی نہیں رہ
 جاتی۔ ہماری رضا وہ ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہوتی ہے۔ جو انکی خواہش وہ ہماری خواہش
 اور جو ان کیلئے ناپسندیدہ وہ ہمارے لیے حرام۔ اب وقت ہے کہ ہر با عمل مسلمان اپنے دین کو بچانے کیلئے
 جہاد شروع کرے۔ اور یہ جہاد کسی اور کے خلاف نہیں بلکہ ہماری اپنی صفوں میں موجود اسلام کے نام
 پر غیر مسلموں کے پھروکاروں کے خلاف ہوگی۔ کیوں کہ جب تک اپنی صفوں کے منافقین ختم نہیں ہونگے
 ۔ تب تک ہم کسی غیر مسلم کوزیر کرنے کا نہیں سوچ سکتے۔ پہلے ان کو ختم کرنا ہے بعد میں غیروں
 کوزیر کرنا ہے۔ اپنے لوگوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانا ہے پھر دوسروں کے بارے میں سوچیں گے۔
 اب آخر میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی راہ پر چلنے کی توفیق اور اپنا پسندیدہ بندہ بننے کی
 ہمت عطا کرے۔ ہمیں وہ بندہ بنائے جو اسے پسند ہے۔ وہ نہیں جو شیطان کا پسندیدہ ہے۔۔۔

کسی اور نے بھی تو قوم لوط جیسا بننے سے پناہ مانگی تھی۔ کسی اور نے بھی چاہا تھا کہ قوم عاد کی برائیوں
 سے اللہ انہیں محفوظ رکھے۔ کسی اور نے بھی اللہ سے اسکا پسندیدہ بندہ بنانے کی استدعا کی تھی اور کسی اور نے
 بھی چاہا تھا کہ برائی کو روکا جائے اور ختم کیا جائے لیکن دونوں میں بہت فرق تھا۔ الفاظ تو کچھ کچھ ایک جیسے
 تھے لیکن نیت بالکل مختلف تھی اور نیتوں کا حال اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔
 لیکن اب تو وہ جان گیا تھا نیتوں کا فرق بھی اور دونوں دعاؤں کی حقیقت بھی۔۔۔
 لیکن اب وہ دلدل میں اتنا پیچھے گر گیا تھا کہ واپس نکلنا ناممکن تھا۔۔۔۔
 اس نے ایک سرد آہ بھر کر آسمان کی طرف نظر کی لیکن پھر وہاں سے بھی شرمندہ ہو کر آنکھیں بند کر کے
 زمین پر بیٹھ گیا اور سر پیچھے بڑے پتھر کے ساتھ لگا دیا۔۔۔۔۔

تیسرے دن فضل اسے واپس مدرسے چھوڑ آیا۔ ایک بار پھر وہ رویا تھا اور ایک بار پھر جمیلہ کی
 آنکھوں نے بھی برسات برساتی۔ لیکن اس بار اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی البتہ اس سے دو ہفتے
 بعد دوبارہ آنے کا وعدہ ضرور لیا تھا۔

مدرسے آنے کے بعد وہ اتنا داس نہیں تھا اور ویسے بھی اب تو اسکی کافی لڑکوں سے دوستی ہو گئی
 تھی۔ سب سے زیادہ دوستی اسکی ماثقہ کے ساتھ تھی۔ اب وہ روزنامہ کو کھیلنے بھی جاتا تھا۔ کھیلنے میں تو وہ

ویسے بھی اچھا تھا سو سارے اسکو کھلانے پر خوش ہی ہوتے۔۔

ٹا قب تمہیں ایک بات بتاؤں۔ اس شام مدرسے کے پیچھے والے میدان میں جاتے ہوئے وہ بولا۔

ہاں بتاؤ نا۔۔

میرا نسا نہ بہت پکا ہے۔ میں محلے میں دور سے غلیل سے کسی کے بھی گھر میں لگے پھلوں کا نسا نہ لے کر پتھر پھینکتا اور پتھر سیدھا پھل کو گرانا اور یوں ہم پھل کھاتے۔

اچھا۔۔۔ وہ حیران ہوا۔

ٹا قب وہ جو اس دن مولوی صاحب تم لوگوں کا نسا نے کا مقابلہ کروا رہے تھے بوقت رکھ کر تو میں نے سوچا کہ میں جا کر لگاؤں نسا نہ لیکن مجھے ڈر لگ رہا تھا کیوں کہ وہ تو بڑے طالبوں کا مقابلہ تھا۔۔۔

ارے پاگل ہو گئے ہو کیا؟؟؟ آجاتے نا۔۔۔

اور چلتے چلتے اچانک ہی ٹا قب رکا۔۔

تم یہی رکورحمت میں ابھی آتا ہوں۔ وہ واپس مدرسے کی طرف مڑا۔۔

کہاں جا رہے ہو؟؟؟ وہ حیران ہوا

تم رکو میں آتا ہوں۔ اور وہ مدرسے کی سمت بھاگا۔۔۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ اسے واپس آنا دکھائی دیا

چلو۔۔۔ وہ رحمت کے ساتھ میدان کی طرف چلنے لگا

تم گئے کہاں تھے؟؟؟ اس نے پوچھا

تم چلو تو۔۔۔۔

وہ دونوں میدان میں پہنچے تو ٹا قب نے جیب سے ایک چھوٹا سا غلیل نکال کر اس کے ہاتھ میں تنہا دیا۔ یہ لواور نسا نہ باندھو، میں اینٹ رکھتا ہوں۔ غلیل اس کے ہاتھ میں تنہا کر تھوڑی دور اس نے ایک اینٹ رکھی۔ رحمت نے زمین سے ایک کنکرا اٹھایا اور نسا نہ باندھا۔ غلیل چھوٹا تو کنکر سیدھا جا کر اینٹ پر لگا۔ ٹا قب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔۔

مطلب جو وہ کہہ رہا تھا کہ اسکا نسا نہ اچھا ہے تو ٹھیک کہہ رہا تھا ٹا قب نے اس بار اینٹ کا فاصلہ بڑھا دیا لیکن رحمت کا نسا نہ اس بار بھی خطا نہیں ہوا۔ وہ چند لمحے رحمت کو دیکھتا رہا اور پھر جا کر اینٹ کا فاصلہ مزید بڑھا دیا۔ کنکرا اس بار اینٹ پر تو نہیں لگا لیکن اس کے بہت پاس جا کر گرا۔ اتنا کہ اگر تھوڑا سا بھی سیدھا ہوتا تو اینٹ پر لگ جاتا۔۔۔

نتیجہ نہ خطا ہو گیا تھا لیکن مہربان قبہ پھر بھی اسے حیران نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اچانک بھاگ کر اسکے گلے لگ گیا۔ رحمت کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اسکے گلے لگا رہا۔

صبا مجھے ایک ہفتے کیلئے اسلام آباد جانا پڑے گا؟؟؟
 اسلام آباد؟؟؟ لیکن کیوں؟؟؟ وہ بہت حیران ہوئی۔۔
 اسلام آباد جانے میں اتنا حیران ہونے والی کونسی بات ہے؟؟؟ وہ حسب معمول مذاق کرتے ہوئے بولا۔

اسلام آبا د جانے میں نہیں لیکن وہاں ایک ہفتہ رہنے پر حیران ہوں۔ وہ اسکی چائے میں چینی ملا تے ہوئے پوتا۔۔۔

آج وہ بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ شام کو نوں پر بتا دیا تھا کہ آج اسے ایک دوست کو دیکھنے ہسپتال جانا تھا اور اسکے بعد اسے بینک کے کچھ کام دیے گئے تھے جو آج ہی اسے کرنے تھے سو آج وہ رات کے کھانے میں بھی شامل نہیں ہوا تھا۔ پچھلے چار مہینے سے صبا کو بھی رات کے کھانے پر اسکی عادت ہو گئی تھی اس لیے اسکے بغیر دل بھی نہیں کر رہا تھا لیکن پھر رضا اور کامران کے اصرار پر اسے کھانا ہی پڑا اور ابھی رات ساڑھے دس بجے وہ دوبارہ اسکے ساتھ کھا رہی تھی۔۔۔

وہاں ایک ہفتہ نہیں گزارنا چاہئے کیا مجھے؟؟؟
 نہیں بالکل نہیں۔ اسلام آباد تو اتنا قریب ہے، آپ روز آ سکتے ہیں۔ پورا ہفتہ کیوں رہیں گے
 وہاں۔۔۔ وہ چھوٹا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بوٹی۔۔۔

کیا؟؟ روز کیسے آجاسکتا ہوں میں؟؟ جانتی ہوں مجھے صبح آٹھ بجے دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ وہ اس کے مطالبے پر حیران ہوا۔

ہاں تو صبح پانچ بجے نکل سکتے ہیں نا آپ، میں صبح اٹھ کر ناشتہ کروا دیا کرونگی۔۔۔

ارسلان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جی بھر کر پیار آیا اس لڑکی پر۔ کتنا پیار سموئے ہوئے تھی وہ اپنے دل میں۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

اور پھر چانک ایک نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے اس نے ہاتھ روک لیا۔۔۔

صبا۔۔۔۔۔
وہ نیچے دیکھ رہی تھی۔ ارسلان کے آہستہ سے بلانے پر نظریں اٹھائی۔ اپنے چہرے کے ہلکل پاس اسکا ہاتھ اور اس میں نوالہ دیکھ کر وہ ہنسی۔ اور دوسرے ہی لمحے اپنا منہ جھوڑا سا کھول دیا۔۔۔

ارسلان کو لگا کہ وہ تھوڑی سی اداس ہو گئی تھی اسکی بات سن کر۔ اور اسے تو وہ اداس رہنے ہی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔

آؤج۔۔۔۔۔ ڈریکولا ہو کیا؟؟؟؟ ارسلان نے نوالہ اس کے منہ میں رکھا تو چانک اس نے اپنے دانتوں سے اسکی انگلیوں پر کاٹ لیا اور یہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ آج تھکا تھکا اور خاموش خاموش تھا لیکن صبا کو تو خاموش ارسلان نہیں بلکہ ایک ہنستا مسکراتا اور تگ کرتا ارسلان ہی اچھا لگتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ اسے بہت تگ کرتا تھا۔ لیکن اب تو اسے اسکا تگ کرنا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔۔۔ تو آج وہ خاموش کیوں تھا۔

نہیں ڈریکولا تو نہیں ہوں لیکن آپ اتنے پیار سے دے رہے تھے کہ میرا دل کیا کہ نوالے کے ساتھ انگلیاں بھی کھالوں۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔۔

ہاں میں پیار سے دے رہا تھا تو تم نے سوچا کہ آج اس کو ایسا سبق سکھاتی ہوں کہ آئندہ پیار جتانے کا سوچ ہی نہ سکے۔ وہ اپنی پرانی طبیعت پر لوٹ آیا تھا۔ وہ کامیاب ہو گئی۔۔

گھر میں گوشت ختم ہو گیا ہے؟؟؟

نہیں گوشت تو پڑا ہے۔ کیوں؟؟؟؟

اس لیے بی بی کہ تم میرا گوشت جو کھانے کے چکر میں ہو۔۔۔ وہ ٹھنڈی رات میں گرم چائے

کا سپ بھرتے ہوئے بولا

گوشت تو فریج میں پڑا ہے لیکن وہ انسانی نہیں ہے۔ کھانے کے خالی برتن اٹھاتے ہوئے وہ اسے اور چڑا رہی تھی۔

تو پہلے کتنا انسانی گوشت کھا چکی ہو تم مہتر مہ؟ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ڈریکولا ہو۔

پہلے تو نہیں کھایا اور آج بھی نہیں کھا سکی لیکن مستقبل قریب میں پکا ارادہ ہے انسانی گوشت کھانے کا۔ وہ ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔۔

مسکراہٹ رسل کے چہرے پر بھی تھی۔ وہ خوش ہو گئی تھی۔ اور وہ یہی چاہ رہا تھا۔۔

وہ بھی صوفے سے اٹھ کر کپڑے بدلنے چلا گیا۔ آج بہت تھکا ہوا تھا اور نیند بھی بہت آرہی

تھی۔۔

کون کہتا ہے زندگی دوبا رہ نہیں ماتی۔ زندگی دوبا رہ ضرور ماتی ہے۔ کچھ لوگ تو روح کی پرواز کے ساتھ مر جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ جسم سے روح کی پرواز کے ساتھ زندہ امر ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں

کو شہید کہتے ہیں۔ اسی کو اللہ اپنی کتاب میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔۔۔
اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے۔ ہرگز انہیں مردہ خیال نہ کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں
اور روزی پاتے ہیں۔۔۔

آل عمران: ۹۶۱

تو ثابت ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو مرا ہوا نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ وہ اللہ کے پاس
زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔ تو جو انسان رزق پاتا ہے مردہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب اس بات سے کوئی یہ نہ
سمجھے کہ اللہ نے جو کل نفس ذائقہ الموت کا وعدہ کیا ہے وہ جھوٹ ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ موت
شہید کو بھی آتی ہے۔ بلکہ وہ تو اللہ کی راہ میں لوگوں کی نظر میں اسی وقت مرجاتا ہے لیکن وہ اللہ کی نظر میں کبھی
نہیں مرتا۔ اللہ کے پاس وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہ بات قرآن مجید میں اللہ نے واضح کر کے ان لوگوں
پر بھی واضح کر دیا تھا جو کہتے تھے کہ۔۔۔

یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور انکے جو بھائی لڑنے گئے اور مارے گئے انکے متعلق کہتے
ہیں کہ اگر وہاری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔

آل عمران

آج آپ کو حدیثوں اور آیتوں سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ کل کو کوئی برائے نام مسلمان آپ سے
آپکے عمل کی تشریح مانگے تو آپ بتا سکو کہ آپ کا عمل اللہ اور اس کے رسول کے طرز پر اور انکی تعلیمات کے
مطابق ہے۔

تو حضرت امام حسین جو بی ﷺ کے نواسے اور جنت کے نو جوانوں کے سردار ہیں فرماتے ہیں
کہ

جب جسم موت کیلئے ہے تو اللہ کی راہ میں شہید ہونا سب سے بہتر ہے۔۔۔
رسول ﷺ کا نواسہ فرماتا ہے کہ شہادت سب سے بہترین موت ہے اور انہوں نے صرف فرمایا ہی
نہیں عملی طور پر اس پر عمل بھی کیا اور اکیلے نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ شہادت پائی۔۔۔
نواسہ رسول کی شہادت سے ایک اور تلقین بھی ملتی ہے ہمیں۔ وہ یہ کہ انہوں نے شہادت تو قبول کر لی
لیکن ظالموں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اپنے خاندان کے افراد کے سراپنی نظروں کے سامنے کھٹے ہوئے
دیکھتے رہے لیکن اپنے عزم سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ انکے ایمان کی یہ حالت تھی اور آج ہمارے
ایمان کی کیا حالت ہے یہ ہم سے بہتر کون جانتا ہے؟؟؟

صحابہ کرام کی محبت کی انتہا ہی دیکھ لو۔ انگاروں پر ننگے پاؤں چلے، تھقی ریت پر ننگے بدن لٹائے

گئے، جسموں کو گرم سلاخوں سے داغا گیا۔ گلے پہ چھریاں پھیری گئی لیکن مجال ہے جو انکی محبت کم ہوئی ہو بلکہ مزید بڑھتی گئی۔ انگاروں پر وہ اللہ اکبر پڑھتے رہے۔ تختِ ریت پر اللہ اور رسول کا نام لیتے رہے۔ ظالم حکمران جن سے دنیا کا بٹی تھی انکے سامنے کلمہ حق بلند کیا۔

جاؤ میرے بچے! اس دنیا کو بتادو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ابھی زندہ ہیں۔ اسکے نام پر مرنے والوں کا وجود ابھی بھی ہے اس دنیا میں۔ ابھی اس دنیا سے مسلمان ختم نہیں ہوئے۔

رحمتے تم اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ اماں یا نہیں آتی کیا؟

اماں رحمتے نہ کہا کرو مجھے۔۔۔

کیوں؟؟؟؟؟ وہ حیرانی سے بولی۔

مجاہد اللہ نام ہے میرا۔ وہ فخر سے بولا۔

کیا؟؟؟؟؟؟؟ وہ حد درجہ حیران ہوئی۔

اماں بڑے مولانا صاحب نے رکھا ہے۔۔

بڑے مولانا صاحب کون ہوتے ہیں تیرا نام بدلنے والے۔ یہ نام میں نے اور تیرے باپ نے رکھا ہے۔ وہ غصے میں بولی۔

اماں مجاہد برنام تو نہیں ہے نا۔ پھر غصہ کیوں کر رہی ہو۔ اچھا ٹھیک ہے تم رحمت ہی بولا کرو لیکن وہاں سب مجاہد کہتے ہیں تو اب اسی کی عادت ہو گئی ہے۔

رحمتے میں نے تجھے کتنا روکا تھا مدر سے اور اس بڑے مدر سے جانے پر تو تیرا باپ بھی راضی نہیں ہے لیکن تو اپنی مرضی کر کے گیا ہے۔ اب دیکھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ باقاعدہ اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے بولی۔۔

اماں بڑے مدر سے میں بھی تو عالم لوگ ہی ہیں نا۔ ان سے علم سیکھ کر آ جاؤنگا۔ اتنی سی تو بات ہے

اتنی بات نہیں ہے رحمتے۔ تیرے ساتھ کچھ بُرا نہ ہو جائے یا پھر تو کسی کے ساتھ کچھ برا نہ کر لے۔ کیا ہو گیا اماں؟؟؟ کسی نے کچھ نہیں کرنا میرے ساتھ اور میں نے کونسا کسی کی جان لے لی ہے جو تم اتنا پریشان ہو رہی ہو۔۔

اسے جیلہ کا طرز پسند نہیں آیا تھا۔

اسے بڑے مدر سے میں گئے ہوئے ایک سال ہونے کو تھا اور اس عرصے میں وہ اس سے پہلے دو بار گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ پہلی بار ڈھائی مہینے بعد دوسری بار چار مہینے بعد اور اب تیسری بار تقریباً چھ مہینے

بعد آیا تھا۔ نام تو اسکا پہلے دن سے ہی بدل دیا گیا تھا۔ مدد سے میں وہ پہلے دن سے ہی مجاہد اللہ تھا لیکن پہلے اس نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا تھا پر اب اسے اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اپنا نام رحمت تو اسے بالکل بھول گیا تھا اس لیے آج جیلہ نے اسے پرانے نام سے پکارا تو وہ بول پڑا۔

تو لے بھی لے گا اگر تیرا بڑا مولانا صاحب تجھ سے کہے گا تو۔۔۔ وہ تپتے ہوئے بولی۔۔۔
اماں وہ ایسا نہیں کہتے۔ وہ تو ایسے انسان ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ وہ مکمل طور پر انکی سائینڈ لے رہا تھا۔

ہاں وہ فرشتہ ہیں۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کرتے تم تو یہی کہتے رہتے ہو لیکن مجھے تیرا یہ مولانا اچھا نہیں لگتا رحمت۔ وہ بہت غصے میں تھی۔۔۔

اماں میں غلط نہیں کہتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔

قاری ادریس بھی تو ہیں ما۔ کتنے اچھے ہیں۔ اگر یہ ایسا ہی برا نام تھا تو وہ کہہ دیتے لیکن وہ تو کہتے تھے کہ بہت اچھا نام ہے۔ اللہ کرے کہ اپنے نام کی لائق رکھ لے۔

اماں قاری ادریس اور مولانا عبدالرحمان کا کیا مقابلہ۔ کیا کرتی ہو اماں۔ ان سے ملو گی تو پتا چل جائے گا تمہیں بھی۔

مجھے کوئی پتا نہیں چلانا تمہارے مولانا کا بس تم اب کی بار وہاں مت جاؤ۔۔۔ وہ ایک اور مطالبہ لے آئی۔

ایک نام لینے سے ایسی کونسی قیامت آگئی اماں جو ایسی باتیں کر رہی ہو اور پھر انہوں نے کون سا کسی کو مجبور کیا ہے۔ بس انکو خود یہ نام پسند تھا تو وہ لیتے تھے۔ بعد میں لڑکے بھی لینے لگے۔ برا لگتا ہے تو نہ لیا کرو۔ اپنی مرضی کا بولا کرو۔ وہ تنگ ہوتے ہوئے بولا۔

میں تیرے ابا کو بھی بتاؤ گی رحمتے۔۔۔ یا پھر تو واپس نہ جانے کا وعدہ کر لے۔۔۔

اماں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اب میں پڑھ رہا ہوں تو تو کیوں پریشان ہو رہی ہے اور آپ تو خود کہتی ہیں کہ میں آپ کیلئے رحمت بن جاؤں تو اب جب کوشش کر رہا ہوں تو تو پریشان ہو رہی ہے۔۔۔ وہ دلیل دیتے ہوئے بولا

رحمتے بس تو واپس آ جا۔ اب تو کافی پڑھ چکا ہے۔ اب میں تجھے اتنی دیر خود سے دور نہیں رہنے دینا چاہتی۔ بوڑھی ہو گئی ہوں اب اور دیکھ تیرا ابا بھی اب کمزور ہو گیا ہے۔ اب وہ التجائی انداز پر اتر آئی تھی۔

ایسے کیسے آ سکتا ہوں اماں؟ ابھی ایک سال ہی تو ہوا ہے مجھے گئے ہوئے۔ وہ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

جیلہ خاموش ہوگئی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ وہ خوش ہو بھی کیسے سکتی تھی۔
کبھی کبھی انسان بہت چاہتے ہوئے بھی حالات کو بدل نہیں پاتا۔ اور یہی وقت ہوتا ہے جو اس کا نہیں ہوتا۔

وہ بھی اس وقت اپنے بیٹے کو اپنے پاس چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر اسے واپس بھیجنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی بدل نہیں سکتی تھی۔ نہ حالات کو اور نہ بیٹے کو۔۔۔۔۔

اور رحمت اللہ سے مجاہد اللہ بننے کا سفر مکمل ہو گیا۔ وہ اپنے پیچھے کافی رستہ طے کر آیا تھا جو اسے نہیں طے کرنا چاہیے تھا۔ منزل کی تلاش میں اس نے قدم بھی رکھ دیا تھا اور ابھی کافی رستہ طے کرنے کے بعد وہ جان پایا تھا کہ اس کا تو پہلا قدم ہی غلط تھا۔۔۔

کبھی کبھی کوئی ایک غلطی پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے مجاہد اللہ۔ اس سے کسی نے کہا تھا واپسی کا رستہ اللہ ہر کسی کو نہیں دیتا رحمت اللہ۔۔۔۔۔ ذہن کے پردے پر کوئی اور بول پڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں ابھرتی آوازوں سے گھبرا گیا تھا وہ۔

ملیمہ بیٹا صادم کا کمرہ تھوڑا صاف کر دو بہت گندہ ہو گیا ہے۔ زبیدہ لیٹی ہوئی تھی جب ملیمہ پیچھے آئی۔ آج انکا بلڈ پریشر صبح سے ہائی تھا۔

خالہ رومی بھائی تو اپنا کمرہ خود صاف کرتے ہیں۔ ملیمہ نے یاد دلایا۔
ہاں خود کرتا ہے لیکن آج کل بہت مصروف ہے تو وقت بلکل نہیں ملا۔ آج صبح جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ امی تھوڑی سی صفائی کر دیں۔ زبیدہ نے کہا

اچھا خالہ میں تو ابھی کچن کا کام کر رہی ہوں۔ جی آئی ہے یونیورسٹی سے اسے کہتی ہوں۔۔۔
ارے نہیں بیٹا وہ بیچاری ابھی تھکی ہوئی آئی ہے۔ بس تم کام کرو میں صفائی کر دیتی ہوں۔ انہوں نے اسے روکا۔ انہیں وجہ سے بہت پیار تھا۔ انکے لاڈلے بیٹے کی دلہن جوتھی۔
لیکن وہ نہیں رکی۔

جی۔۔۔۔۔

جی۔۔۔۔۔ سیرھیوں میں جا کر اس نے آوازیں لگائی۔
کیا ہوا؟؟ وجہ۔ نے سیرھیوں کے دروازے میں آکر پوچھا
نیچے آؤ۔ اس نے حکم صادر کیا۔

خالہ کہہ رہی ہیں کہ رومی بھائی آج کہہ کر گئے ہیں کہ انکے کمرے کو کوئی صاف کر دے
تھوڑا سا کیونکہ وہ کئی دنوں سے خود نہیں کر پائے اور مصروفیت کی وجہ سے مستقبل قریب میں بھی کوئی امکان
نہیں ہے اور چونکہ خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں کچن میں مصروف ہوں تو تمہیں ایسے بلایا گیا ہے
کہ تم انکے کمرے کی حالت تھوڑی بہتر کر دو۔ ملیہ باتیں بنانے میں کافی ماہر تھی۔
خالہ میں؟؟؟ وہ سوالیہ نظروں سے خالہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بیبا یہ مٹی نے تمہیں بلایا ہے حالانکہ میں کہہ بھی رہی تھی کہ میں کر دوں گی۔ زبیدہ خالہ شرمندہ ہو گئی
لیکن خالہ آپ کیوں کریں گی۔ وجہی کر دے گی۔ ویسے بھی آج سے ایک مہینے بعد اسے اسی
کمرے میں ہی تو آنا ہے تو تب بھی صفائی تو کیا کرے گی نا۔ تو اب کرنے میں کیا مسئلہ ہے۔ سامنے بھی
ملیہ تھی۔

ملی بیبا تم تلک کر رہی ہو میری بیبی کو۔۔
میں تلک نہیں کر رہی لیکن آپ نہیں کر سکتی صفائی۔ جاؤ وجہی صفائی کر دو۔۔ وہ حکمیہ لہجے میں بولی۔
بیبا میں کر دوں گی نا۔ وہ ابھی تھکی ہوئی آئی ہے۔۔۔

خالہ میں کر دیتی ہوں۔ اور میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ یونیورسٹی سے آئے ہوئے تو گھنٹہ آرام
کر لیا میں نے۔ ملیہ نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن اسکے کچھ بولنے سے پہلے ہی وجہیہ بولی
اور اٹھ کر صارم کے کمرے کی طرف گئی۔ ملیہ کے چہرے پر شریہ مسکرا ہٹ تھی۔ وہ خالہ کے پاس بیٹھ
کر باتیں کرنے لگی

کمرے کی حالت واقعی اچھی نہیں تھی اور صارم جیسے نفاست پسند بندے کے کمرے کی ایسی حالت
واقعی اسکے مکین کی مصروفیت کا ثبوت دے رہی تھی۔ وجہیہ نے سب سے پہلے تو اسکا بستر صاف کیا، کمرے
کیا اور چھوٹی موٹی بے ترتیب چیزیں اپنی جگہ پر رکھ دیں۔ پھر سائڈ ٹیبل صاف کیا اور لیپ کی دھول
جھاڑی۔ دراز کھولی تو اس میں صارم کی ڈائری پڑی تھی۔ ایک لمحے کو اسکا دل کیا کہ پڑھ لے لیکن انگلی ہی
لمحے اسے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آئی۔ ڈائری اس نے پھر دراز میں رکھی اور دوبارہ صفائی کرنے لگی۔
صفائی ختم کرنے کے بعد اسکا ایک بار پھر دل کیا کہ وہ ڈائری پڑھ لے۔ آخر وہ کسی طرح تو کچھ سمجھ لے
صارم کو۔ اور اس بار وہ اپنی سوچ پر قابو نہیں پاسکی۔ سائڈ ٹیبل کی دراز سے ڈائری نکالی اور پڑھنے لگی۔

تاریخوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی عرصے سے ڈائری لکھتا رہا ہے لیکن وہ روزانہ ڈائری
نہیں لکھتا تھا۔ کبھی ڈائری کے صفحات کے اوپر لکھی ہوئی تاریخوں میں مہینوں کا وقفہ تھا تو کبھی کبھی کچھ دن
مسلل لکھی گئی تھی۔ ایک شعرا سے دو جگہ نظر آیا جسکا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ وہ اسکا پسندیدہ شعر ہے

اور ایک جگہ تو اسے خاصی محنت سے لکھا گیا تھا۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہاں سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آتی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

ارے یہ کیسا بات ہوئی بھلا کہ جان کی کوئی بات ہی نہیں۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے۔ وجہہ کو بدلکل

اچھا نہیں لگا۔۔

صفحے پلٹاتے ہوئے اچانک اسکی نظر ایک صفحے پر رک گئی۔ صفحے پر اور کچھ نہیں تھا۔ بس ایک تاریخ لکھی تھی اور اس تاریخ کے گرد مختلف رنگ کی لکیریں کھینچ کر اسے کافی سجایا گیا تھا اور وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر اچانک اسکے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ یہ تو وہی تاریخ تھی جس پر اسکی منگنی اور نکاح ہوا تھا۔ اس نے آگے صفحے پلٹائے۔ اور اس سے آگے اتنے زیادہ صفحے لکھے تو نہیں گئے تھے لیکن جتنے لکھے تھے ان میں زیادہ تر وجہہ کما تھے۔

دانیال آج مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں جو ہر وقت وجہہ کو سوچتا رہتا ہوں اسے بتا کیوں نہیں دیتا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ مجھے اس طرح اس سے اپنے جذبات چھپانے نہیں چاہئے۔ دانیال تو میرا تب سے دوست ہے جب ہم دونوں میٹرک میں تھے۔ اور وہ وجہہ کیلئے میری پسندیدگی اور محبت سے بھی واقف ہے۔ لیکن میں اسکے اس مشورے پر عمل نہیں کر سکتا۔ ابھی تو بس دو ہی مہینے رہتے ہیں پھر جب وہ میرے ساتھ ہوگی تو میں اسے سب بتا دوں گا۔ اسے پتا چل جائے گا کہ میں اسکے بارے میں کیا جذبات رکھتا ہوں اور وہ میرے لیے کتنی اہم ہے۔ کہتے ہیں کہ جذبات اگر سچے ہوں تو وہ خود بخود آشکار ہو جاتے ہیں، انہیں جتانے کی ضرورت نہیں ہوتی سو میں بھی اپنی سچائی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کب اور کیسے اس پر آشکار ہوتے ہیں۔

اس سے آگے کے صفحے پر تقریباً پندرہ سولہ دن بعد کی تاریخ تھی۔

آج صبح وہ مجھے ملی اور میں حیران رہ گیا کہ اللہ نے میری دعا ایسے قبول کر لی۔ میں نے تقریباً پندرہ دن سے اسے نہیں دیکھا۔ پہلے تو کبھی کبھی بات ہو جاتی تھی لیکن اب جب سے منگنی ہوئی ہے بات کرنا تو دور وہ تو میرے سامنے بھی نہیں آتی۔ اور میرا دل کرتا ہے کہ میں اسے دیکھوں تو سہی اور پھر میں نے کل رات کو دعا بھی کی تھی اور اللہ نے میری دعا اتنی جلدی سن بھی لی کہ آج صبح وہ نام دیکھے بغیر پیچھے آئی۔ جب میں جاگلنگ سے آیا تو وہ پودوں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

اسے میرا پھول دینا تو اچھا لگتا ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ میں اسے خود دیا کروں سو آج میں نے وہی کیا اور آج کے بعد ایسا ہی کروں گا تب تک جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی اور پھر اسے روز پھول

لا کر دیا کرونگا۔ وہ میری سنجیدگی اور کم کوئی سے ڈرتی ہے لیکن میں اس کے ساتھ بہت ساری باتیں کیا کرونگا۔۔۔۔

اس سے آگے کے صفحے کی تاریخ بھی تقریباً پندرہ سولہ دن بعد کی تھی۔ اور وہ ڈائری میں لکھا ہوا آخری صفحہ تھا۔ اس دن کا حال جب امی، وجیہہ، ملیہ اور زبیدہ خالہ صادم کے ساتھ شادی کی سٹاپنگ کرنے گئیں تھیں۔ لیکن ابھی اس نے دولائیں ہی پڑھی تھی کہ باہر سے ملیہ اسے پکارتی ہوئی آئی۔ اس نے جلدی سے ڈائری دراز میں رکھی اور اٹھ کر الماری کی صفائی کرنے لگی۔

الماری کے اندر دوسری چیزوں کے ساتھ ایک بک فریم بھی رکھا تھا جس میں ایک طرف تو صادم کی تصویر لگی تھی لیکن دوسری طرف کا فریم خالی تھا۔ وجیہہ کے دل نے صاف گواہی دی کہ فریم میں خالی جگہ اسی کی تصویر کیلئے ہے۔ صادم کی تصویر پر پڑی دھول ہٹا کر اس نے کونے میں اسے دوبارہ رکھا اور باقی صفائی کر کے الماری بند کر دی۔

وجیہہ تھیں ایک راز کی بات بتاؤں؟؟ ملیہ جو صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اسے صفائی ختم کرتے دیکھ کر بولی۔

کیسی راز کی بات؟؟؟

جانتی ہو رومی بھائی کے اس ٹیبلٹ کا پاسورڈ کیا ہے؟؟ اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑے ٹیبلٹ کی طرف اشارہ کیا

نہیں۔۔۔۔۔ اسے حیرانگی ہوئی۔ بھلا پاسورڈ سے اس کا کیا تعلق

وجیہہ۔۔۔۔۔

جی۔۔۔۔۔۔۔

جی کی بچی میں کہہ رہی ہوں کہ ان کے اس ٹیبلٹ کا پاسورڈ وجیہہ ہے۔۔۔ وہ لفظ وجیہہ پر زور دے کر بولی۔

کیا؟؟؟؟؟؟؟ تمہیں کیسے پتا؟

اس دن جب میں رومی بھائی سے ان کی اکیڈمی کی تصویریں دکھانے کی ضد کر رہی تھی تو انہوں نے یہ ٹیبلٹ کھولا تھا۔ اچانک میری نظر پڑی تھی تو انہوں نے پاسورڈ میں لفظ ٹائپ کیا اور میرا نہیں خیال کہ اس گھر میں کسی اور کے نام میں کالا حقہ شامل ہے۔ اس نے مزے لے کر کافی تفصیلی جواب دیا۔

ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔

اگر ایسا نہیں ہے تو تم یہ ٹیلیٹ اٹھاؤ اور پاپا سوڑ ڈال کر دیکھ لو۔ کھولنے کے فوراً بعد بند کر دینا لیکن تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا اس لیے لگی شرط۔ ملیہ ٹک کر بولی اور اٹھ کر ٹیلیٹ اسکے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

اس نے آہستہ سے اسے کھولا اور پاپا سوڑ کے خانے میں اپنا نام ٹائپ کرنے پر واقعی ٹیلیٹ کھل گیا تھا۔ ملیہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ سچی بات ہوئی تھی۔

وجی۔۔۔۔۔ خیالوں میں کھوئی وجیہ۔ اسکی آواز پر چونکی۔

وجی میں تم سے تھوڑی سی چھوٹی ضرور ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ رومی بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس وقت جب نکاح کے علاوہ وہ تمہاری زندگی کے کسی بھی پہلو میں شامل نہیں ہیں انہوں نے تمہیں اس حد تک اپنی زندگی میں شامل کر دیا ہے۔۔

ملیہ ہانڈی کے پکنے کی آواز سن کر پکن کی طرف بھاگی اور وجیہ۔ وہاں سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ وہ بھی تو دل کی گہرائی سے اس کم کو اور سنجیدہ کیپشن صارم کو پسند کرتی تھی اور یہ آج کی بات نہیں تھی۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے جذبات سے بے خبر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ صارم سوچتا تھا کہ وجیہ۔ بے خبر ہے اس کے جذبات سے اور وجیہ۔ کا خیال تھا کہ صارم اس سے بے خبر ہے۔ دونوں ہی بے خبر تھے ایک دوسرے کی محبت سے اور دونوں ہی باخبر تھے اپنے اپنے جذبات سے۔۔۔۔۔۔۔

جیہا تم نے پچھلے چار سال سے میری بات نہیں مانی۔ میں نے کوشش کی کہ تمہیں اس راستے پر نہ چلنے دوں لیکن ناکام رہا۔۔

لیکن قاری صاحب میں نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں؟؟؟

شام کی نماز کیلئے وہ مسجد میں آیا تھا تو قاری ادریس سے بھی ملا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس سے محبت سے ملے اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اسے روکنے اور واپس لانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور اب تو اسکے خیالات کی تبدیلی سے فضل بھی پریشان ہو گیا تھا۔

تم نے ایسا کچھ نہیں کیا رحمت لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ایسا کچھ کر لو گے۔۔

میں ایسا کچھ نہیں کروں گا قاری صاحب۔ ہمیں اچھے کی تعلیم دی جاتی ہے، برے کی نہیں اور برے کو روکنا صرف ہمارا نہیں آپ کا بھی فرض ہے۔ وہ اپنی تربیت کے مطابق بول رہا تھا۔

اور یہی تو میں نہیں چاہتا رحمت کہ تم اپنے علاوہ سب کو غلط سمجھو۔ وہ سمجھ گئے تھے۔

میں اپنے علاوہ سب کو نہیں بلکہ صرف غلط کو غلط سمجھتا ہوں۔ اور غلط کو غلط ہی سمجھنا چاہئے قاری صاحب۔۔

ٹھیک ہے بیٹا غلط کو غلط سمجھنا چاہئے لیکن غلط کو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری نہیں اٹھانی چاہئے۔ کبھی کبھی انسان اسی چکر میں بہت کچھ غلط کر لیتا ہے۔ وہ پتا نہیں کیا سمجھنا چاہ رہے تھے۔۔۔

قاری صاحب اگر اللہ طاقت دے تو ٹھیک کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے نا۔ غلط سمجھنا تو ایمان کا سب سے کم ترین درجہ ہے۔۔۔ وہ بحث میں بہت آگے تک آ گیا تھا۔

اور تم اپنے ایمان کو بلند درجے پر سمجھتے ہو؟؟؟ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔ کیسے سمجھائیں اور کیسے روکیں اسے۔۔۔

تم بہت غلط رستے پر چل نکلے ہو رحمت۔ بہت غلط رستے پر۔ وہ بہت مشکل سے یہی بول پائے۔

میں غلط رستے پر نہیں ہوں قاری صاحب۔ جو غلط ہے وہ غلط ہے۔

کیا غلط ہے؟؟؟؟ وہ پوچھ بیٹھے۔ جاننا چاہتے تھے کہ اسکے دماغ میں کیا تھا۔

قاری صاحب آج کل سب ہی غلط ہے۔

تو غلط سے روکنا۔ سمجھا کر، تبلیغ کر کے، کسی کو مارنا تو غلط کا علاج نہیں ہے نا۔

قاری صاحب ہم تبلیغ ہی تو کرتے ہیں۔ لوگوں کو سمجھاتے ہی تو ہیں۔ کسی کو مار نہیں رہے ہم۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

کسی کو مارنا بھی مت رحمت اللہ۔ کسی کی زندگی کا اختیار اللہ تمہیں کبھی نہیں دیتا۔ وہ کسی غیر مرنی نقطے کو گھورتے ہوئے بولے۔

ٹھیک ہے قاری صاحب آپ فکر نہ کریں۔ اب چلتا ہوں۔ وہ اٹھ گیا۔

اللہ حافظ۔۔۔۔

قاری ادیس اسے جاتے ہوئے دیکھے رہے تھے۔ آج انکے سامنے ہارون پھر اٹھ کھڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ دل کی گہرائی سے اسے روکنا چاہتے تھے لیکن آج ایک بار پھر وہ بے بس تھے۔ بس ایک دعا تھی جو انکے دل سے جاری تھی۔ اور لبوں سے بھی نکل رہی تھی۔۔۔

خدا یا اسے سیدھے رستے پر رکھ۔۔۔ کھلو ما بننے سے بچائے رکھنا۔ آمین۔۔۔۔

حیدر۔ تمہارا اصل نام علی حیدر ہے؟؟؟ اس صبح میدان کے چکر کاٹنے کا ٹٹے اس نے اچانک پوچھا۔

کیا مطلب؟؟؟ اس نے حیران ہو کر پوچھا

مطلب یہ کہ تمہارا اصل نام کیا ہے؟؟ اس نے دوسرے الفاظ میں اپنی بات دہرائی۔
حکمت علی۔۔ وہ آہستہ سے بولا۔

کیا؟؟؟؟ تمہارا نام بھی بدل دیا گیا ہے؟؟؟ وہ بہت حیران ہو کر بولا۔
 بھیجی سے کیا مطلب ہے تمہارا مجاہد؟؟؟ وہ بھی حیران تھا
 میرا نام بھی مجاہد نہیں تھا۔۔۔

رحمت اللہ نام رکھا تھا ماں باپ نے۔۔

رحمت اللہ؟؟؟

ہاں۔۔۔ ایک لفظی جواب دیا گیا۔

لیکن نام کیوں بد لا گیا؟؟؟ سوال دونوں کے ذہنوں میں تھا لیکن زبان پر حیدر کے آیا۔

اور صرف ہمارا ہی بد لا گیا یا کسی اور کا بھی؟؟؟ اب سوال مجاہد کی طرف سے تھا۔

نام بدلے جانے کے حوالے سے سینکڑوں سوال ان دونوں کے ذہنوں میں تھے لیکن جواب کسی ایک کا بھی نہیں تھا۔۔۔

پتا کرنا یڑے گا۔ اور اپنی سیروہادھرا دھوری چھوڑ کر بدر سے واپس آ گئے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر انہیں پتا چل گیا تھا کہ اس کمرے میں موجود پانچ کے پانچ لڑکوں کے نام وہ نہیں تھے جن سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سیف اللہ کا اصل نام خالد تھا، شریف کو عمر فاروق کہتے تھے۔ رحیم گل امیر حمزہ کا نام تھا۔ حکمت علی، علی حیدر تھا اور مجاہد اللہ کا اصل نام رحمت اللہ تھا۔

سب ایک دوسرے کے اصلی نام اور بدلے ہوئے نام سن کر حیران رہ گئے۔ شام تک انہوں نے بدر سے میں باقی لڑکوں سے بھی کسی نہ کسی بہانے سے پوچھ لیا۔ کچھ لڑکوں نے تو ایسے گھور کراچی طرف دیکھا جیسے انکی ذہنی حالت پر شبہ کر رہے ہوں۔

لیکن وہ جان گئے کہ مدرسے میں ان پانچویں کے علاوہ بھی کچھ لڑکوں کے ساتھ تبدیلی کیے گئے تھے۔ لیکن وہ حیران تھے کہ کچھ تبدیلی کرنے پر کچھ کرنے کے پیچھے وجہ کیا ہے؟

قاری صاحب کل باتوں باتوں میں ہمیں پتا چلا کہ ہم سب کے نام وہ نہیں ہیں جن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ہم سب کے نام آپ نے تبدیل کیے ہیں پھر ہم نے سوچا کہ شاید اس مدرسے کا قانون یہی ہے لیکن باقی لڑکوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ ہمارے علاوہ چند ایک لڑکوں کے ہی نام تبدیل کئے گئے ہیں۔۔۔

دوسرے دن درس شروع ہوتے ہی رحیم گل عرف امیر حمزہ نے پوچھا۔۔۔
قاری ثناء اللہ بنے۔ اپنی دانست میں تو حمزہ نے کافی بڑا انکشاف کیا تھا لیکن ادھر تو ایسا لگ رہا تھا کہ
وہ اسی سوال کے انتظار میں تھے۔

ہاں بچے ٹھیک پتا چلا ہے تمہیں۔ نام بدلے گئے کیوں کہ ہمارے ہی ﷺ کا فرمان ہے کہ نام
کا بڑا اثر ہوتا ہے اور ہم کافی دنوں سے اسی سوال کے انتظار میں تھے لیکن آپ نے بڑی دیر کر دی بچے
لیکن چلو اچھا ہوا کہ آپ کو پتا چل گیا۔۔۔

ہم؟؟؟؟؟ وہ سب یک زبان بولے۔

ہاں ہم سب اور بڑے مولانا صاحب۔۔۔

بڑے مولانا صاحب؟؟؟؟؟ لیکن اس سے انکا کیا تعلق؟؟؟ نام تو آپ نے رکھے ہیں۔ عمر فاروق
بولے۔

مجھے آپ سے اس بارے میں اکیلے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے آپ کو انتظار کرنا
پڑے گا بڑے مولانا صاحب کا۔ قاری ثناء اللہ بولے۔

لیکن ہمیں کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا قاری صاحب۔۔۔ سیف اللہ بولا۔۔۔

بے صبرے کیوں ہوئے جاتے ہو بچے۔ سب سمجھ میں آجائے گا بس تھوڑا سا انتظار کرو۔ وہ اٹھ
کر چلے گئے۔

مولانا صاحب کی باتوں نے انہیں مزید الجھا دیا تھا۔ کوئی معمہ سا تھا جسکا کوئی سرا سمجھ نہیں
آ رہا تھا لیکن انہیں بڑے مولانا صاحب کا انتظار کرنے کی تلقین کی گئی تھی سو وہ بے صبری سے اب جمعے
کا انتظار کرنے لگے۔۔۔

السلام وعلیکم پاپا کیسے ہیں آپ؟؟؟؟

میں ٹھیک ہوں بیٹا آپ کیسے ہو؟ ماما کیسی ہیں؟؟

پاپا میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن ماما کی طبیعت تین دنوں سے تھوڑی خراب ہے۔۔۔

کیوں کیا ہوا بیٹا؟؟؟ وہ پریشان ہوئے۔۔۔

پاپا کچھ ہوا تو نہیں لیکن بخار تھا۔۔۔

شعبہ بیٹا پاپا کو کیوں بتایا؟؟؟ اپنے کمرے سے لاؤنج کی طرف آتی عائشہ نے اسکی باتیں سن کر
آواز لگائی۔

پاپا مجھے سوئمنگ نہیں آتی۔ یا نہیں ہے آپ کو۔ آپ نے کہا تھا کہ میں ابھی چھوٹا ہوں، بڑا ہو کر سیکھ لوں گا۔۔۔

اچھا تو مطلب وہ پھول بھی چھوٹے تھے اس لیے انہیں بھی سوئمنگ نہیں آتی تھی؟؟؟؟ وہ بہت خوش لگ رہے تھے اپنے بیٹے کے ساتھ۔

چند ایک مزید باتیں کرنے کے بعد اس نے فون عا نشہ کو پکڑا دیا۔ اسکے بارے میں جان کر شاہنواز پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن عا نشہ جانتی تھی کہ اسے کیسے سمجھانا ہے۔ پچھلے ایک سال سے اسکی ڈیوٹی سرحد پر تھی اور تب سے وہ یہی تو کرتی آرہی تھی۔

ماما آپ بھی پیئیں۔ رات کو عا نشہ اسکے لیے دودھ کا گلاس لائی تو وہ بولا۔۔۔

بیٹا یہ آپ کے لیے بنایا ہے۔ پی لوں گا۔

ماما پاپا کہہ رہے تھے کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتا اس لیے آپ پیار ہو گئی ہیں۔ وہ اسے اپنے باپ کے ساتھ ہونے باتیں بتا رہا تھا۔

آپ کے پاپا کو نہیں پتا بیٹا کہ شہر اپنی ماما کا کتنا خیال رکھتا ہے۔۔۔

ماما آپ میری وجہ سے پیار نہیں ہوئی؟؟؟ فرشتوں کی سی معصومیت سے کہی گئی بات پر عا نشہ کو اس پر اتنا پیار آیا کہ اسے بھیج کر اپنے سینے سے لگا لیا۔۔۔

نہیں بیٹا۔ آپ کے پاپا کو غلط لگا اور دیکھو اب تو ماما بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر شہر خیال نہ رکھتا ہوتا تو ماما ٹھیک کیسے ہوتی۔

وہ اسے بہلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس لیے دودھ کا گلاس اسکے سامنے کر دیا۔

ایک منٹ ماما۔ وہ بھاگتا ہوا باہر گیا

اور چند لمحوں بعد واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں ایک اور گلاس تھا۔۔۔ وہ حیرانی اور محبت سے اسے دیکھنے لگی۔

ماما ہم دونوں ہاف پیئیں گے۔۔۔

اور عا نشہ خاموشی سے اسکے ہاتھ سے گلاس لے کر چند گھونٹ اس میں ڈال کر آہستہ آہستہ پینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بات جب اسکے دماغ میں بیٹھ گئی ہے تو اب اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ویسے دودھ اسے پسند نہیں تھا۔ اور اسی بات پر اکثر اسے شاہنواز سے بھی ڈانٹ پڑتی تھی لیکن آج وہ اپنے بیٹے کے ساتھ پی رہی تھی۔

تم سب آج نو بجے مسجد میں آ جانا۔ تمہارے سوالات کا جواب مل جائے گا تمہیں۔۔۔
کون دے گا جواب قاری صاحب؟؟

یہ ابھی جاننا ضروری نہیں ہے تم لوگوں کے لیے۔ خود ہی پتا چل جائے گا۔
رات کو وہ پورے نو بجے مسجد پہنچے۔ دری پر بیٹھے۔ انہیں انتظار کرنے کا کہا گیا۔ انتظار کرتے کرتے
وہ کافی تھک گئے تھے۔ گیارہ بجے سے کچھ ہی دیر بعد مولوی صلاح الدین نے آ کر انہیں بلایا اور انہیں
اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے انکے پیچھے چلنے لگے۔۔

مولوی صلاح الدین کے پیچھے چلتے چلتے وہ دائیں طرف بنے ان کمروں تک آ گئے جو انہوں نے
آج تک کھلے نہیں دیکھے تھے۔ حیرانی اور خاموشی سے وہ سب انکے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور انکی حیرت کی
انتہا نہ رہی جب ان کمروں میں سے ایک کے دروازے کو انہوں نے کھلا دیکھا۔ مولوی صاحب
سیدھا کمرے کے دروازے سے اندر چلے گئے۔ وہ لوگ دروازے تک پہنچ کر رک گئے۔
آ جاؤ اندر۔۔ انہوں نے اندر سے ہی آواز دی۔

وہ جھجکتے ہوئے کمرے میں چلے گئے لیکن وہ کمرہ نہیں تھا۔ دروازے سے داخل ہو کر ایک
تاریک سی اور بہت چھوٹی سی جگہ تھی جسکے ایک کونے میں ایک بڑا سا سوراخ بنا ہوا تھا۔ ایک کونے میں
ایک لائٹیں جل رہی تھی جو کمرے کے اندھیرے کو ہرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مولوی صاحب کے
پیچھے چلتے ہوئے وہ اس سوراخ تک آئے۔ وہاں پچھے کی طرف کچھ کچی سیڑھیاں بنی ہوئی تھی۔ مولوی
صاحب نے اترنے کیلئے قدم بڑھا دیے۔

مولوی صاحب کچھ بتا تو دیں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ امی حمزہ پیچھے سے بولا۔
مولوی صاحب نے بڑھتے قدم روک کر مڑ کر انکی طرف گھور کر دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک
تنبیہ تھی۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ پیچھے چلنے کو کہا ہے تو پیچھے چلو سوال نہیں۔ انکی نظروں سے خائف
ہو کر بغیر کچھ کہے وہ انکے پیچھے سیڑھیوں سے اترنے لگے۔۔
سیڑھیوں سے پچھے ایک بڑا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس میں مختلف سمتوں سے دروازے کھل رہے تھے
اور یہ کمرہ بالکل روشن تھا۔ جگہ جگہ بلب جل رہے تھے۔

یہ منظر ان سب کیلئے انتہائی حیران کن تھا۔ وہ سب مختلف سمتوں میں نظریں گھماتے ہوئے کمرے
کا جائزہ لے رہے تھے کہ مولوی صاحب نے ایک بار پھر مڑ کر ایک تنبیہی نظران پر ڈالی۔ وہ انکے پیچھے
چلنے لگے۔

وہ ایک دروازہ کھول کر اندر چلے گئے اور اپنے پیچھے انہیں آنے کا اشارہ کر گئے۔ وہ سب اندر داخل

ہوئے توجیرت کے ایک جھٹکے سے اچھل پڑے۔ بڑے مولانا صاحب وہاں ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پانچوں آنکھیں پھاڑے نہیں دیکھتے رہے۔

کیا ہوا بچے ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟؟؟ انکی نظروں کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا کر بولے۔۔۔
شرمندہ ہو کر وہ اپنی نظریں ہٹا کر پیچھے دیکھنے لگے۔
آؤ بیٹھو بچے۔ انہوں نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔
وہ سب جا کر انکے پاس زمیں پر بیٹھنے لگے۔۔۔

نہیں بچے نہیں۔ اوپر بیٹھو۔ انہوں نے سامنے پڑے ہوئے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔

انسانوں میں فرق نہیں ہونا چاہئے بچے۔ آپ اور میں ایک ہی آدم اور حوا کی اولاد ہیں پھر میں اوپر اور آپ پچھے کیسے بیٹھ سکتے ہو۔ اگر مجھے پچھے بیٹھنے میں گھٹنوں کی تکلیف نہ ہوتی تو ہم پچھے ہی بیٹھتے۔ آخر کو ہم اپنے نبی ﷺ سے زیادہ معزز اور مہترم تو نہیں ہیں نا۔ وہ ایک بار پھر اپنے منہ سے ان پر صور پھونکتے رہے تھے اور وہ سحر زدہ ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ بولے بغیر وہ انکی طرف دیکھتے جا رہے تھے۔۔۔

بچے مجھے قاری ثناء اللہ نے بتایا کہ آپ لوگوں کو اپنے ناموں کے حوالے سے کچھ شکوک و شبہات ہیں تو میں انہی کو دور کرنے آج آیا ہوں اور آپ کو بھی یہاں بلایا ہے۔۔۔

تو بچے آپ سب کے نام بدلنے کی کئی وجہیں ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ کہ ہمارے رسول ﷺ کافر مان ہے کہ نام ہمیشہ اچھا رکھو۔ نام کا انسان کی شخصیت پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں آپ کے یہاں آنے سے پہلے آپ کے اساتذہ سے پتا چلا کہ آپ سب اللہ کے دین کو پھیلانے میں ہماری مدد کر سکتے ہو اسلیے آپ سب کو یہاں پر سب پر ترجیح دی گئی۔ آپ کے دوستوں کو الگ اور آپ کو الگ پڑھایا گیا۔ اس کی وجہ صرف وہ امید ہے کہ آپ صحیح معنوں میں دین کی خدمت کریں گے۔

اپنے ساتھ رہنے والے سب دوستوں کو دیکھ لو۔ ہمیں پتا ہے کہ وہ سب فارغ ہو گئے تو اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دین کی روشنی پھیلایں گے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جہاں جہاں وہ جائیں گے وہاں وہاں دین کی اتنی بے حرمتی نہیں ہو رہی جتنی شہری علاقوں میں ہوتی ہیں۔ اور جہاں وہ نہیں پہنچ سکتے وہاں کیلئے اللہ نے آپ کو منتخب کیا ہے۔۔۔

لیکن قاری صاحب صرف ہمارے نام ہی بدلے گئے نا۔ مدرسے میں ہمارے علاوہ ایک دو طالبوں کا نام ہی بدلا گیا۔ یہ سمجھ نہیں آئی۔

مولانا صاحب کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔۔۔

ہاں بیٹے کیونکہ ہم سب کی کوشش تھی کہ نام کے اثر سے آپ سب میں وہ سب کچھ نہ سہی تو اسکا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور آجائے جو صرف اس نام سے جڑے انسان کا خاصہ تھا یا اس نام کے معنی کا خاصہ۔ عمر فاروق وہ انسان تھے جو راہ چلتے تو لوگ انکے رعب سے راستے سے ہٹ جاتے۔ علی حیدر کی تلوار چلتی تو کسی کافر کی گردن تک نہ پاتی اور امیر حمزہ جنہوں نے دین پر جان قربان کر دی۔ خالد کا اپنا نام بھی بالکل ٹھیک تھا لیکن ہم نے صرف اس میں ایک نام کا اضافہ کر دیا جو اس نام کے صحابی کو اللہ نے عنایت کیا تھا یعنی سیف اللہ اور مجاہد اللہ کا نام جو کہ رحمت اللہ تھا۔ براہ بھی نہیں تھا لیکن ہم نے ایسے بدل دیا کہ جو انسان دین کے لیے کام کرتا ہے جنت کرتا ہے اسے کم از کم نام کا خراج تو ملنا ہی چاہیے۔ سو یہی وجہیں ہیں آپکے نام بدلنے کی۔ اب بھی کوئی تجسس ہے؟؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

نہیں مولانا صاحب اب کوئی شک نہیں ہے۔ حمزہ بولا۔

ہمیں خوشی ہے کہ جس کام کیلئے آپ کو باقی موزوں نہیں لگے دین کی اسی خدمت کیلئے آپ نے ہمیں چنا ہے۔ سیف اللہ ساری گفتگو میں پہلی بار بولا۔

باقی سب نے بھی سر ہلا کر اسکی بات کی تائید کی۔۔۔

آپ کو ہم نے نہیں اللہ نے منتخب کیا ہے بیٹے۔ اور اللہ کی دی ہوئی ذمہ داری امانت ہوتی ہے۔ امانت اٹھانے کیلئے تیار ہو؟؟؟؟

مولانا صاحب آپ ہمیں اپنی اوقات کے مطابق ہر امتحان میں ثابت قدم پا کیٹے۔ مجاہد اللہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

مولانا صاحب نے نظر گھما کر سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ جیسے سب سے اس وعدے کی تائید چاہ رہے ہوں۔

اور سب نے سر ہلا کر انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا۔

دیکھو بیٹا اللہ نے آپ کو اس کام کیلئے منتخب کیا ہے جو بہت سے لوگوں کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ اس راستے میں موت کا ہر لمحہ خدشہ لگا رہے گا لیکن موت سے ڈرنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کی پہچان نہیں ہے۔ ایسے مومن کی پہچان تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ہرانا ہے۔ اور اگر نہ ہر اسکے تو شہید ہو کر اپنے محبوب رسول ﷺ کی شفاعت میں جنت کا حصول ہے۔ گویا دونوں صورتوں میں ایسا مسلمان فائدے میں رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے۔

اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ تو اللہ کی جو رحمت تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے ہو اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہر حال تم سب کو سمٹ کر اللہ ہی کی طرف

جانا ہے۔

اب ایسا مسلمان جو اپنے رسول ﷺ کی شفاعت نہیں چاہے گا وہ بد بخت ہی ہوگا۔۔۔
الفاظ نہیں تھے ایک میٹھارس تھا جو مولانا عبدالرحمان انکے کانوں میں اندیل رہے تھے۔ انہیں اپنی زندگی اور اپنی موت کے اس رخ کا آج پتا چل رہا تھا۔

کسی کو نصیحت کرنا بہت آسان ہے۔ یہ کوئی بھی کر سکتا ہے بچے اور اگر کسی کی قسمت میں اللہ نے ہدایت لکھی ہوتی ہے اور اسے مل جائے تو بہت خوشی کی بات ہے لیکن اصل کام تو وہ ہے جو ہر کوئی نہ کر پائے جو مشکل ہو لیکن پھر بھی کچھ بہادر اور خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ نے حوصلہ دیا ہوتا ہے اس کام کو مہم انجام دینے کا اور اللہ کے پاس ان بہادروں میں آپ کا بھی نام ہوگا۔

وہ سب نظریں زمین میں گاڑھے ہوئے تھے لیکن دل سب کے مولانا صاحب کی باتوں پر دھڑک رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے انہیں اپنے دین کی خدمت کیلئے کس اچھائی کے صلے میں منتخب کیا ہے۔

بیٹا آپ وہ کام کریں گے جو صحابہؓ نے کیا، جو اللہ کے محبوب رسول ﷺ نے کیا اور بہت خوشی اور محبت سے کیا۔ انہوں نے جنگیں لڑی دین کی سر بلندی کے لیے۔ اللہ کے دین کی بلندی اور اللہ کی خوشی انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے میری امت کی گرامی کا احساس نہ ہوتا تو ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ جہاد پر جانے میں بھی تامل نہ کرتا کیونکہ یہ بات مجھے از حد پسند ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں پھر اٹھایا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر اٹھایا جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔

مولوی صاحب آپ نے جو ہمیں اس دن نشا نہ باندھنے کا کہا تھا اور ہم میں سے کوئی اس بوتل کا نشا نہ نہیں باندھ سکا تھا۔۔۔

اس صبح وہ سبق پڑھنے کیلئے بیٹھے تھے تو نا قب نے بات شروع کی۔

ہاں تو۔۔۔۔۔؟؟ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔۔۔

مولوی صاحب رحمت کا نشا نہ بہت پکا ہے وہ ضرور باندھ لے گا۔ اس نے مختصر الفاظ میں کہا۔
تمہیں کیسے پتا؟؟ انہوں نے پھر پوچھا۔

ہم نے اسے دیکھا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ آپکے نشا نے کو ٹھیک سے باندھ دے گا۔

وہ خاموش رہے۔ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔۔

مولوی صاحب آپ بے شک اسکا امتحان لے لیں۔ اس بار رفیق بولا

انہوں نے اسکی طرف دیکھا اور پھر رحمت کی طرف جوا پنا سپارہ پڑھنے اور ساتھ میں ترجمہ یاد کرنے میں مصروف تھا۔ اور پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

سبق کا وقت ختم ہوا تو سب بچے جانے لگے۔ مولوی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ گویا وہ آج ہی اسکا امتحان لینا چاہتے تھے۔ وہ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب خود اٹھ کر انکے ساتھ صحن میں آ گئے۔

صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے ثاقب کو بلا کر کچھ کہا۔ وہ جا کر مدرسے کے ایک کونے میں پڑی ہوئی اینٹوں میں سے ایک اینٹ اٹھا لیا اور پھر مولوی صاحب کے مرضی کے مطابق اسے کچھ فاصلے پر رکھ دیا۔ وہ یہ سب ایسے کر رہا تھا جیسا سے پتا تھا کہ رحمت امتحان میں کامیاب ضرور ہوگا۔

اینٹ کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ رحمت کے پاس آیا جو مولوی صاحب کی بتائی ہوئی مخصوص جگہ پر کھڑا تھا۔ ثاقب کے ہاتھ میں ایک گول چھوٹا سا پتھر تھا جو اسنے رحمت کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے ہلکے سے اسکا ہاتھ دبایا اور اسکے اسی فعل سے رحمت کو جو پہلے اس طرح مولوی صاحب کے سامنے تھا اور ہارنے سے ڈر رہا تھا کو بہت حوصلہ ملا۔ کبھی کبھی کسی انسان کا بہت عام اور بے معنی سا فعل کسی اور کیلئے حوصلے باعث ثابت ہو جاتا ہے۔۔

دھیان سے کرنا رحمت۔ اسنے آہستہ سے کہا جو صرف رحمت نے سنا۔

وہ اس اینٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کافی دیر تک نٹا نہ باندھتا رہا۔ عام حالات میں وہ آرام سے پتھر پھینک دیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ قاری شہاب کے سامنے تھا اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ جو کھیل کھیل رہا تھا اس میں سب لڑکے ہار گئے تھے۔ اس نے غلیل سیدھا کیا اور کچھ دیر بعد چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں اس نے۔۔ ہار کے ڈر سے۔

لیکن پتھر سیدھا جا کر اینٹ پر لگا۔ ایک ٹھک کی آواز آئی اور اس نے ثاقب کے چہرے پر مسکراہٹ ابھرتے دیکھ لی۔ گویا پتھر نٹا نے پر لگا تھا اس نے قاری صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ غور سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ثاقب کو اپنے پاس بلا کر انہوں نے کچھ کہا اور ثاقب نے جا کر وہ اینٹ مزید تھوڑے سے فاصلے پر رکھ دیا اور کنکر دو بارہ لاکر اسکے ہاتھ میں خنما دیا۔

اس نے کچھ کہے بغیر دوبارہ نٹا نہ باندھ لیا۔ اس بار وہ ڈر نہیں رہا تھا۔ پہلی بار تو وہ کامیاب

ہو گیا تھا۔

اور اکثر پہلی کامیابی دوسری ناکامی کا خوف دل سے نکال دیتی ہے۔

اب اس نے کافی حوصلے سے نشا نہ باندھ کر غلیل چھوڑا۔ اور اس بار بھی اسکا نشا نہ بالکل ٹھیک لگا۔ پتھر سیدھا جا کر اینٹ پر لگا۔ اس نے قاری صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ بہت غور سے اسکی طرف دیکھ رہے تھے۔

مولوی صاحب کی ایماء پر ثاقب نے ایک بار پھر اینٹ کا فاصلہ بڑھا دیا اور پتھر لا کر اسے ٹھما دیا۔ اس نے ہنستے ہوئے پکڑا اور دوبارہ نشا نہ باندھنا شروع کیا۔ اس بار اسکے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ پتھر ہوا کا سینہ چیرتا ہوا ایک بار پھر ٹھک کی آواز کے ساتھ اینٹ پر جا لگا اور ایک فاتحانہ مسکراہٹ اسکے چہرے پر رقصاں ہوئی۔

مولوی صاحب تو گویا یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اسکا نشا نہ کس فاصلے پر جا کر چوکتا ہے۔ سوانہوں نے اینٹ کا فاصلہ مزید بڑھا دیا اور اس بار نشا نہ واقعی چوک گیا۔

مولوی صاحب نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر اندر چلے گئے۔
تو گویا رحمت اللہ مولوی شہاب سے جیت چکا تھا۔ ثاقب بھاگتا ہوا آیا اور اسکے گلے لگ گیا۔ اسکے پیچھے انکے باقی دوست بھی قریب آئے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔
اور اس دن رحمت اللہ اور مولوی شہاب اسکی خداداد صلاحیت کے بارے میں جان گئے تھے۔

امی آپ کو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آرام کر لیں پھر بھی آپ صفائی کرنے میں لگی ہوئی ہیں؟؟؟؟
سکول سے آکر اس نے اپنی ماں کو کام میں جتا دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا اور جا کر ماں کے ہاتھ سے جھاڑو لے لیا۔

بیٹا میں کوئی نصیحتن والا کام نہیں کر رہی۔ یہ تو بس ویسے ہی لیٹے لیٹے تنگ ہو گئی تو۔۔۔۔۔۔
مجھے پتا ہے امی آپ کوئی لیٹے لیٹے نہیں تھکی۔ بس آپ کو صفائی کی فکر ہے کہ گھر گندہ نہ ہو۔ وہ اپنی ماں کی فکر مندی کو جانتا تھا۔

اور امی آپ کو ابو نے بھی صبح کہا تھا کہ کوئی کام نہ کریں لیکن پھر بھی آپ اٹھ گئی ہیں۔۔۔ وہ اپنی ماں پر بہت ماض تھا۔

شاہدہ کو پچھلے کچھ دنوں سے بخار اور کمزوری ہو رہی تھی۔ کل احسان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی

اور اس نے ٹسٹ کیے تو ملیر یا بخار کا بتایا۔ دوائیاں دیں اور ساتھ میں آرام کرنے کا کہا لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ جیسے ہی بخار تھوڑا سا اتر آج صفائی کرنے اٹھ گئی۔

سبزی احسان نے کل رات ہی بنا کر فریج میں رکھ دی تھی۔ صبح کا ناشتہ بھی اسی نے تیار کیا۔ عام طور پر شاہدہ اسے گھر کا کوئی کام نہیں کہتی تھی۔ حتیٰ کہ سبزی بھی وہ فیصل کو اپنے ساتھ بازار لے جا کر لے آتی تھی لیکن اسکی بیماری کے دوران وہ اکثر گھر کا کام کر لیتا تھا اور بہت اچھے سے سنبھال بھی لیتا تھا۔ وہ شاہدہ کا بہت خیال کرتا تھا۔ زندگی میں اسکے پاس یہی چھوٹا سا خاندان ہی تو تھا۔ شاہدہ کا بخار اتر چکا تھا لیکن احسان اور فیصل نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ احسان نے ناشتہ بنایا تو فیصل نے اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو تیار کر لیا بچوں کو ناشتہ کروا کر اور سکول کیلئے تیار کر کے وہ خود بھی ٹیکسی لے کر نکل پڑا۔ شاہدہ کیلئے ناشتہ بنا کر اس نے میز پر رکھ لیا کہ وہ اٹھ کر کر لے۔

لیکن یہ کیا؟؟

فیصل سکول سے لوٹا تو وہ تو صفائی میں مشغول تھی۔ اپنی ماں پر اسے بے حد پیار آیا۔ وہ اسکا اور نعمان کا کمرہ صاف کر رہی تھی۔ لیکن پیار میں غصے کی ملاوٹ بھی تھی۔ آخر انہیں آرام کرنے سے اتنی چڑکیوں ہے؟؟

اسکے ہاتھ سے جھاڑو لے کر اس نے بستا اپنے بیڈ پر رکھا اور جھاڑو لگانے لگا۔ شاہدہ نے لپک کر اسکے ہاتھ سے جھاڑو لیا چاہا۔ اسکا بیٹا ابھی تھکا ہوا آیا تھا۔

امی میں کر رہا ہوں ما صفائی۔ آپ جا کر لیٹ جائیں۔ نومی اور شاہدہ آتے ہیں تو میں روٹیاں لے آؤں گا دکان سے۔۔

بیٹا جھاڑو دو مجھے کیا کر رہے ہو یہ؟؟ وہ ماریش ہو رہی تھی۔

آپ لیٹ جائیں امی۔ بس جھاڑو ابھی دومنٹ میں ہو جائے گی۔ وہ بھی اپنی ماں کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ یہاں سے اس نے چھوڑنا تھا اور وہاں سے شاہدہ نے اٹھا کر جھاڑو شروع کر دینی تھی۔

بیٹا تھکے ہوئے آئے ہو۔ چھوڑ دو۔

وہ خاموش رہا۔

اچھا بیٹا چھوڑ دو ابھی۔ میں نہیں لگا رہی۔ تم تھوڑی دیر سستا کر لگالینا پھر۔ وہ آخری ہتھیار سمجھ

کر ہوئی۔۔

نہیں امی۔ آپ نے ابھی پھر شروع کر دینی ہے۔ وہ جھاڑو دیتا رہا۔ نویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن سوچتا بہت بڑا تھا۔

ضروری نہیں کہ سب لوگ اپنی عمر کے مطابق سوچیں۔ کچھ لوگوں کو زندگی اپنے وقت سے پہلے سمجھ بوجھ دے دیتی ہے۔ اور فیصل علی خان ان میں سے ایک تھا۔ کبھی اپنے باپ سے وہ فرمائش نہیں کی جسکو پورا کرنے میں اس دن ان کی کمر دکھ جائے۔ کیوں کہ اپنی آمدنی میں خواہشات پوری کرنا اسکے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے کبھی کھلونا گاڑی یا کھلونا پستول کی فرمائش نہیں کی۔ کبھی ضد نہیں کی۔ اپنے دوستوں کو دیکھ کر اپنے باپ سے کبھی خوبصورت قلم کا تقاضا نہیں کیا۔

اپنے ماں باپ سے بے حد پیار کرنے والا فیصل علی خان اپنی عمر سے پہلے ہی اپنے ماں باپ کی مجبوریاں سمجھ چکا تھا۔۔

تقریباً دس منٹ میں اس نے جھاڑو لگا دیا۔ اس دوران نومی اور شا لوبھی آگئے۔ فیصل نے ہاتھ دھوئے اور اندر جا کر پیسے اٹھا لیے جو باپ نے اسے صبح دیے تھے دوپہر کو بازار سے روٹی لانے کیلئے۔ ویسے تو پیسے شاہدہ کے پاس ہوتے تھے لیکن احسان جانتا تھا کہ اگر شاہدہ کو پتا چلے گا تو وہ خود بنانے کی ضد کرے گی۔ سو اس نے فیصل کو پیسے دے دیے تھے۔۔

کہاں جا رہے ہو بیٹا؟؟؟ اسے کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر وہ بولی۔۔
امی روٹی لانے جا رہا ہوں۔۔

میں بنا رہی ہوں ما بیٹا۔ ابھی تو میں ٹھیک ہوں۔ دیکھو۔۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔۔
امی ابو نے کہا تھا کہ آپ نہ بنائیں۔ ویسے بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ چو۔ لپے کے سامنے پھر سے خراب ہو جائے گی۔ لیٹ جائیں آپ۔ اور اس نے جانے کیلئے قدم بڑھا دیے۔ وہ پیچھے سے بلا رہی تھی لیکن وہ نہیں رکا۔

بازار سے وہ روٹیاں لے کر آیا تو شاہدہ باورچی خانے میں کھڑی سبزی گرم کر رہی تھی جو احسان بنا کر گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی ماں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سالن گرم ہو گیا تو پلاٹ میں ڈال کر اور روٹیاں چنگیر میں رکھ کر اندر لے گیا۔

چلیں امی آجائیں۔ وہ جاتے ہوئے بولا۔۔
جاؤ شروع کرو تم لوگ میں آتی ہوں۔۔ وہ بولی۔
نہیں ماما۔ آپ ابھی چلیں ما۔ کھانے کے بعد آپ نے دوائی بھی کھانی ہے۔ وہ ضدی لہجے میں بولا۔

لے لو گی بیٹا دوائی لے لو گی۔ ابھی تو کافی بہتر ہوں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

وہ پانچوں پوری طرح مطمئن ہو چکے تھے۔ مولانا صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ کوئی انکی بات سے اختلاف نہیں کر پاتا تھا اور پھر وہ کوئی غلط بات بھی تو نہیں کرتے تھے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور ان کے دین سے انہیں محبت تھی۔ اور یہی محبت وہ دوسروں میں ڈالنا چاہتے تھے۔ تو بچے اگر دین کو آپ کی ضرورت ہوگی تو آپ قربانی دینے کیلئے تیار رہینگے؟؟ انہوں نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

جی مولانا صاحب۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی جان دے کر بھی اسلام کا پرچم بلند کرنے پر خوشی ہوگی۔ سیف اللہ بولا۔

مولانا صاحب خاموش رہے۔

اور ویسے بھی مرنا تو ایک دن سب نے ہے۔ پھر شہادت کی موت اور جہاد کی زندگی کیوں نہیں؟؟؟ مجاہد اللہ نے پر عزم لہجے میں کہا۔

شاہد میرے بچو! اس دین کو تم جیسے جوان اور پر جوش خون کی ضرورت ہے۔ ہم بوڑھے اب صرف بتا سکتے ہیں۔ کچھ کر نہیں سکتے۔ کرنا تم لوگوں نے ہے۔ اس دین کو بچانے اور رائج کرنے کی ذمہ داری اب تم لوگوں کی ہے۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولے۔

مولانا صاحب آپ ہمیں جو کہیں گے ہم کرنے کو تیار ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ اللہ رسول ﷺ اور دین سے کتنا پیار کرتے ہیں اور آپ کی ہدایات پر عمل کر کے ہم بھی جنت کا حصول ہی چاہتے ہیں۔۔۔ حیدر بولا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی بچوں کہ ہمیں تم لوگوں جیسے ہیرے ملے ہیں۔ اللہ خوش اور کامیاب کرے سب کو۔۔۔

انہوں نے آواز دے کر مولوی صلاح الدین کو بلایا۔ وہ آئے تو ان سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے واپسی کے راستے پر جانے لگے۔ انکی رہنمائی میں وہ تہ خانے سے نکل آئے۔۔۔ کسی کو اس تہ خانے کے بارے میں بتانا نہیں ہے۔ آگے چلتے ہوئے انہوں نے کہا۔ سن رہے ہوں۔ انکی خاموشی پر انہوں نے دوبارہ کہا۔

جی مولوی صاحب آپ فکر نہ کریں۔ اور وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

تمہیں واقعی اللہ نے بہت صلاحیت دی ہے رحمت۔ وہ سبق پڑھتے رحمت اللہ سے مخاطب ہوئے

۔ اس نے انکی طرف دیکھا۔ انکی نظروں میں واقعی ستائش تھی۔

تمہاری صلاحیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے اللہ تم سے بھی کوئی بڑا کام کروانا چاہتا ہے۔۔۔ وہ تیرہ چودہ سالہ لڑکا انکی پوری بات نہیں سمجھا لیکن جتنا سمجھا اسکے مطابق اسنے سر ہلا دیا۔

اب وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ لٹا نہ بازی کرتا تھا۔ یہ جیسے انکے لیے ایک کھیل بن گیا تھا۔

اسے یہاں آئے ہوئے دو سال ہونے کو تھے۔ وہ ترجمہ پڑھ چکا تھا اور تفسیر کچھ ہی رہتی تھی۔۔۔

رحمت بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تمہیں جو صلاحیت اللہ نے دی ہیں تمہیں اللہ ہی کیلئے انکا صحیح استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اب دیکھو اللہ نے تمہیں ایک بہت اچھا جسم دیا ہے، ایک بہت اچھا دماغ دیا ہے، ایک بہت اچھی صلاحیت دی ہے اور یا درکھو کہ جو کچھ بھی اللہ دیتا ہے وہ آخرت میں ان سب کا حساب لے گا۔ کہے گا تمہیں دماغ دیا تھا کیا کیا اسکے ساتھ؟ اتنا اچھا جسم دیا تھا اسکا میری راہ میں استعمال کیوں نہیں کیا؟ اور تجھے میں نے عام لوگوں سے بڑھ کر ایک صلاحیت عطا کی تھی اسکا کیا کیا؟ کیوں اسکو ضائع کیا؟ اسکو میری مرضی کے مطابق کیوں استعمال نہیں کیا؟

دیکھو بیٹا اللہ جو دیتا ہے وہ انسان کیلئے آزمائش ہی ہوتا ہے اور جو اللہ کی دی ہوئی آزمائش پر پورا اترتے ہیں انکے لیے اللہ کے پاس دینے کو بہت کچھ ہے اور اگر کوئی انکی دی ہوئی نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر انکی مرضی سے اختلاف کرے تو اسکے لیے کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنی مرضی مسلط کر دے۔ اللہ فرماتا ہے۔۔۔

ہوگا وہی جو میری چاہت ہے

تو ہونا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ تو بیٹا تم زندگی میں اپنی اس صلاحیت کو اللہ کی راہ میں استعمال کرنا۔ کسی ایسے لوگوں کا آلہ کار مت بننا جو اسلام اور انکی روح کو مخ کرنا چاہتے ہیں اور ایسے لوگ زندگی میں قدم قدم پر ملیں گے تمہیں لیکن کبھی کوئی ایسا بھی آئے گا تمہاری زندگی میں جسے اللہ نے بھیجا ہوگا تمہاری صلاحیت کا صحیح استعمال کرنے کیلئے بس تم دونوں میں پہچان کرنا سیکھ لیتا۔۔۔

قاری صاحب کی آدھی آدھی باتوں کو سمجھتے ہوئے وہ سب پر سر ہلا ہلا کر اپنی طرف سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پندرہ سال کا لڑکا اتنی مشکل باتیں آدھی آدھی ہی سمجھ سکتا تھا۔۔۔

وہ اپنی ماضی کی یادوں سے گھبرا کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن ماضی اسے بھاگنے نہیں دے رہا تھا۔ اسے کسی پل سکون نہیں مل رہا تھا اور جب کبھی وہ تنہا بیٹھتا تب ماضی ایک دم سے اسکے ذہن پر دھاوا بول کر اسے وقت سے بہت پیچھے لے جاتا اور ایسے وقت میں وہزید بے چین ہو جاتا۔۔۔۔۔

آج بھی اسکے ساتھ یہی جو رہا تھا۔ وہ سکون کی تلاش میں اسی پتھر کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا لیکن سکون کی بجائے وہ ماضی کے تھمر وکوں میں کھو گیا تھا۔۔۔

وہ ماضی جب وہ مجاہد اللہ نہیں بناتھا۔ صرف رحمت اللہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
مجاہد اللہ کا ماضی رحمت اللہ تھا۔

جیہا تم لوگ آج رات کو گیارہ بجے مسجد میں آ جانا۔ قاری ثناء اللہ نے عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان سے اس کیلے میں کہا۔۔۔

جی۔۔۔۔

لیکن دھیان رکھنا کہ کوئی دیکھ نہ لے اور گیارہ بجے سے پہلے بھی مت آنا۔۔۔
جی ٹھیک ہے۔۔۔

گیارہ بجتے ہی وہ اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ادھر ادھر دیکھا کیونکہ انہیں احتیاط کی ہی تاکید کی گئی تھی لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کمرے سے نکل کر دروازے کو ایسے بند کیا کہ باہر سے دیکھنے پر ایسا لگتا کہ وہ سب اندر سو رہے ہیں اور دروازہ اندر سے بند ہے۔ کہ اگر کوئی رات میں غسل خانے کے لیے نکلے تو انکے دروازے کو دیکھ کر انکی غیر موجودگی محسوس نہ کر لے۔

وہ آہستہ سے چلتے ہوئے مسجد پہنچے تو قاری ثناء اللہ کو اپنا انتظام کرتے ہوئے ہی پایا۔
آؤ بیچوں۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور انکے آگے چلتے ہوئے دوبارہ انہی دو کمروں کی جانب بڑھ گئے۔

وہ بھی انہیں کی تقلید کرتے ہوئے اسی جانب بڑھے۔ وہ سب بے آواز چل رہے تھے۔ کل والا کمرے کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ مولوی ثناء اللہ کے پیچھے چلتے ہوئے اسی بڑے کمرے میں آئے جہاں دوسرے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔

مولوی بلال وہی پر کھڑے تھے۔ گویا انہیں کا انتظار کر رہے تھے۔ کمرے میں آج بھی روشنی تھی۔ قاری ثناء اللہ اور مولوی بلال انہیں لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھے۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جس میں کل بیٹھ کر انہوں نے بڑے مولانا صاحب سے باتیں کی تھی۔

کمرے کے کونے میں ایک ڈھیر بڑا ہوا تھا جس پر ایک سفید رنگ کی چادر بڑی تھی۔۔

دیکھو بیٹے کل تم لوگوں کے یہاں سے جانے کے بعد مولانا صاحب نے ہمیں ہدایت کی کہ آپ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہو۔ آپ نے اللہ کی رضا اور دائمی جنت کو اس دنیا پر ترجیح

دینے کا ارادہ اور وعدہ کر لیا ہے۔ ایسا ہی ہے نہ بیٹے؟؟؟؟؟ انہوں نے تصدیق چاہی۔۔۔
جی قاری صاحب۔۔۔

تو بیٹا وہ آیت تو یاد ہوگی نا کہ اللہ نے فرمایا کہ کفار سے مقابلے کیلئے اپنے گھوڑوں کو تیار رکھو اور دوسری جگہ یہ کہ کفار سے قتال کرو حتیٰ کہ شرک کا فتنہ باقی نہ رہے۔ یاد ہے نا؟؟؟؟؟ انہوں نے پھر تصدیق چاہی۔

جی بالکل۔۔۔

تو قتال کیلئے صرف گھوڑوں کی ضرورت تو نہیں ہوتی نا اگر آپ کے پاس گھوڑے ہیں اور تلوار نہیں ہے تو آپ کچھ نہیں کر سکتے اور آج جبکہ تلوار کی جگہ پستول اور بندوق نے لے لی ہے تو اگر آپ کے پاس یہ نہیں ہوگا تو آپ جہاد اور قتال کر ہی نہیں سکتے۔ جہاد کیلئے سب سے پہلے اسلحے کا ہونا ضروری ہے۔۔۔ انہوں نے اپنی بات روک کر انکی طرف دیکھا۔ انہوں نے سر جھکا کر انکی بات کی تائید کی۔ مجاہد اللہ۔ جا کر چادر کے نیچے دیکھ لو۔ کچھ اسلحہ پڑا ہوا ہے جس کو آپ جہاد کی تیاری کیلئے جمع کیا گیا ذخیرہ کہہ سکتے ہو۔ وہ ڈرتے قدموں سے اس طرف بڑھا۔

ڈر موت بیٹا۔ موت کے فوراً بعد جنت کا حصول اتنا آسان نہیں ہے۔ بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں اور بہادر بننا پڑے گا آپکو۔ مولوی بلال نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ اسکے اندر زبکی سی کوند گئی۔ وہ جوش سے آگے بڑھا اور چادر ایک کونے سے پکڑ کر کھینچ لی۔ ان پانچوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اتنا اسلحہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا انہوں نے اگر زندگی میں کوئی اسلحہ دیکھا بھی تھا تو وہ صرف پستول ہی تھا۔ چادر کے پیچھے کوڈ کر ایک بڑی خندق سی بنائی گئی تھی جو پوری کی پوری اسلحے سے بھری ہوئی تھی اور اسکے اوپر کپڑا اس طرح ڈالا گیا تھا کہ کپڑا اٹھانے سے پہلے وہ گمان بھی نہیں کر سکے کہ اسکے پیچھے اتنا اسلحہ ہے۔۔۔

وہ سب حیران نظروں سے اسی خندق کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔

بیٹا میں نے ذکر کیا نا کہ یہ سب اسی سلسلے کی تیاری ہے کہ قتال کیلئے اپنے گھوڑے تیار رکھو۔۔۔ لیکن مولوی صاحب اتنا اسلحہ آیا کہاں سے؟؟؟؟؟ حمزہ نے پوچھ لیا۔

بیٹا جب انسان ارادہ کر لیتا ہے تو اللہ اسے کامیاب کرنے کیلئے وسائل بھی دے دیتا ہے۔ وہ خود انکی مدد کرتا ہے بس یہی سمجھ لو کہ ہمیں بھی یہ اللہ نے ہی دی ہے کہ جاؤ اور میری زمین پر میرے دین

کا بول بالا کر دو۔۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔

بیٹے ہم اپنی اوقات کے مطابق کر سکتے ہیں۔ کسی مقصد کا حصول ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں کوشش کرنا ہمارا فرض ہے سو وہ ہم کر رہے ہیں اور اسی کیلئے آپ سے مدد کے طلبگار ہیں۔ کیا پتا اللہ کو ہماری یہ کوشش ہی پسند آجائے۔۔

آپ حکم کریں قاری صاحب۔ ہم کچھ بھی کرنے کیلئے تیار ہیں عظیم مقصد کے حصول کیلئے۔
- عمر فاروق بولا۔

اور ہمارے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی کہ ہم کسی اچھے کام میں آپ کے شریک بنے ویسے بھی مرنا تو ہے ہی کسی دن۔ مجاہد نے اسی خندق کے پاس کھڑے کھڑے کہا۔

ہاں بیٹا زندگی میں اکثر لوگوں کو زندگی کے مقصد کی سمجھ بہت بعد میں آتی ہے جیسے ہمیں زندگی کے اس حصے میں سمجھ آئی جب اب ہم میں اسلحہ اٹھا کر لڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ اب جا کر سمجھ میں آیا ہے کہ شہادت کی موت میں کتنا سرور ہے جو دنیا کی کسی دوسری نعمت میں نہیں ہے لیکن اب شدید خواہش کے باوجود بھی عمر اور کمزوری اجازت نہیں دیتی۔۔

وہ لوگ غور سے انکی باتیں سن رہے تھے۔ انکی باتوں میں بلا کا جادو تھا جو کسی کو بھی اپنی گرفت میں جکڑ سکتا تھا۔ اور وہ تو پہلے سے ہی سحر زدہ تھے۔

لیکن پھر بھی ہم کوشش کرتے ہیں کہ کچھ ایسا کر جائیں جو اللہ کے سامنے شرمندگی سے بچالے۔ اللہ پوچھے کہ زندگی میں کیا کیا تو سر تو نہ جھکے۔ بس اسی کوشش میں ہم سب یہ کرتے ہیں۔

بیٹے ہمارے پاس کچھ اور اسلحہ بھی ہے وہ بھی اسی مقصد کیلئے ہے۔ چلو تم لوگوں کو دکھاتے ہیں وہ پانچوں انکے ساتھ دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں بھی اسی طرح کا ایک خندق کھودا گیا تھا اور اسی کمانڈر بھی ان کے اندازے سے زیادہ اسلحہ تھا۔ خندق میں مختلف قسموں کی بندوقیں تھیں۔

وہاں اس خندق کے پاس کھڑے کھڑے کوئی بھی انسان یہ بتا سکتا تھا کہ انکی تعداد ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ضرور تھیں۔

وہ سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

بیٹا یہ کلاشکوف ہے۔ پہلے ہمارے پاس نہیں ہوتے تھے اور دشمن کے پاس بے شمار تھے۔ ہم تلوار سے مارتے وہ دور سے گولی سے۔ اس ہتھیار سے ایک منٹ کے اندر راندر سو گولیاں ماری جاسکتی ہیں اب ہمارے مجاہدوں نے بھی اسکو بنانے کا طریقہ سیکھ لیا ہے تو یہ سب اسی علاقے میں بنی ہیں۔۔ وہ آہستہ

آہستہ بولتے رہے۔۔

چلو بیٹا آج کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ کچھ چیزیں اور بھی ہیں، وہ کل دیکھ لیں۔ آخر کو تم لوگوں نے ہی استعمال کرنی ہیں۔ ہم بوڑھے تو اب انہیں استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ بنے۔

لیکن مولوی صاحب ہمیں تو انہیں استعمال کرنا نہیں آتا بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم نے آج پہلی بار اتنا سلمہ دیکھا ہے۔ مجاہد نے کافی دیر سے ذہن میں پختہ سوال کو شکل دی۔۔

بیٹا آپ کو سکھایا جائے گا۔ سب سکھایا جائے گا۔ آپ کا مقصد صرف اسلام نافذ کرنا ہے، شہادت کی موت نہیں لیکن اس مقصد کے حصول کے دوران اگر شہادت نصیب ہوتی ہے تو اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہوگی۔ مولوی بلال نے اس کے شکوک کو سمجھتے ہوئے بڑے جامع انداز میں جواب دیا۔

چلو بیٹا اب چلتے ہیں۔ اور وہ انگوٹے کر اس کمرے سے اور پھر اس تہ خانے سے نکل آئے۔ مولوی صاحب مسجد کی طرف گئے اور وہ پانچوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

وہ کافی دیر تک اپنے اپنے بستروں میں بیٹھ کر تہ خانے میں پڑے سلمہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور کافی دیر بعد صبح جلدی اٹھنے کی وجہ سے سونے لیٹ گئے۔ یہ ان کے لیے حیران کن چیز تھی۔۔

اور صرف وہ رات نہیں اس سے اگلے دن بھی سارا دن ان کا موضوع بحث مدرسے کے تہ خانے میں پڑا وہ سلمہ تھا۔

رحمت اللہ کو مدرسے میں آئے ہوئے پانچ ماہ ہونے کو تھے۔ اس عرصے میں وہ اپنے ننانے کی وجہ سے سارے مدرسے میں مشہور ہو چکا تھا اور اب تو کوئی اس سے مقابلہ بھی نہیں کرتا تھا۔ تا قُب کے ساتھ انکی دوستی بہت پکی ہو چکی تھی۔ وہ ویسے بھی دوست بنانے میں ماہر تھا۔ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ دس سپارے پڑھ چکا تھا۔ آج جمعے کے دن ان کا درس ہو رہا تھا۔ پندرہ سال تک کے بچوں کو قاری شہاب درس دے رہے تھے اور ان سے بڑے لڑکوں کو مولانا جہانزیب۔

بچوں ہمارا ایمان ہے کہ زندگی ایک بار ہی ملی ہے اور اللہ نے ہمیں پیدا کیا اور وقت کے ساتھ شعور بھی دیا۔ اچھے برے اور صحیح غلط کی پہچان بھی دی۔ اور دنیا میں صحیح غلط رستے بھی بنائے۔ اپنی پسند اور نا پسند بھی بتا دی اور پھر ہمیں اختیار دے دیا کہ جاؤ تم نے جیسی زندگی گزارنی ہے گزار دو۔ میں تمہیں مہلت دیتا ہوں تمہاری آخری سانس تک۔ اپنے لیے جو راستہ چننا ہے چن لو لیکن اس آخری

سانس کے بعد کوئی مہلت نہیں ملے گی اور تم نہیں جان سکتے کہ تمہاری وہ آخری سانس کب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم جو سانس لے رہے ہو وہی تمہاری آخری ہوا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم جو سانس لے رہے ہو وہ پوری لے بھی نہ سکو اور ممکن یہ بھی ہے کہ تم اپنی کسی سانس کو آخری سمجھ رہے ہو اور اللہ کو اسکے بعد بھی تمہارے لیے ایک لمبی زندگی منظور ہو۔ اس نے صرف زندگی اور موت کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ پیدا ہونے پر کسی بھی انسان کا بس نہیں چلتا اور موت کو کوئی ٹال نہیں سکتا لیکن پہلی اور آخری سانس کے بیچ میں جو کرتا ہے وہ سارا اختیار اللہ نے بندے کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ لیکن اپنی پسند یا پسند بھی بتا دی ہے۔ اور ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کہ اس دنیا کے علاوہ اس نے ایک اور جہان بھی تخلیق کیا ہے جو صرف اس دنیا کے کیے پر سزا اور جزا کیلئے ہوگا۔ سواگر اسکی پسند پر چلو گے تو دوسرے جہان میں وہ بہت بڑا انعام دے گا۔ اور اگر اسکی نہیں مانو گے تو وہ سزا دے گا۔

کسی انسان کا بس نہیں چلتا کہ وہ کہاں جہنم لیتا ہے اور کس دین پر جنم لیتا ہے اور اس پر اللہ نے سزا دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن شعور کی منزل پر پہنچ کر بھی اگر کوئی اسکی پسند پر نہ چلے تو پھر سزا اور عذاب دینے کا وعدہ بھی وہ کر چکا ہے گویا لا شعوری طور پر کی گئی غلطی کی سزا وہ نہیں دیتا لیکن شعوری غلطی پر سزا ضرور دے گا۔

کوئی اسکے پسندیدہ مذہب پر پیدا نہیں ہوتا وہ اس پر سزا نہیں دے گا لیکن کسی کی موت اسکے پسندیدہ مذہب پر نہیں ہوتی اس پر وہ سزا ضرور دے گا کیونکہ اس نے آزادی دی ہے اور بتا بھی دیا ہے کہ اسکی پسند کیا ہے۔

اور پھر اس نے صرف مذہب میں ہونے یا نہ ہونے کی بات بھی نہیں کی۔ جب کچھ لوگ اسکے پسندیدہ مذہب پر ہوں اور وہ سارے ہی مسلمان مریں تو پھر فیصلہ اس پر ہوگا کہ کس نے زندگی اسکی پسند پر گزاری اور کون اسکے پسندیدہ طریقے پر مرا اور مومن کی موت کیلئے اللہ کا پسندیدہ طریقہ شہادت ہی ہے۔

جب اسکے دین میں داخل ہو گئے تو وہ کچھ فرض اپنی ذات اور کچھ اپنے دین کے حوالے سے فرض کرتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا۔۔

مسلمانوں تم پر اللہ کی راہ میں لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں ناکوار تو ہوگا لیکن عجب نہیں کہ کوئی چیز تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور کوئی چیز تمہیں اچھی لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر نہ ہو۔

البقرہ: ۲۱۴

تو ہم مسلمانوں پر فرض کیا گیا کہ جہاں بھی برائی دیکھیں اسکے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ سب سے

پہلے اسے زور بازو سے روکیں۔ نہ ہو سکے تو کلام سے اور اگر اس سے سمجھے جاؤ گے تو ایمان کا کوئی مضبوط اور اللہ کا پسندیدہ درجہ رہ نہیں جائے گا۔

التوبہ

تو دنیا زندگی میں ایک بار مرنا تو سب کو ہے۔ وہ امیر ہے یا غریب، خوبصورت یا بد صورت، موت کا ذائقہ سب کو چکنا ہے۔ کسی کی کوئی صلاحیت اسے موت سے نہیں بچا سکتی اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ سب بھی تو اللہ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہی اسے اللہ کی دی ہوئی موت سے بچالے۔

تو اگر زندگی کا انجام موت ہی ہوتا ہے تو ویسی موت کیوں نہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو۔ اور وہ موت صرف اور صرف شہادت کی موت۔۔

بیٹے آج بھی آجائے لوگ سمجھے تہہ خانے میں گیا رہ بجے۔۔

تہہ خانے میں یا مسجد میں قاری صاحب؟؟؟ عمر نے پوچھا۔

بچے اب آپ لوگ ہمارے لیے بہت خاص ہو۔ آپ پر اعتبار کرتے ہیں ہم۔ اس لیے احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں رہی اب انہوں نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

رات کے گیا رہ بجے وہ لوگ ایک بار پھر اسی انداز میں اپنی اپنی چادریں لپیٹ کر نکلے۔ ادھر ادھر کا اندازہ لگایا اور احتیاط سے دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے برآمدے پر نگاہ دوڑائی لیکن اس سردی میں بے وجہ نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اندھیرے کی دبیز چادریں وہ پانچوں تہہ خانے کی طرف گئے۔ آج وہ اکیلے تھے۔

وہاں پہنچے تو دروازہ انہیں کھلا ہی ملا۔ شاید انکے لیے ہی کھلا رکھا گیا تھا۔ مجاہد نے تھوڑا سا دھکیلا تو کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک کونے میں ایک لائٹننگ بکلی سی جل رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انکا انتظار کیا جا رہا تھا۔

سیڑھیوں سے اتر کر وہ اسی کمرے میں جا پہنچے جس میں باقی سارے دروازے کھلتے تھے۔ سیڑھیوں کے پاس ہی زمین پر ایک چٹائی پر مولوی ثناء اللہ اور مولوی صلاح الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ انکو سیڑھیوں سے اترنا دیکھ کر انہوں نے چٹائی پر انکے لیے جگہ خالی کی۔۔۔

آ جاؤ جوانوں۔۔ مولوی صلاح الدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ پانچوں جا کر انکے پاس چٹائی پر بیٹھ گئے۔۔

ہاں بیٹا۔ یہ بتاؤ جوکل دیکھا تھا اسکے بارے میں کیا خیال ہے؟؟؟؟؟ مولوی ثناء اللہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ حیرانی سے انکی طرف دیکھنے لگے۔۔

بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ کل جو دیکھا اس سے ڈرے تو نہیں؟؟ اسے استعمال کرو گے اگر ہم استعمال کرنا سکھا دیں تو؟؟

قاری صاحب بالکل بھی نہیں ڈرے۔ اور جب ہمیں پتا ہے کہ ہمارے دین کو اس وقت ضرورت ہے تو جہاں ضرورت ہوگی ہم ضرور استعمال کریں گے۔ حمزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ باقیوں نے سر ہلا کر تائید کی۔

ستاباش بس ایسے ہی رہنا۔ ایسے ہی جذبے اور جوش کی ضرورت ہے اس وقت۔ اللہ آپ کے ارادوں میں پختگی دے۔ انہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

چلو بچو آج آپ کو جہاد کیلئے کچھ اور سامان دکھاتے ہیں۔ مولوی صلاح الدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ سب بھی اٹھ گئے۔

ان دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے وہ کسی اور کمرے میں آ گئے۔ اس میں وہ کل نہیں گئے تھے لیکن بغیر دیکھے بھی پتا چل رہا تھا کہ یہ کمرہ بھی بالکل باقی کمروں ہی کی طرح ہے۔ اس کمرے میں بھی بیچ میں ایک سفید چادر بچھائی گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس چادر کے نیچے ایک خندق ہوگی اور اس خندق میں اسلحہ۔ مجاہد نے مولوی ثناء

اللہ کی طرف دیکھا اور اسٹارہ پا کر اس چادر کی طرف بڑھ گیا اور ایک ہی بار میں کھینچ کر اسے سمیٹ لیا۔

اند ر بے شمار بندوقیں پڑی تھیں لیکن یہ ویسی نہیں تھیں جیسے انہوں نے کل دیکھی تھی۔ وہ اسی سلعے کو دیکھ رہے تھے۔۔

بیٹا یہ مختلف قسم کی بندوقیں ہیں۔ گوروں کی زبان میں اسے سنا پڑ کہا جاتا ہے۔ اور یہ جواسکے اوپر لگی ہیں یہ دور نہیں ہیں۔ اس بندوق سے آپ بہت دور سے بھی دشمن کا نشانہ لے سکتے ہیں۔ انہوں نے اس عجیب قسم کی بندوق کا تعارف کروایا۔

قاری صاحب یہ کہاں سے آئی؟؟؟؟؟ سیف اللہ نے سوال کیا

بتاتا ہوں بیٹا۔ بس ایک کمرہ رہتا ہے وہ بھی دیکھ لو تو اسکے بعد جتنا پوچھتا ہے پوچھ لیتا۔ میں سب بتاؤنگا۔ انہوں نے دوسرے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

انہیں جانا دیکھ کر مجاہد نے کپڑا اس خندق کے اوپر ڈالا اور انکے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں

بھی ویسا ہی سب کچھ تھا۔ کمرے کے بیچ میں کپڑا تھا جسے قاری صاحب نے خود آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔
اس خندق میں انہیں دور سے کھڑے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ قریب گئے تو خندق میں پڑے بہت
سارے گولے انہیں نظر آئے۔

یہ کیا ہے قاری صاحب؟؟؟ حمزہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

اسے ہم کہتے ہیں جیٹا بم۔

بم؟؟؟؟ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ بم کا نام انہوں نے بھی سنا تھا لیکن آج پہلی دفعہ دیکھ رہے
تھے۔

ہاں جیٹا یہ بم ہے اور ہمارے جانباز مجاہدین اسے تب استعمال کرتے ہیں جب انہیں لگے کہ دشمن
کی تعداد انکے مقابلے میں بہت زیادہ ہے یا پھر وہ لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو جائیں اور موت سامنے
دکھائی دے رہی ہو تو بے بسی کی موت سے بہتر ہم دشمن کو نقصان پہنچا کر مرنا سمجھتے ہیں تو اپنے جسم کو اس بم
سے اڑا کر روح کو جنت دے دیتے ہیں اور دشمن کو شدید نقصان۔ جسے وہ برسوں تک پورا کرنے کی کوشش
کرتا ہے۔

قاری صاحب یہ کہاں سے آیا ہے؟؟؟ سیف اللہ نے اپنا سوال دہرایا

جیٹا جب دشمن کے پاس ایسے ہی ہتھیار تھے اور ہمارے مجاہدین کے پاس عام استعمال کے ہتھیار
تھے تو ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ ہمارے سینکڑوں مجاہدین شہید ہوتے تھے تو دشمن کا کوئی ایک بندہ
جہنم رسید ہوتا تھا۔ بے شک ہمارے مجاہدین شہید ہوتے تھے لیکن آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہمارا مقصد صرف
شہادت کا حصول نہیں ہے بلکہ ہم صرف اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ تو ہم نے ایک ایسے ملک سے معاہدہ
کر لیا جس کا دشمن ہمارا بھی دشمن ہے۔ وہ اپنے دشمن کو شکست دینا چاہتا ہے اور ہم بھی اسی دشمن کو شکست
دینا چاہتے ہیں۔ دشمن ایک ہے اور شکست بھی ایک ہی ہے لیکن مقاصد میں فرق ہے۔ سو ہم ایک
دوسرے کی مدد کے سہارے چل رہے ہیں۔ وہ ہمیں اسلحہ دیتے ہیں اور ہم اسی اسلحہ کو استعمال کر کے
جنگ لڑتے ہیں۔ اسلحہ انکا اور مجاہدین ہمارے۔ شکست انکے دشمن کی اور نفاذ ہمارے دین کا۔ سو ہم ایک
دوسرے کو فائدہ دے رہے ہیں تو یہ اسلحہ ہمیں وہی ملک فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے بہت تفصیلی جواب
دیا۔

وہ غور سے انکی باتیں سن رہے تھے۔

اور یہ اسلحہ لینا بہت ضروری تھا کیونکہ دشمن آج اس سے بھی بہت جدید اسلحے سے لیس ہے۔ لیکن
اب کچھ کچھ ہمارے پاس بھی آگیا ہے۔ اب ہمارے مجاہد خالی ہاتھ دشمن کے سامنے نہیں جاتے۔

دیکھو دنیا آج طاقت کا دور ہے۔ جو طاقتور ہے وہ اپنی مرضی کرتا ہے اور ہم تو اپنی مرضی کرنا بھی نہیں چاہتے۔ کوئی شخص مرضی نہیں چاہتے صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کا نفاذ چاہتے ہیں اور یہ سب صرف طاقت کے زور پر ہوگا۔ اسکے بغیر یہ ہونا ممکن نہیں ہے ہم اسکو استعمال کیسے کریں گے قاری صاحب؟؟؟ ہم سکھائیے بچے۔ ہم سکھائیں گے۔۔ اور کچھ باتیں مزید کر کے وہ تھوڑی دیر بعد وہاں سے نکل آئے۔

رحمت اللہ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں پر علم حاصل کر کے بڑے مدرسے جانا چاہئے۔ آپ کو اللہ نے عام زندگی گزارنے کیلئے نہیں بھیجا۔ اللہ نے آپ کو خصوصی صلاحیت کے ساتھ خصوصی کام کیلئے بھیجا ہے اس دنیا میں اسیلئے آپ کو اپنا آپ ضائع کرنے کی بجائے اسی صلاحیت کو ویسے ہی استعمال کرنا چاہئے جیسے اللہ چاہتا ہے۔۔

اسے مدرسے میں آئے تین سال ہوئے تھے۔ اس عرصے میں وہ مدرسے میں ہر فرد کا منظور نظر بن چکا تھا۔ مولوی شہاب اسکی تربیت ایک خاص زاویے پر کرنا چاہتا تھا اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ اب وہ ستر سال کا ایک نوجوان تھا۔ اچھے برے کی تمیز کر سکتا تھا اور یہ وہ کر رہا تھا۔۔

جی قاری صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے اور میں ضرور بڑے مدرسے جاؤں گا۔ جہاں میری صلاحیت کو استعمال کیا جائے گا۔ دین اسلام کی خدمت کیلئے۔۔ ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ بیٹے لیکن اپنا فیصلہ تم پر تھوپ نہیں سکتا۔ تمہاری تعلیم ختم ہونے کے قریب ہے اور اسکے بعد جو تم کرنا چاہتے ہو وہ کر لو۔ اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہو تو بھی تمہاری مرضی ہے اور اگر آگے جانا چاہتے ہو تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ بڑے مدرسے جا کر بڑے مولانا صاحب سے ملو اور انکی سرپرستی میں آگے بڑھو۔

بڑے مولانا صاحب؟؟؟ اس نے پوچھا۔

ہاں مولانا عبدالرحمان کا نام میں اکثر لیتا رہا ہوں۔ یا د ہوگا تمہیں۔۔

جی مولانا عبدالرحمان کا نام تو آپ سے سنا ہے۔۔

ہاں بیٹا۔ وہی بڑے مولانا صاحب ہیں۔ تم ان سے ملو گے تو خود جان جاؤ گے کہ میں جو کہتا رہا ہوں وہ بالکل سچا ہے۔ وہ ہیں تو انسان لیکن ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے اپنے دین کی سربلندی کے لیے فرشتے کو انسانی روپ میں بھیج دیا ہے۔ وہ آج کے دور کے سب سے بڑے عاشق رسول ﷺ ہیں۔ اور یہ سب

اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے انہیں۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہماری سوچ سے بھی زیادہ اور اپنی ساری زندگی انہوں نے دین کی سربلندی کیلئے وقف کی ہے اور انکے صدق کی گواہی ان کے چہرے پر پھیلا ہوا نور دیتا ہے۔۔۔

ٹھیک ہے قاری صاحب میں یہاں تعلیم ختم کر کے وہاں جاؤں گا۔ ہر سچے مسلمان کی طرح میرا بھی دل کرتا ہے کہ اپنے دین کی خدمت کروں۔ وہ کام کروں جس سے اللہ کو خوش کیا جاسکے اور اللہ کو خوش کر کے اپنے لیے جنت کا حصول ممکن بنالوں۔ وہ پر عزم لہجے میں بولا۔

شاہد! میرے بچے۔ اللہ تمہیں ایسے ہی ثابت قدم رکھے۔ تمہارے دم سے دین کا اجالا کر دے۔۔۔ آمین۔۔۔ اس نے صدق دل سے انکی دعا پر آمین کہا اور اٹھ کر آ گیا وہاں سے۔۔۔

بیٹا! پاپا کو پھر مین مل گیا ہے اور چھٹی بھی۔۔۔ اس نے خوشی سے اطلاع دی۔۔۔

سچ پاپا؟؟؟ کب آئیگے آپ؟؟؟ وہ بے حد خوش ہوا۔

ہاں بیٹا سچ جلدی آؤں گا۔۔۔

لیکن پاپا کب؟؟؟ وہ ایک دم سے پھر اداس ہوا۔

بیٹا ہمیں سپر مین تو مل گیا ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ وہ کب آتا ہے ہمارے پاس۔ لیکن وہ جیسے ہی آئے گا پاپا آجائیگے۔ انہوں نے اسے بہلایا۔۔۔

شاہد! ہنواز کو چھٹی مل تو گئی تھی لیکن ابھی وہ نہیں آسکتا تھا وہ بارڈر پر ڈیوٹی دیتا تھا اور وہاں سے اتنا آسان نہیں تھا۔ اسکا بس چلتا تو اڑ کر آ جاتا لیکن بے بس تھا۔

وہ جلدی آئے گا پاپا؟؟؟ شاہد! ہنواز اس کے لہجے سے کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔

ہاں بیٹا وہ بہت جلدی آجائے گا۔ انہوں نے اسے اطمینان دلایا۔

پاپا میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

پاپا بھی آپ کو بہت مس کرتے ہیں اور آپکی ماما کو بھی۔ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔۔۔

ماں کو کیا کر رہی ہیں بیٹا؟؟؟ انہوں نے موضوع بدلا

وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔۔۔

اور ماما؟؟؟

وہ صوفے پر بیٹھی ہیں اور ٹی وی دیکھ رہی ہیں۔

وہ بھی کارٹون دیکھ رہی ہیں؟؟؟ انہوں نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

نہیں وہ ڈرامہ دیکھ رہی ہیں۔

کھانا کھایا بیٹا؟؟؟ وہ بات کو طول دے رہے تھے۔۔

ابھی بنا ہی نہیں ہے پاپا تو کیسے کھائیں گے؟؟؟

کیا؟؟؟ ابھی نہیں بنا؟؟؟ کیوں؟؟؟ انہوں نے حیرانی سے ڈھیر سارے سوال ایک ساتھ ہی پوچھ

لیے۔۔

ابھی نہیں بنا پاپا۔ میں کارٹون دیکھ رہا تھا ابھی تو اور ویسے بھی ہم نے شام کو چائے اور پکڑے کھائے

تھے۔

واہ جی۔ پکڑے کھالے اور پاپا کو یاد بھی نہیں کیا؟؟؟ وہ چھیڑتے ہوئے بولے۔۔

ہاں جی۔ آج بارش ہو رہی ہے صبح سے تو ماما نے ڈھیر سارے پکڑے بنا لیے اور ہم نے چائے کے ساتھ کھالے۔ بہت مزا آیا پاپا۔ اسکا موڈ خوشگوار تھا۔

سارے کھالے پاپا پاپا کیلئے بھی چھوڑے؟؟؟

سارے کھالے پاپا۔ میں نے اور ماما نے زیادہ کھائے اور ماما نے تھوڑے کھائے لیکن آپ

آئیٹنگے پاپا تو پھر بنا دیں گے۔ بہت مزا آئے گا۔

وہ پکڑوں کا بہت شوقین تھا۔ اور یہ شوق اسے شہناز سے ہی ملا تھا۔ وہ بھی ہر چیز سے زیادہ چائے اور گرم گرم پکڑوں کا رسیا تھا۔ اور عا نشہ اکثر ان باپ بیٹے کیلئے پکڑے بناتی رہتی تھی اور اور کچھ ماسکی شہناز ڈیوٹی پر ہو کر اکثر عا نشہ کے بنائے ہوئے چائے اور پکڑوں کو یاد کر کے اپنے منہ کا زائقہ بدلا کرتا تھا۔۔

ٹھیک ہے۔۔ جب میں آؤنگا تو خوب کھایا پیا کریں گے۔ پکڑے بھی اور باقی سب کچھ بھی۔ وہ

اسکے ساتھ بچہ بن کے بول رہا تھا۔

ٹھیک ہے پاپا آپ ماما سے بات کر لیں۔

کیوں ڈرامہ ختم ہو گیا؟؟؟

جی۔۔۔

اور فون اسنے عا نشہ کو پکڑا دیا۔۔

ڈرامہ ختم ہو گیا؟؟؟؟ انہوں نے سلام دعا کے فوراً بعد پوچھا۔

میں کوئی ڈرامہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو ڈرامے کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ تو شہناز بات کر رہا تھا تو میں

نے اسکا کارٹون چینل بدل دیا۔۔۔ سنے بہت تفصیلی جواب دیا۔۔

ہاں بیٹا ایک اور مدرسہ بھی ہے جو آپ جیسے مجاہدوں کیلئے ہے۔ بڑے مولانا صاحب بھی وہی رہتے ہیں۔ اور ہمارے کچھ اور بھی مجاہدین جو آپکو آگے بڑھنے کا راستہ اور طریقہ بتائینگے۔۔۔
بات مکمل کرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کیلئے رکے اور انکے چہروں کی طرف دیکھتے رہے۔ شاید اپنی بات کا اثر دیکھ رہے تھے۔

یہ بڑے مولانا صاحب کا فیصلہ ہے بیٹے۔ انہوں نے ہم سے مشورہ مانگا اور ہم سب نے یہی صلاح دی کہ آپ لوگوں کو اب عملی کام کی طرف لے آنا چاہیے۔ صحیح اور غلط کی پہچان کرنے کی صلاحیت ہے اب آپ کی اور پھر جب آپ زہنی طور پر تیار بھی ہیں تو پھر دیر کس بات کی۔ سو ہم نے یہی فیصلہ کر لیا کہ اب آپ کو بھیج دیا جائے۔ انہوں نے کافی تفصیل بتائی۔

وہ پانچویں خاموش رہے۔ قاری صاحب باری باری انکی طرف دیکھتے رہے۔
آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں قاری صاحب جب زندگی وقف کر ہی دی ہے تو پھر دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی زندگی کا کیا بھروسہ۔ خاموشی کے اس وقفے کو عمر فاروق نے تھوڑا۔
اور جب یہ مولانا صاحب کا فیصلہ ہے تو ضرور ہمارے لیے بہترین ہی ہوگا۔ علی حیدر بولا۔۔۔
نہیں بیٹا مولانا صاحب کے فیصلے نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کے فیصلے ہیں جو انکے ذریعے ہو رہے ہیں۔
انکو اللہ نے بھیجا ہے اسی مقصد کیلئے۔ ہر انسان کیلئے اللہ نے فیصلے کیے ہوتے ہیں اور اللہ ہی بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ بس آپ کے لیے بھی اللہ نے ہی چنا ہے راستہ۔ یہ ہمارا راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا راستہ ہے۔

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب اگر اللہ نے ہمیں منتخب کر لیا ہے اپنی دین کی خدمت کیلئے تو ہم دیر نہیں کریں گے مجاہد اللہ کافی دیر بعد بولا۔

تو ٹھیک ہے بیٹا۔ آپ سب اپنا اپنا سامان باندھو اور کل فجر کی نماز کے فوراً بعد آ جانا۔ ہم آپ کو دوسرے مدرسے منتقل کر دیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟؟ انہوں نے حسب عادت اپنی بات کے اختتام پر سوال کیا

جی ٹھیک ہے قاری صاحب۔ ہم تیار رہیں گے۔ عمر بولا اور سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک دھیمی سی مسکان انکے چہرے پر آئی۔ وہ کافی خوش لگ رہے تھے۔

وہ لوگ صبح کی اذان سے کافی دیر پہلے ہی جاگ گئے تھے۔ آج انہیں اس مدرسے کو خیر باد کہہ کر ایک نئی جگہ جانا تھا۔ سامان وہ رات کو ہی باندھ چکے تھے۔ سامان کچھ زیادہ نہیں تھا بس سب کے پاس

کپڑوں کے تین چار جوڑے ہی تھے جو انہوں نے گٹھڑی میں باندھ لیے تھے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ انہیں یہاں سے نکل جانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اذان ہوئی تو انہوں نے وضو کیا اور مسجد چلے گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ فوراً مسجد سے نکل کر اپنے کمرے میں آئے۔ اپنی اپنی گٹھڑی اٹھائی اور مسجد کی طرف چلے گئے۔ کچھ لڑکے ابھی تک مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ انکو چھوڑ کر مسجد کے اس چھوٹے سے کمرے میں گئے جو رات کو مولوی صاحب نے انہیں بتایا تھا۔ مولوی صاحب انکا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انکو ساتھ لے کر مدرسے کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ پانچوں بھی انکی تائید میں اسی طرف چلتے ہوئے مدرسے سے باہر نکلے۔

باہر نکل کر حیرانی کا ایک جھٹکا ان سب کو لگا۔ باہر ایک گاڑی انکے انتظار میں کھڑی تھی جس میں مولوی بلال پہلے سے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ قاری صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی بیٹھ گئے انہوں نے مدرسے میں گزارے ہوئے عرصے میں مدرسے کے احاطے میں کبھی گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ بڑے مولانا صاحب کو بھی انہوں نے کبھی گاڑی میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ سب حیران ہوئے۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک انجان شخص بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے کی سیٹ پر مولوی بلال اور قاری صاحب اور اس سے پیچھے دو سیٹوں پر وہ پانچوں بیٹھ گئے۔ اور وہ پانچوں منہ اندھیرے مدرسے کے احاطے سے نکل گئے۔ جہاں انہوں نے تین سال گزارے تھے۔

گاڑی کافی آہستہ رفتار میں چلتی رہی اور وہ پانچوں کھڑکی سے باہر کے نظارے کرتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہاں کے راستوں سے واقف نہیں تھا۔ آخر تقریباً ایک گھنٹے بعد کچھ گھروں کے سامنے گاڑی رکی اور ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے قاری صاحب اور مولوی بلال بھی اتر گئے اور ان سب کو بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب بھی ایک ایک کر کے اترے اور انکی تقلید میں سامنے بنے ہوئے گھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

یہ جگہ پہلے والے مدرسے سے کافی مختلف تھی۔ مجاہد اللہ نے تجسس میں نظریں ادھر ادھر گھمادی۔ شاید وہ کسی مدرسے کو تلاش کر رہا تھا لیکن یہاں تو اس طرح کا کوئی مدرسہ نہیں تھا بلکہ یہ علاقہ پچھلے علاقے کے مقابلے میں کافی آباد تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیس بچپیس کچے پکے مکان بنے ہوئے تھے۔ قاری صاحب کے پیچھے چلتے ہوئے وہ چار پانچ نسبتاً اچھے اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مکانوں کی طرف آئے۔ ان سب کے دروازے الگ الگ تھے لیکن درمیان کی دیواریں جڑی ہوئی لگ رہی تھیں۔

یہ تو مدرسہ نہیں لگ رہا مجاہد یہ تو چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ حیدر اسکی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
ہاں مدرسہ تو مجھے بھی نہیں لگ رہا۔ اس نے بھی تائید کی۔

قاری صاحب نے ان میں سے ایک گھر کا دروازہ زور سے بھایا تو تھوڑی دیر میں اندر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ قاری صاحب نے کھٹکھا کر گلہ صاف کیا تو اندر سے دروازہ کھولا گیا۔ سلام کے علاوہ ان میں کوئی بات نہیں ہوئی اور وہ ان پانچوں کو لے کر اندر کمرے میں آئے۔

گل ریز کھانا لے آؤ۔۔۔ انہوں نے ساتھ چلتے ہوئے نوجوان سے کہا۔

جی اچھا۔ اس نے فرمانبرداری سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ انکے ساتھ صرف قاری ثناء اللہ تھے۔ مولوی بلال اس گھر میں انکے ساتھ داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ گاڑی سے اترنے کے بعد اور اس گھر میں آنے تک دوبارہ ان کو دکھائی نہیں دیے۔

تھوڑی دیر میں وہ نوجوان ایک طشتری میں کھانا اور روٹیاں لے کر آیا اور ساتھ میں قبوے کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں بھی۔ انہوں نے جی بھر کر کھانا کھانا اور پھر قبوہ بھی پی لیا۔

تم لوگ کچھ دیر ادھر ہی آرام کر لو نیچے۔ مولانا صاحب عبادت سے فارغ ہو گئے تو تم لوگوں کو بلا لیں گے۔ ابھی وہ عبادت میں مصروف ہیں۔ میں ذرا یہاں سب سے مل لیتا ہوں۔۔۔ اور کمرے سے نکل گئے۔

وہ کمرہ کافی بڑا تھا اور مدرسے کے کمرے کے مقابلے میں کافی اچھا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دو کمروں کو ملا کر ایک کمرہ بنایا گیا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ تین رضائیاں اور انکے اوپر چادر اور تنگیہ پھیلا دیا گیا تھا۔ اور دوسری دیوار کے ساتھ دو رضائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سب رضائیوں پر ایک ایک چادر اضافی بھی رکھی ہوئی تھی جو سوتے ہوئے اوڑھنے کیلئے تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ پانچ رضائیاں ان پانچوں کیلئے ہی تھیں۔۔۔ وہ کچھ دیر تک دیوار کے سہارے وہی بیٹھے رہے لیکن جب یقین ہو گیا کہ مولانا صاحب اتنی جلدی نہیں بلائیں گے تو اپنے اپنے بستر پر چلے گئے۔

مدرسے کے برعکس اس گھر میں گہری خاموشی تھی۔ اسلئے تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی وادیوں میں پہنچ گئے۔ دوبارہ آنکھ تپ کھلی جب وہ نوجوان گل ریز ان کو جگانے آیا۔

مولانا صاحب بلا رہے ہیں۔۔۔

وہ سب آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ بہت بے وقت سوئے تھے وہ۔ مدرسے کے تین سالوں میں ایک بار بھی کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

اپنے کمرے سے نکل کر گریز کے پیچھے چلتے ہوئے دو تین کمروں کو چھوڑ کر وہ ایک تنگ سے کمرے میں آئے۔ کمرہ چھوٹا تھا لیکن بہت روشن اور پیارا تھا۔ کمرے کے وسط میں مولانا صاحب جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انکے ہاتھ میں تسبیح تھی اور آنکھیں بند کیے وہ کوئی ورد کیے جا رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو انہوں نے آنکھیں کھول دی۔ اپنی جگہ سے اٹھے۔ انکی ملوکتی مسکراہٹ انکے ہنٹوں پر قصاں تھی۔ کھڑے ہو کر انہوں نے بائیں پھیلا دی اور سب سے گئے ملے۔ خوش لگ رہے تھے وہ۔۔

بیٹھ جاؤ بچے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ اور خود بھی بیٹھ گئے۔
وہ سب انکے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے۔

معاف کرنا بچے۔ میں شرمندہ ہوں آپ لوگوں کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔

نہیں مولانا صاحب آپ اللہ کی عبادت کر رہے تھے۔ اور اللہ کی عبادت انسانوں سے زیادہ ضروری ہے۔ اور ہم تو ویسے بھی اب یہی پر ہیں تو انتظار کیسا؟؟؟ مجاہد نے گویا سب کے دل کی بات کر دی تھی۔۔
ہاں بیٹے رب کو وقت دینا بھی تو بہت ضروری ہے ماورنہ کل وہ پوچھے گا کہ لوگوں کو تو میرے رستے کی تعلیم دے رہے تھے اور خود یہ حال تھا کہ عبادت بھی نہیں کر سکے۔ وہ سوچتے ہوئے بولے۔
تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اور پھر انہوں نے نککھار کر گلہ صاف کیا اور بولے۔۔
جانے تو ہونا بیٹے کہ آپ کو کس عظیم مقصد کیلئے یہاں لایا گیا ہے۔
جی۔۔۔ سر جھکائے سب نے کہا۔

بیٹا سمجھ لو کہ آپ کو وہاں لایا گیا ہے جہاں سے آپ کے مقصد کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہاں آپ کو تربیت دی جائے گی۔ آپ کو طریقہ سکھایا جائے گا۔ آپ کو مشقیں بھی کروائی جائیں گی۔ اور وہ سب آپ کو سکھایا جائے گا جو آپ کیلئے ضروری ہے۔ آپ کو اس دین کی خدمت کرنی ہے اور اسکے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اس دین اور اللہ کے دشمنوں سے نمٹنے کا طریقہ آتا ہو۔ کیونکہ اگر آپ کو طریقہ نہیں آئے گا تو آپ جوش اور جذبہ رکھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے رسول نے اپنے صحابہ اور مجاہدین کو خود تربیت دی خود بھی انکے ساتھ سیکھتے تھے۔ کیونکہ سیکھنا ضرور ہوتا ہے۔
انہوں نے ایک وقفہ لیا اور پھر گویا ہوئے۔۔

بیٹے کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ آپ کو سب سے پہلے اسکے طریقہ کار کا پتا ہو۔ نماز پڑھنا چاہو گے اور وضو کرنا نہیں آئے گا تو کیا ہوگا؟؟؟ مانتا تو لوگاؤ گے لیکن اگر اللہ

اکبر پڑھنے کا ہی پتا نہیں ہوگا تو رب اسے کیسے قبول کرے گا؟ ہلکل اسی طرح اس دین کی خدمت کرنے کا جذبہ اگر ہوگا بھی لیکن خدمت کرنے کا طریقہ پتا نہیں ہوگا تو شہادت کی موت تو پا لو گے، جنت بھی مل جائے گی لیکن اس دین کو فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اور یہ یاد رکھنا بچے کہ ہمارا مقصد شہادت نہیں ہے ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ زندہ رہینگے تو کچھ کر سکیں گے۔ شہادت ہماری منزل نہیں ہے۔ ہماری منزل اس دین کی سر بلندی ہے۔ اب اس مقصد کے حصول میں اگر کہیں ایسے حالات آجائیں کہ موت کے سوا کوئی راستہ نہ ہو تو بے بسی کی موت مرنے سے ہم اور ہمارے مجاہدین شہادت کو ترجیح دیتے ہیں۔

دیکھو بچے جب ہم اپنے رسول سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر یہ کیسے چاہ سکتے ہیں کہ قیامت میں وہی محبوب ہم سے اتنا دور رہے کہ ہمیں ان تک رسائی ہی نہ ہو۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں نہ سہی لیکن اس دنیا میں تو انکی قربت نصیب ہونا۔ اور جانتے ہونا کہ یہ قربت کیسے ملے گی؟؟؟ کہ جب ہم وہ کام کریں گے جو انہیں پسند تھے۔ اسی موت مرینگے جو انہوں نے اپنے لیے پسند کی۔ اور انہوں نے اپنے لیے شہادت کی موت ہی مانگی ہے۔۔۔۔۔

وہ خاموشی سے انکی بات سنتے رہے۔ آج بھی وہ اپنے مخصوص دلوں کو مول لینے والے انداز میں بول رہے تھے۔ مجاہد اللہ کو یاد آیا کہ مولوی شہاب نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہیں بڑے مولانا صاحب کی خوبیاں نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم جب ان سے ملو گے تو خود ہی انہیں جان جاؤ گے۔ وہ آج کے دور کے سب سے بڑے عاشق رسول ہیں اور انکی بات کو سچ تو وہ آج سے بہت عرصہ پہلے ہی مان چکا تھا۔ وہ واقعی بہت بڑے عاشق تھے اور انکی خوبیاں واقعی الفاظ میں بیان کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ بولتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی فرشتہ اللہ کا پیغام دے رہا ہے۔ انکے سامنے سر جھکائے رکھنے کا ہی دل کرتا تھا۔ انکا دھیمالہجہ پیار بھر انداز اور ہونٹوں کی ہلکی سی مسکان۔۔۔۔۔ اور کوئی انکا کرنا بھی تو کیسے۔۔۔؟؟

اور پھر رحمت اللہ مولوی شہاب کی رہنمائی میں اس مدرسے میں آیا۔ رحمت سے رحمت اللہ اور رحمت اللہ سے مجاہد اللہ کا سفر وہ سترہ سال پر محیط تھا۔ رشید کے ساتھ مارکنائی کی عمر سے نکل کر وہ تائب کی دوستی میں آیا تھا اور اب وہاں سے بھی نکل کر علی حیدر امیر حمزہ اور عمر فاروق کا ساتھی بن گیا۔ وہ حاوی قرآن بھی بن چکا تھا اور مدرسے میں رہتے ہوئے اس نے تفسیر اور ترجمہ بھی پڑھ لیا تھا۔ زمین تو وہ تھا ہی۔

ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے جاتے ہوئے اسے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی مدرسے میں تو وہ آٹھ سال سے تھا۔ تو چاہے ایک مدرسہ ہو یا دوسرا مدرسہ فرق کیا پڑنا تھا اسے۔ اور پھر یہ تو وہ مدرسہ

تھا جس کے بارے میں اس نے بہت بار قاری شہاب سے سنا تھا۔ فرق بس یہ تھا کہ پہلے مدرسہ گھر سے قریب تھا تو وہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد گھر کا ایک چکر لگا لیا کرتا تھا۔ اور یہ مدرسہ تو اتنا دور تھا کہ گھر سے آتے ہوئے اسے آٹھ گھنٹے لگتے تھے۔

اس مدرسے میں آنے سے پہلے وہ اپنے گھر گیا۔ اپنی ماں جمیلہ اور باپ کو اپنے جانے کے بارے میں بتایا۔ دونوں ہی اس کے فیصلے کے حق میں نہیں تھے۔

اماں میں عالم بن تو گیا ہوں لیکن اب اس علم کو استعمال بھی تو کرنا چاہیے ماں نے دلیل دی۔
رحمتے بس تم واپس آ جاؤ۔ اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔

اماں دور کی بات نہیں ہے۔ وہاں کم از کم میرے علم کو استعمال تو مل جائے گا۔ میں دین کی تبلیغ کروں گا۔ وہ مکمل طور پر جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

یہ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ تم یہاں لوگوں کو اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کا درس دو۔ اسکے لیے اتنا دور جانے کی ضرورت نہیں ہے اور پھر میں تمہیں مزید اب گھر سے باہر بھی نہیں رہنے دوں گی۔ وہ کسی طور مان نہیں رہی تھی۔

اماں اتنا عرصہ نہیں ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ میں مولوی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور پھر میں خود بھی جانا چاہتا ہوں۔

لیکن تو جانا کیوں چاہتا ہے رحمتے جب کوئی بھی نہیں چاہتا تو؟؟؟ وحید علی جو کافی دیر سے خاموشی سے سن رہا تھا بولا۔

بھائی جب مجھے اپنے علم کو بڑھانے اور پھر استعمال کرنے کا موقع مل رہا ہے تو آپ روک کیوں رہے ہیں۔؟؟؟

روک اس لیے رہے ہیں کہ ہم تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔۔ جمیلہ بولی
اماں میں پہلے بھی تو مدرسے میں تھا نا۔ تو اب تھوڑا سا عرصہ مزید برداشت کر لیں پھر میں واپس آ جاؤں گا۔ ہمیشہ کیلئے۔ وہاں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

بیٹا تو اس بار گیا تو واپس نہیں آئے گا۔ تو واپس کبھی بھی نہیں آئے گا۔ جو اپنی مرضی سے اپنے پیاروں کو چھوڑ کر جاتے ہیں زندگی انہیں واپسی کا موقع نہیں دیتی بلکہ انہیں ناشکری کی سزا دیتی ہے۔ تو بھی واپس نہیں آ پائے گا۔ وہاں سے کسی ان دیکھے نقطے کو گھورتے ہوئے خود سے بولی۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا
اماں میں آؤں گا۔۔ میں ضرور آؤں گا۔ اسکے لہجے میں عزم تھا

بھیا چلیں ماکھیلے ہیں۔ ننھا نعمان التجانیہ لہجے میں بولا۔
 اچھا ٹھیک ہے دو منٹ رکو۔ وہ جوہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ فوراً مان گیا۔
 لیکن نوی کھیل ختم کرنے کے بعد تم بیٹھ کر پڑھو گے۔ تمہارے ایگزامز بہت قریب ہیں اور تم بالکل
 نہیں پڑھتے۔ فیصل نے نوی کے لحاظ سے ایک مشکل شرط رکھی۔
 پڑھ لو نگا ماکھیا۔ میں فیل نہیں ہونا آپ جانتے ہیں۔
 ہاں لیکن پڑھو گے تو اچھے سے پاس ہو جاؤ گے۔
 اچھا پڑھ لو نگا ماکھیا۔ ابھی آپ انھیں تو سہی۔ وہ حد درجہ بیزاری سے بولا۔
 اور وہ کتا میں سمیٹ کر اسکے ساتھ کھیلنے میں لگ گیا۔

اب شا لو بھی سکول جانے لگی تھی۔ چھوٹی کلاس میں تھی لیکن وہ بھی فیصل کی طرح محنتی ماکھیا لیکن
 کافی زہین تھی۔ اس گھر میں سب کو نعمان کی پڑھائی کی فکر لگی رہتی تھی۔ زہین ماکھیا لیکن کندزہن وہ بھی
 نہیں تھا پر زہانت سامنے آنے کیلئے تو کتاب کو ہاتھ لگانا بھی ضروری ہوتا ہے جو وہ اپنی آخری کوشش تک
 نہیں لگاتا تھا اور جو کبھی کبھی کسی نے مجبور کر کے کتاب اٹھا بھی لی تو اسے خند کے جھٹکے شروع ہو جاتے
 کتاب اسکے لیے کتاب نہیں بلکہ خند کی ایک کوئی تھی جو وہ نگلتے ہی اونگھنا شروع ہو جاتا۔ اسے
 کھیلنا پسند تھا اسے کھانا پسند تھا اسے گھومنا پھرنا پسند تھا اسے سکول جانا بھی پسند تھا۔ بارش ہوتی یا طوفان وہ
 سکول جاتا تھا لیکن پڑھنا اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ فیل تو نہیں ہوتا تھا لیکن فیل کے قریب سے
 گزر کر پاس ہوتا تھا۔ اور اسکی ان حرکتوں کی وجہ سے شا لو کے علاوہ اس گھر کے تینوں مکین ہی بہت
 پریشان ہوتے تھے۔ وہ اسے کوئی ماکھیا لالچ دے کر پڑھنے کیلئے بٹھانے کی کوشش کرتے۔ ابھی بھی
 فیصل یہی کر رہا تھا۔

چھین چھپائی میں شا لو بھی انکے ساتھ شامل ہوئی۔ وہ دونوں چھپ جاتے اور فیصل انہیں
 ڈھونڈتا رہتا۔ یہ جان جانے کے باوجود بھی کہ وہ کہاں چھپے ہیں وہ قصداً دھرا دھرا ڈھونڈتا رہتا۔ مبادا کہیں
 جلدی پکڑنے پر نوی ماکھیا ہی ہو جائے۔

ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کر فارغ ہوئے تو فیصل نے اسے پڑھنے کی یاد دہانی کروائی۔ حسب عادت وہ
 ہال منول کرنے لگا لیکن فیصل اس وقت اسے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا سوا سے بادل ماکھیا بیٹھنا ہی
 پڑا اور شاہدہ نے دل میں ہی خدا کا شکرا دا کر دیا۔

ماکھیا سے فارغ ہو کر نیچے تہہ خانے میں چلے جانا۔ مولانا صاحب نے کہا ہے کہ آج سے آپ کی

ترتیب شروع کر دی جائے گی۔ گلریز نے ناشتہ انکے سامنے رکھتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

وہ پانچوں بھی کوئی بات کیے بغیر ناشتہ کرنے لگ گئے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر انہوں نے برتن اپنی مخصوص جگہ پر رکھے اور وضو کر کے نیچے تہہ خانے میں چلے گئے۔

وہ تہہ خانہ ان کی امید سے زیادہ بڑا تھا۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ تہہ خانہ اس ایک گھر جس میں وہ کل سے مقیم تھے کے پچھے نہیں تھا بلکہ اس پاس کے کئی گھروں کو ملا کر ان سب کے نیچے ایک مشترکہ تہہ خانہ ایسے بنایا گیا تھا کہ زمین کے اوپر گھرا لگ الگ تھے لیکن انکے نیچے جو تہہ خانہ تھا وہ ایک ہی تھا اور بالکل پچھلے مدرسے کے طرز پر ایک طرف کو کمرے بنے تھے۔

سیڑھیوں سے اتر کر وہ حیران رہ گئے کیونکہ وہ جو سمجھ رہے تھے کہ صرف انہی کو تہہ خانے میں بلایا گیا ہے وہاں تو بہت سارے آدمی نالیوں کی شکل میں ادھر ادھر اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ پچھلے مدرسے کے برعکس یہاں موجود کمرے بھی بند نہیں تھے۔ بلکہ کافی لوگ ان میں اندر اور باہر آ جا رہے تھے۔

آ جاؤ ادھر۔۔۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہ حیران کھڑے تھے کہ ایک آدمی انکے پاس آ کر بولا۔
وہ اس کے پیچھے گئے۔ ان کو لے کر وہ ایک کمرے میں آیا۔

تم لوگوں کو سب سے پہلے ننانبازی کی تربیت دی جائے گی اور ہاں تم میں سے مجاہد اللہ کون ہے؟؟؟
انکی طرف مڑتے ہوئے وہ بولا

مجاہد میرا نام ہے مولوی صاحب۔۔۔ وہ ادب سے ہوئے بولا

ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہیں اللہ نے ننانے کی ایک خصوصی نعمت سے نوازا ہے ایسے تمہیں ننانے میں ہی آگے جانے کی تربیت دی جائے اور باقی سب کو بھی شروع ننانے سے کروا کر مزید تربیت بھی دی جائے گی۔ آدمی نے تفصیلی جواب دیا

کمرے کے اندر ایک چھوٹی سی ٹرے میں کچھ پستول پڑے تھے۔ وہ سب اٹھا کر اس آدمی نے ان سب کے ہاتھوں میں ایک ایک پکڑا دیا۔

چلو آ جاؤ اب۔۔۔ وہ سب پستول اٹھا کر اس کے پیچھے کمرے سے نکلے۔

وہ کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے سے باہر نکلے۔ اب وہ تہہ خانے سے نکل آئے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آئے تو خود کو ایک گھر میں پایا۔ یہ وہ گھر تو نہیں تھا جس میں وہ مقیم تھے لیکن کم و بیش اسی جیسا ہی تھا۔ گھر کے ایک کونے میں مختلف قسم کی چھوٹی بڑی تصاویر لگی

ہوئی تھی۔

یہ پستول بھرے ہوئے ہیں اور تم لوگوں کو اس کو نہ میں کھڑے ہو کر سب سے پہلے دائیں طرف
دائیں سب سے بڑی تصویر کا نشانہ لیتا ہے۔ ابھی تو نشانہ پکا نہیں ہوگا اس لیے بڑی تصویر بھی نشانہ پر نہیں
آئے گی لیکن جیسے جیسے وقت گزرے گا نشانہ پکا ہوتا جائے گا پھر ہم بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی تصویروں کی
طرف جائیں گے۔

وہ سب خاموشی سے انکی باتیں سنتے رہے۔

اچھا اب تم میں سے کوئی مجھے اپنی پستول دے دو تاکہ میں اسکے اجزا اور چلانے کا طریقہ
بتا دوں۔ انہوں نے حیدر کی پستول لے لی۔

طریقہ بتانے کے بعد انہوں نے نشانہ باندھ کر ایک گولی چلائی۔ اور دوسرے ہی لمحے سامنے
دیوار پر چپکی تصویر انکے نشانہ کا حال بتا رہی تھی۔ ان سب نے رشک بھری نگاہوں سے انکی طرف
دیکھا۔

باری باری ان سب نے نشانہ باندھنے کی کوشش کی۔ زندگی میں پہلی بار گولی چلانے والے کی
جو حالت ہو سکتی تھی وہ ان سب کی بھی تھی۔ نشانہ لگانا تو دور کی بات گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی انکی
سانسیں اکھڑنے لگتی۔ مجاہد اللہ کا نشانہ اچھا تھا لیکن غلیل سے کسی گاڑی کا نشانہ باندھ کر شیشہ توڑ دینا اور آج
پستول سے نشانہ باندھنے میں زمین آسمان کا فرق تھا یہ آج اسے پتا چلا تھا۔

انجان آدمی ساتھ میں پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ کر انکی مشق کا نظارہ کرتا رہا۔ وہ غلط نشانہ باندھتے
رہے لیکن وہ غصہ نہیں ہوا بلکہ انکو شاباش دے کر انکی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور ساتھ ساتھ میں طریقے بھی
بتاتا رہا۔

اور پستول کی آخری گولی سامنے تصویر کے بیچ میں تو ماسی لیکن اسکے کوٹنے میں جا کر گئی۔

واہ زبردست۔ وہ شخص خوشی سے چلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب نے حیرانی سے انکی طرف دیکھا۔
عبداللہ اور گولیاں لے کر آؤ۔ وہ شخص ادھر سے ہی چیخا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی تھیلے میں کافی ساری گولیاں لے کر آیا۔ یہ شخص بھی انجان ہی تھا۔ ان
سب سے پستول لے کر ان میں گولیاں بھر دی اور چلا گیا۔

تقریباً دو گھنٹے تک انکی یہ مشق چلتی رہی۔ وہ شخص انہیں نشانہ باندھنے کے گرسبھاتا رہا اور ان سے مشق
کرواتا رہا۔ تیسری بار گولیاں ختم ہونے کے ساتھ مشق بھی ختم کر دی گئی۔ اس وقت تک مجاہد اللہ تصویر کے

سچ میں تو نہیں لیکن مقرر کردہ نشان کے کچھ قریب ہی مار دیتا تھا جبکہ اسکے باقی دوست ابھی تصویر کے کونے کانٹا نہ ہی ماندھ سکے تھے۔

چلو بیچو اب آ جاؤ۔ اور وہ شخص دو بارہ تہہ خانے کی طرف بڑھا۔

وہ سب اسی کی تقلید میں اسکے پیچھے ہو لیے

پچھلے تہہ خانے میں بہت سارے لوگ ابھی بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ایک طرف کو کچھ لوگ ورزشیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ایک ٹولی کی شکل میں بیٹھے تھے اور انکے سامنے کچھ کاغذات بکھرے ہوئے پڑے تھے قریب میں ہی کچھ لڑکے ایک مولوی صاحب کے گرد بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ گنے بغیر اندازے سے کہا جاسکتا تھا کہ کم و بیش سو کے قریب لوگ اس وقت اس تہہ خانے میں موجود تھے۔

تہہ خانے میں جا بجا چھوٹے چھوٹے دروازے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک دروازے سے وہ باہر گئے تھے اور پھر واپس آئے۔ اور یہ وہ گھر نہیں تھا جہاں وہ کل سے رہ رہے تھے۔ یہ باقی دروازے بھی گواہی دے رہے تھے کہ یہ بھی قریب میں بنے ہوئے گھروں میں ہی کھلتے ہیں۔

میرے پیچھے آؤں گے۔ وہ انگوٹھے کے اشارے سے باہر آئے۔ یہ کوئی گھر نہیں تھا بلکہ ایک کھلا میدان تھا جس میں دور دور تک کسی زری روح کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ان سب کو وہاں چھوڑ کر وہ آدمی ایک بار پھر اندر گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی تھا۔ جوان اور صحت مند لڑکا تھا۔ یہ فیض اللہ ہے۔ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارے گا اور آپ کو اس قابل بنائے گا کہ کئی دنوں تک پیدل چلنا آپ کے لیے مشکل نہ رہے کیونکہ یہاں سے ہمیں آپ کی جسمانی منہ بولی کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر وہ واپس جانے کیلئے مڑے۔۔۔

مولوی صاحب --- حمزہ نے پکارا۔ وہ واپس مڑے۔

آپ کا نام کیا ہے مولوی صاحب؟؟؟

میرا نام قدرت ہے چنیا۔ اور میں پچھلے پندرہ سال سے یہی پر ہوں۔ آپ بھی جب تک یہاں ہیں مجھے دیکھتے رہیں گے۔ یہ کہہ کر وہڑے اور دروازے سے اندر چلے گئے۔

فیض اللہ کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ جو ان پانچوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ ایک گھنٹہ ہی بھاگ سکے۔ ان کو اس قابل بنادے کہ وہ کئی دن تک بلا تھکان چل سکیں۔ اور ضرورت پڑنے پر بھاگ سکیں۔ یہ انہیں فیض اللہ کی زبانی ہی پتا چلا۔

سب سے پہلے اس نے کھلے میدان میں کہیں کہیں نظر آتے چھوٹے بڑے پتھروں کی طرف

اشارے کر کر کے انکو حدود بتائی اور پھر طے کیا کہ ان حدود کے اندر پانچ چکریں کافی جائیں گی۔ وہ جو اتنی بڑی جگہ کا ایک بھی چکر لگانے کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے تھے پانچ چکروں کا سن کر تو چکرا کر رہ گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ چل نہیں سکتے تھے۔ مجاہد اللہ کی طرح وہ سب بھی کسی ماکسی مدرسے سے آئے تھے اور مولوی شہاب کے مدرسے میں وہ کھیل کود میں کافی حصہ لیتا تھا۔ ایک دو گھنٹے تک وہ سب بغیر تھکے چل سکتے تھے لیکن یہ اتنا بڑا میدان تھا کہ ایک گھنٹے میں اسکے ایک ہی چکر سے زیادہ ان میں سے کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے پریشانی کے عالم میں اسکی طرف دیکھا۔

ارے بھئی پریشان مت ہو۔ میں ایک ساتھ ہی پانچ چکروں کا نہیں کہہ رہا۔ ہم سچ میں آرام کر لیں گے۔ یا پھر چلو پانچ کی بجائے چار چکر کر لیتے ہیں۔ دوا بھی اور دو بعد میں۔ لیکن چار چکر پورے کرنے ہیں ہمیں۔ انکی پریشانی بھانپتے ہوئے وہ بولا۔

انہوں نے اپنی مشق شروع کر دی۔ فیض اللہ بھی انکے ساتھ ساتھ ہی چلتا رہا۔ وہ کبھی تھوڑا سا دوڑ لیتے اور پھر تھک کر آہستہ چلنا شروع ہو جاتے۔ فاصلہ بہت تھا۔ پہلا چکر مکمل ہوا تو فیض نے انہیں تھوڑی دیر سستانے کو کہا اور خود بھی کھلی زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر سستانے کے بعد وہ دوسرے چکر کیلئے اٹھے تو تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی انکی ہمت جواب دے گئی۔ ایک فیض اللہ ہی تھا جو ہر حال میں چکر پورا کرنے کے موڈ میں تھا۔ دوسرا چکر بہت مشکل سے تقریباً پہلے چکر سے دگنا وقت میں مکمل ہوا۔ سچ میں وہ ایک بار مزید سستانے کیلئے بیٹھ گئے۔ ان میں سے کسی سے بھی چلا نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے دل میں اللہ کا شکر کیا جب فیض نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اب تم لوگ اس والے دروازے سے اپنے کمرے میں جاؤ اور تھوڑا آرام کر لو۔ تھوڑی دیر میں کھانا بھی مل جائے گا۔ کھانے کے بعد باجماعت نماز پڑھی جائے گی اور اسکے بعد آرام کا وقفہ ہوگا۔ اس میں سو جانا۔ عصر کی نماز سے پہلے تم لوگوں کو اٹھا دیا جائے گا اور نماز کے بعد دوبارہ یہی پڑ آ جانا۔ اس نے تفصیلی طور پر ان کو سمجھایا۔

اور انہوں نے یہی کیا۔

عصر کی نماز پڑھ کر وہ دوبارہ اسی میدان میں آئے تو فیض اللہ کو اپنا منتظر پایا۔

وہ کافی خوش مزاج بندہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان سے گھل مل گیا تھا۔

فیض اللہ یہ سب ہم کیوں کر رہے ہیں۔ حیدر نے پوچھا۔

جب تک تم لوگ اس قابل نہیں ہو جاتے کہ بغیر تھکے اس سے زیادہ فاصلہ طے کر سکو۔ جب تک تم

لوگوں کو ان فاصلوں کی عادت نہ ہو جائے۔

تو ضرورت کیا ہے اس سب کی؟؟؟ مجاہد اللہ نے چلتے چلتے سوال کیا۔

دین کی خدمت کیلئے ایک سچے مجاہد کو بہت سی مشکلات سہنی پڑتی ہیں میرے دوست۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے اس لیے تو کہتے ہیں کہ مومن کیلئے یہ دنیا دوزخ اور کافر کیلئے جنت ہے کیوں کہ سچا مومن دل سے دین کی خدمت کرتا ہے۔ اسے سنگلاخ چٹانوں پر چڑھنا پڑتا ہے، ٹھنڈے پانی کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں اور ان سب کیلئے ضروری ہے کہ وہ جسمانی طور پر مضبوط ہو اور تم لوگوں سے یہ سب کروانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کل کو تمہارے سامنے ایسی کوئی مشکل آتی ہے تو تم ڈرنے اور پریشان ہونے کی بجائے مضبوطی سے اس کا سامنا کرو۔ فیض اللہ نے کافی تفصیلی جواب دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

شام کو وہ واپس اپنے کمرے میں آئے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر ایک بڑی پکار پکار کر اپنی دگرگوں حالت کا اعلان کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر انہوں نے آرام کیا اور پھر مغرب کی اذان کے ساتھ نماز پڑھنے گھروں کے قریب بنی مسجد میں چلے گئے۔ نماز کے بعد کھانے کا وقت ہوا اور تھوڑی دیر بعد عشاء کی نماز پڑھی اور اپنے دیکھتے بدن کے ساتھ سو گئے۔

اور گھر سے واپس آنے کے تین دن بعد رحمت اللہ اپنا سامان سمیٹ کر اور وہ مدرسہ چھوڑ کر مولوی شہاب کے ساتھ نئے مدرسے کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاؤں سے گاڑی میں بیٹھ کر وہ مختلف گاڑیاں بدلتے ہوئے تقریباً آٹھ گھنٹے میں مدرسہ پہنچے۔ یہ مدرسہ بہت دور تھا۔ اور پچھلے مدرسے کے برعکس اسے پاس کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ علاقہ ایسا تھا جہاں کہیں کہیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ایک ایک دو دو گھر بنے ہوئے تھے۔ اسے یہ علاقہ بڑا پر اسرار لگا۔

مولوی صاحب یہ کونسی جگہ ہے؟؟ وہ جو اپنی ستر سالہ زندگی میں صرف قریب قریب کے دو گاؤں میں گیا تھا۔ ایک جس میں اس کا گھر تھا اور ایک جسمیں مدرسہ تھا۔ اب آٹھ گھنٹے کے سفر پر محیط دنیا کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا تھا۔

شوال کہتے ہیں اس علاقے کو۔ جواب مختصر تھا۔

لیکن ہم یہاں ہی کیوں آئے؟؟؟

ہم سب کو زندگی کے ہر موڑ پر کسی ماکسی ایسے انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے۔ جو ہمیں سہی اور غلطی کی تفریق سکھا دے۔ ہم جانتے ہیں جیسا کہ ہمارا مذہب اور تعلیمات ہدایت خود ایک مکمل اور بہترین طریقہ حیات ہے لیکن دیوار پر لکھی ہوئی تحریر تب تک قابل عمل نہیں سمجھی جاتی

جب تک اسکا کوئی قابل تقلید نمونہ ہو۔ بچہ اپنے ماں باپ سے سیکھتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو استادوں سے سیکھتا ہے۔ اور اکثر اوقات ان سے مانگنے والا دنیا اور دنیا والوں سے خود ہی سیکھ جاتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر کسی کو ہر مقام پر ایک قابل تقلید نمونہ چاہئے ہوتا ہے اور وہ نمونہ اسکی نظر میں ایک بہترین انسان ہوتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ ایک نمونہ لیکن میں نے اس دنیا کی طرح ایک امیر کبیر انسان کی تقلید کرنے کی خواہش نہیں کی۔ دولت کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک ایسے انسان کے پیچھے چلوں جو اچھا انسان ہو۔ جو ہمارے اس دین سے بے انتہاء محبت کرتا ہو اور جو اسکی سر بلندی کیلئے کچھ بھی کرے۔ جو سچا عاشق رسول ہو۔ میں ڈھونڈتا رہا ڈھونڈتا رہا لیکن مجھے ایسا کوئی ملا۔ جو ملتا پہلے کچھ عرصہ تو ایسے لگتا جیسے میری منزل مل گئی ہے لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر پتا چلتا کہ میں جسے سحر میں پانی سمجھ رہا تھا وہ تو سراب تھا اور حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ اسے چھوڑ دیتا کہ اسکے ساتھ رہ کر میں اسکی خدمت تو کرتا لیکن دین کی نہیں۔ بہت عرصہ بھٹکتا رہا۔ کبھی ایک کے پاس تو کبھی کسی دوسرے کے پاس۔ جب سچائی پتا چلتی چھوڑ دیتا۔ آخر بڑے مولانا صاحب یعنی مولانا عبدالرحمان سے ملا۔ ان سے ملنے سے پہلے میں ایک اچھے اور سچے انسان اور مسلمان کی تلاش سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ ان پر بھی اعتبار نہیں کر سکا۔ گو کہ وہ بہت ہی اچھے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ کچھ عرصہ گزرنے پر پتا چلے گا کہ وہ بھی گزرے ہوئے لوگوں کی طرح ہی ہیں لیکن میں غلط تھا بچے۔ اب کی بار میں غلط تھا۔ میں نے جتنا وقت انکے پاس گزارا نہیں سب سے بڑا عاشق رسول ہی پایا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس دین سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انکے پاس رہ کر میں نے انکے اندر کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ انکا نفس انکا آقا نہیں ہے۔ وہ اپنے نفس کی نہیں بلکہ اللہ کی سنتے ہیں۔ دین کی طرف بلا تے ہیں لوگوں کو تو اپنا فائدہ نہیں دیکھتے۔ بدلے میں کسی سے کھانا نہیں مانگتے۔ دین کی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ لوگوں کو علم دیتے ہیں۔ اور یہ سب بغیر کسی لالچ یا ریا کئی کرتے ہیں۔ صرف اللہ کیلئے۔ اور اس کے رسول کی خوشی کیلئے۔ وہ آہستہ آہستہ بولتے ہوئے اپنی زندگی اور تلاش کی کہانی اسے سناتے جا رہے تھے۔ وہ بڑے غور سے انکی باتیں سن رہا تھا۔ کافی بولنے کے بعد وہ تھوڑا سا ر کے ایک لمبی سی سانس لی اور پھر دوبارہ گویا ہوئے۔

بچے میں نے تمہارے اندر وہی تلاش دیکھی ہے۔ میں جانتا تھا کہ جب تک تمہیں سہی انسان نہیں ملے گا تمہاری روح بھی شہاب الدین کی روح کی طرح ادھر ادھر تلاش میں بھٹکتی رہے گی۔ کچھ کرنا چاہیے گی لیکن لوگ بھٹکائیں گے۔ جس کی تقلید کرو گے اسے ہی غلط پاؤ گے۔ رستہ مل بھی جائے تو اس پر چلنے کی ہمت نہیں ہوگی اور پھر مجھے تو مولانا عبدالرحمان مل گئے تھے۔ تمہیں مل بھی پاتے یا نہیں۔ تو کیا تم بھٹکتے

رہتے۔ جسم کی قید میں پڑی روح ایک بے زبان پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹے۔ ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ جیسے چاہے اپنے دین کی خدمت کر لے۔ چاہے وہ اچھائی کی تعلیم ہو یا برائی سے روکنا۔ اس لیے تمہیں یہاں لے آیا۔ میں تمہاری شکل میں ایک اور مولوی شہاب الدین نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے تمہیں یہاں لے آیا کہ جو مولانا صاحب مجھے بہت دیر بعد ملے تھے وہ تمہیں ابھی سے مل جائیں۔ تم میری طرح بھٹکنے سے بچ جاؤ۔

وہ ایک بار پھر رکے۔ تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ وہ کان لگائے انکی بات کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ بولے۔

وہاں تمہیں اچھے لوگ ملیں گے۔ وہ لوگ جو واقعی دین کے ساتھ مخلص ہیں۔ جو انکی سر بلندی چاہتے ہیں۔ جو انسانوں کو دین کی آڑ میں اپنے مقاصد کیلئے استعمال نہیں کرتے۔

مولوی صاحب پتا کیسے چلتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون غلط ہے؟؟ وہ اس داستان میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔

[illegible]

چھوٹے مدرسے سے بڑے مدرسے کا سفر تین سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ یہ اس بے نام سفر کی ابتدا تھی جس پر وہ ابھی چل رہا تھا اور جو بالکل ہی بے منزل تھا۔

کتنّا مشکل ہوتا ہے کسی انسان کیلئے یہ سوچنا اور مان لینا کہ جس سفر پر وہ بڑے جوش اور جذبے سے نکلا تھا اسکی منزل کوئی ہے ہی نہیں اور اگر کوئی ہوگی تو بھی تو بہت بھیا تک ہوگی۔۔۔۔۔

اور منزل کا بھانک پن وہ کچھ دن سے دیکھتا آ رہا تھا جیسے جیسے اس پر حقیقتیں آشکار ہو رہی تھیں۔۔۔

اور وہی سچ دن

ان پانچ دنوں کے تصور سے وہ ڈر گیا۔ اس نے زور سے سر جھٹک کر اس خیال کو دماغ سے نکال

دیا۔

اس خیال کو تو نکال لیا لیکن ماضی کے تصور سے نہیں نکل پایا۔

صبا میرے کپڑے بیگ میں رکھ دیے؟؟؟ ارسلان نہا کر نکلا تو پوچھا
ہاں وہ تو رات کو سیدٹ کر دیے تھے۔۔۔ میز پر ماشتہ رکھتے ہوئے وہ بولی۔
ارسل جلدی کریں نا۔ اتنی سستی کیوں کر رہے ہیں دیر ہو رہی ہے۔ وہ غصہ ہوئی
ہاں بس میں تیار ہوں۔ ماشتہ کرتا ہوں اور نکل جاتا ہوں۔ وہ کرسی کھینچتے ہوئے بولا
تم ماشتہ کیوں نہیں کر رہی صبا؟؟؟ وہ انڈے اور پراٹھے کا پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی
میں ابو، امی اور کامی کے ساتھ کر لوگی آپ کر لیں ابھی۔ وہ کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔
تو میرے ساتھ کر لو نا ابھی۔ اس نے دوسری کرسی بھی میز کے قریب کر دی۔ وہ بیٹھ گئی۔ ارسل نے
اپنے سامنے رکھی ہوئی چائے کی پیالی اسکی طرف کسکائی۔
میں بناتی ہوں اپنے لیے دو منٹ میں بن جائے گا۔۔۔
ارسل کی انڈے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے لیے انڈا بنانے کیلئے اٹھ
کھڑی ہوئی۔ پراٹھے تو وہ پہلے ہی دو بنا چکی تھی۔ اور چائے بھی زیادہ بنائی تھی۔
اچھا جاؤ بنا کے لاؤ۔۔۔
وہ گئی اور جلدی سے انڈا ہڑائی کر کے لے آئی۔
یہ کیا ارسل آپ نے ابھی تک کھانا شروع ہی نہیں کیا؟؟؟ وہ حیران ہوئی۔
تم نے کہا کہ دو منٹ میں آرہی ہو تو میں اکیلے کیوں کرنا پھر؟؟؟ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔۔۔
گھورنا بند کریں ارسل اور ماشتہ کر لیں جلدی سے۔ وہ نوالہ توڑتے ہوئے مسکرا کر اسے ہی دیکھ
رہا تھا۔ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔
غصے والی بیوی سے اللہ ہر شریف بندے کو بچائے۔ بندہ دیکھ بھی نہیں سکتا اسکی طرف۔ اسے نوالہ
منہ میں ڈالا اور چائے کے سپ لینے لگا۔
ہاں اللہ بچاتا ہے لیکن شریف بندے کو۔ آپ کو اللہ کیوں بچاتا؟؟؟
میں شریف نہیں ہوں کیا؟؟؟
اس وقت تو مجھے نہیں پتا آپ جلدی کریں ماشتہ۔۔۔
اسے فکر تھی کہ وہ وقت پر دفتر نہیں پہنچ پائے گا لیکن ارسلان کو تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ وہ تو ابھی بھی

اپنی ازلی موڈ کے ساتھ ہی ناشتہ کر رہا تھا۔

ارے بھی کرتورہا ہوں۔ ایک ساتھ سارا انڈہ اور پراٹھا نگل لوں کیا؟؟؟

ناشتہ کر کے اس نے جوتے پہنے، ہائی باندھی اور اوپر سوئٹر پہن لیا۔ کافی ٹھنڈ جوتھی۔ اس جلیے میں کافی اچھا لگ رہا تھا وہ۔ صبا نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ گیٹ سے نکلنے سے پہلے صبا نے جو پہلے سے ہی آیت الکرسی کا ورد کر رہی تھی اسے اوپر پھونکے۔

جادو کر رہی ہو کیا میرے اوپر؟؟؟

ہاں جادو کر رہی ہوں تاکہ آپ ٹھیک ٹھاک اور جلدی سے واپس آجائیں۔ وہ اپنے مسکراتے لہجے میں بولی۔

اور وہ چلا گیا۔ ایک ہفتے کیلئے۔ وہ کمرے میں آگئی۔ ابھی اٹھنے میں اور باقی سب کے ناشتے میں کافی وقت تھا اور پھر باہر ٹھنڈ بھی تو تھی نا۔

بھاگنے دوڑنے کی مشق کرتے ہوئے ڈیڑھ مہینہ ہونے کو تھا انکونٹا نے کی اور روز صبح ناشتے کے بعد وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ نٹا نے کی مشق کرتے اور پھر فیض اللہ کے ساتھ اس کھلے میدان میں آجاتے۔ اب وہ دوپہر سے پہلے تین چکر لگا لیتے تھے اور اب انکو اتنی مشکل بھی نہیں ہوتی تھی۔

نٹا نہ باندھنے میں مجاہد اللہ تو پہلے ہی طاق تھا بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت تھی لیکن اب تو اتنے دنوں کے بعد اسکے باقی دوست بھی پکا نٹا نہ لینے لگے تھے۔ نٹا نے کا فاصلہ بڑھاتے بڑھاتے مولوی قدرت اللہ سے کافی دور کر دیتا تو تب جا کر انکا نٹا نہ چوکتا۔ لیکن مجاہد کا نٹا نہ تو تب بھی نہیں چوکتا تھا۔ اسکا نٹا نہ تو تب ہی چوکتا تھا جب نٹا نہ اسے نظر ہی نہ آئے۔ انکے نٹا نے کو پختہ کرنے کے بعد مولوی صاحب ایک دو رین والی بندوق لے آئے۔ دوسرے دن انکی تعداد دو ہو گئی۔ اب وہ اس بندوق سے نٹا نہ لینے کی کوشش کرتے۔ پہلے پہلے تو انہیں بہت مشکل ہوئی لیکن تھوڑی سی محنت کے بعد انکو اس بندوق پر بھی دسترس حاصل ہو گیا۔ اور نٹا نے کے معاملے میں ہمیشہ کی طرح ان سب سے آگے مجاہد ہی تھا۔ نٹا نہ باندھنا اسکے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

بچے تم لوگوں کی نٹا نے کی اور جسم کی منبہوٹی کی تربیت مکمل ہو گئی ہے۔ اب اگلا کام شروع کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ کچھ آرام کر لو۔ اگر گھر جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔

آج انکی تربیت مکمل ہونے پر بڑے مولانا صاحب خود ان سے ملنے آئے تھے۔ ویسے تو ہر جمعے کے دن انکا درس ہوتا تھا مسجد میں لیکن ان پانچوں سے وہ کبھی کبھی الگ سے بھی ملتے تھے اور انہیں اونچ نیچ

سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

گھر جانے کی بات پر وہ سب انتہائی خوش ہو گئے۔ مجاہد کو کافی دنوں سے اماں کی یاد آ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیسی ہوں گی؟؟

حیدر بھی اپنے گھر کو بہت یاد کرتا تھا۔ آخری بار ان کو اپنے گھر گئے ہوئے پانچ مہینے ہونے کو تھے اور اب تو وہ در سے کوچھوڑ کر یہاں بھی آ گئے تھے۔

دوسرے ہی روز انہوں نے کپڑوں کے ایک دو جوڑے اٹھائے اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

رحمتہ میں تیری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ بس اب تو واپس نا جا۔ ادھر ہی رہ لے۔ دیکھ میں کسی کو بولوں گی کہ میرے حافظ قرآن اور عالم بیٹے کو رشتہ دے دو تو دیکھنا کیسا اچھا رشتہ ملے گا۔ وہ جب بھی آتا تھا جیلہ چاہتی ہوتی کہ وہ واپس نا جائے۔

پچھلے تین سال میں وہ سات آٹھ دفعہ ہی گھر جا پایا تھا۔ ایک تو در سے کے قوانین کافی سخت تھے کہ وہ اتنی جلدی نہیں آ سکتا تھا اور دوسرا وہ علاقہ گھر سے اتنا دور تھا کہ اتنا سفر کرنا مشکل ہی ہو جاتا۔ پہلے عرسے میں تو وہ تین چار مہینے بعد آ جاتا تھا لیکن پھر یہ عرصہ بڑھ گیا۔ اور اب کی بار تو وہ تقریباً چھ مہینے بعد جا رہا تھا۔ یہی حال اسکے باقی دوستوں کا بھی تھا۔ ان سات آٹھ چکروں میں ایک وحید علی کی شادی کیلئے بھی تھا۔ جب وہ گھر سے چلا جاتا تو انکے پاس اس سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رہتا۔ اسیلئے جیلہ نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پورے تین مہینے بعد وحید کی شادی کی تاریخ وہ رکھ آئی ہے اسیلئے تین مہینے بعد وہ آ جائے۔ اور وہ پورے تین مہینے بعد گھر پہنچا تو گھر میں تیسری بار شادی کا سماں تھا۔ اسوقت وہ تقریباً تین سال کا تھا۔

اب وہ تین سال کا ایک جوان تھا لیکن اپنی صحت اور جسامت سے بچپن میں سال سے کم نہیں لگتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی اصغر سے قد زیادہ ہو گیا تھا۔ اسکا اور فضل اللہ سے ملنے لگا تھا۔ اماں یہ کیا کر رہی ہو؟؟؟ پاگل ہو کیا؟؟؟ میری شادی کیسے کروگی اور میں شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ حواس باختہ ہو کر بولا۔

کیوں تیری شادی نہیں ہو سکتی کیا؟؟ فضل اللہ نے گھور کر اسکی طرف دیکھا
ابا ہو سکتی ہے لیکن ابھی تو اصغر رہتا ہے۔ اسی کی کرونا۔

لیکن اصغر سے پہلے ہم تیری کرنا چاہتے ہیں اور ویسے بھی تیری اور اسکی عمر میں بہت زیادہ فرق نہیں

ہے اور پھر اسے پہلے تیری شادی ہونے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ جیلہ نے اپنے ترکش کے سارے تیر پھینکے

لیکن اماں میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔ اب آپ ہی سمجھائیں اماں کو۔۔ اس نے پرامید نظروں سے فضل کی طرف دیکھا۔

رحمتہ تیری توجہ گھر کی طرف کرنے کا اس سے بہترین طریقہ کوئی نہیں ہے کہ تیری شادی کر دی جائے۔ شادی ہوگی تو زمرہ داری پڑے گی اور تیرا دھیان بھی گھر میں لگ جائے گا۔ فضل نے بھی مدد سے انکار کرتے ہوئے جیلہ کی طرف داری کی۔

ابا میں کوئی غلط کام تو نہیں کر رہا ہوں۔ دین کی تبلیغ ہی کر رہا ہوں جو میرا کام ہے۔ آپ ہی کی خواہش تھی کہ میں دین کی خدمت کروں۔۔ وہ انک گیا تھا

ہاں تو ہم نے یہ نہیں چاہا تھا کہ تم اتنا دور چلے جاؤ کہ مہینوں مہینوں تمہارا پتا ہی نا چلے۔ یہ کیسی خدمت ہے دین کی۔ ہمیں بھی تو سمجھاؤ۔۔ فضل اللہ بولا۔

ابا میں -----

وہ رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ در سے کے معاملات اور وہاں ہونے والی کسی بھی چیز کے بارے میں گھر والوں سمیت کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے پھر معاملات خراب ہوتے ہیں۔۔

ہاں تم؟؟؟؟؟ جیلہ نے سوالیہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا

کچھ نہیں اماں آپ سمجھ ہی نہیں پا رہے میری بات کو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا اور میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ عرصے بعد میں واپس آجاؤں گا تو تب کر دینا میری شادی لیکن ابھی نہیں کر سکتا۔ اس نے بات کو گھما دیا۔ یہ تو کسی طور نہیں ہو سکتا تھا کہ بڑے مولانا صاحب نے انکو تاکید کی ہو اور وہ اسکو مانا نہیں۔۔

اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اسکا گھر پر تیسرا دن تھا۔ اسے اپنے ماں باپ کی باتیں سمجھ تو آرہی تھی لیکن وہ فی الحال شادی بالکل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسکی ماں نے صرف اسکے زیادہ دن گھر سے دور رہنے کی وجہ سے ایسا کہا ہے اور وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ جلدی گھر آیا کرے اور اس نے پکا ارادہ کر بھی لیا تھا کہ آئندہ وہ دو یا تین مہینے بعد گھر آیا کرے گا۔ وہ بڑے مولانا صاحب سے بات کر لے گا۔ اس لیے صبح ہونے تک رات والی بات کو وہ بھول بھی گیا۔۔

لیکن بھولتا کیسے؟؟؟ اس بات کے تیسرے دن ہی جب وہ اپنے دوستوں سے مل کر واپس گھر

آیا تو جیلہ کو نیم کے درخت کے سائے میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی خوش لگ رہی تھی۔ وہ بھی اسکے پاس جا کر بیٹھ گیا۔۔۔

کیا ہوا ماں؟؟ خوش لگ رہی ہو۔ اس نے چھیڑا
تو خوش ماہوں کیا؟؟ لڑکی دیکھ لی ہے میں نے تیرے لیے۔ وہ خوشی سے بولی
کیا؟؟؟؟ وہ چیختے ہوئے اٹھا۔۔

یہ کیا کہہ رہی ہو ماں؟؟ میں نے کہا تھا کہ مجھے ابھی شا دی نہیں کرنی۔ وہ شدید غصے میں تھا۔
لیکن کیوں رخصتے؟؟ جبکہ کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ وہ اس ہو کر بولی
اماں تجھے محلے کی عورتوں نے کہا کہ اسکی شا دی کر دو یہ گھر رہنے لگ جائے گا اور آپ شروع ہو گئی
شا دی کروانے جب کہ میں نے کہا کہ مجھے نہیں کرنی ابھی۔۔ وہ سخت مایوس تھا
لیکن تم انکار کیوں کر رہے ہو؟؟ وہ بیچاری ابھی بھی اسکے اتنے غصے کی وجہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔
اماں میں نے کہا کہ بس نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔ آپ زبردستی کیوں کر رہی ہیں؟؟؟ وہ انک گیا
جیلہ ہونٹوں کی طرح اسکا منہ دیکھ رہی تھی۔

اماں میں کہہ رہا ہوں کہ ابھی نہیں کر سکتا شا دی۔ جب تیار ہو جاؤ گا تو آپ کو بتا دوں گا۔
اس بار وہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ جمیلا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اور وہ اٹھ
کر کمرے میں آ گیا۔

دن کا کھانا گھر میں موجود چار خواتین اور رحمت اللہ نے بہت خاموشی سے کھایا۔ فضل اللہ ایک
دوست کی عیادت اور ایک جاننے والے کی تعزیت کیلئے گھر سے نکلا تھا اور دن کے کھانے میں شریک نہیں
ہو سکا۔

اب عمر کے اس حصے میں فضل اللہ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ یا تو گھر پر ہی ہوتا اور یا کسی
کے دکھ یا خوشی میں شریک ہو جاتا۔ اسکے چاروں بیٹے اب کام کرتے تھے اور سب کی آمدنی
ملا کر گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ اب گھر میں اتنی تنگی نہیں رہی تھی۔ شام کا کھانا سب نے ایک ساتھ ہی کھایا۔
کیا بات ہے رخصتے؟؟ تمہیں شا دی سے اتنا مسئلہ کیوں ہے؟؟ فضل کو زینت کی زبانی دن کی
ساری بات پتہ چل گئی تھی۔

ابا ابھی شا دی نہیں کر سکتا میں۔ سمجھ کیوں نہیں آتی آپ کو میری بات۔۔۔ وہ پھر ہتھے سے اکھڑنے

لگا۔۔۔۔۔

لیکن بیٹا۔۔۔ فضل نے کچھ کہنا چاہا

ابا آپ سب کو اتنا ہی شوق ہے تو اصغر کی کروادیں نا۔۔
 لیکن ہم تمہاری پہلے کرنا چاہتے ہیں اور۔۔ ظفر پہلی بار گفتگو میں شامل ہوا
 بھائی آپ لوگ چھوڑ نہیں سکتے اس بات کو؟ وہ نہیں مان رہا تھا
 نہیں ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم چھوڑینگے تب جب تو مانے گا۔۔ جمیلہ اٹل لہجے میں بولی۔
 اور وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر کمرے میں آگیا۔ پتا نہیں سب کو کیا ہو گیا ہے۔ پاگل ہو گئے ہیں
 کیا سب؟؟ اس نے تلخی سے سوچا۔

اس سب کا حل یہی ہے کہ میں کل صبح ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ اسے جان چھڑانے کا ایک آخری
 حل سوچھا اور یہی سوچتے ہوئے اس نے اپنے کپڑے تھیلے میں ڈال دیے۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر سب
 سردی سے ٹھنڈتے ہوئے واپس آئے اور اپنے اپنے کمرے میں بستر وں میں دبکے تو وہ اصغر کو کمرے میں
 سوتا چھوڑ کر اپنا تھیلا اٹھائے باہر نکلا۔۔

اماں میں جا رہا ہوں۔۔ کنویں کی طرف سے آتی جمیلہ سے بولا
 کدھر جا رہا ہے تو؟؟؟ پاگل ہے کیا؟؟ ابھی تو چھٹیاں رہتی ہیں تیری۔۔۔
 جلدی آؤنگا اماں۔ اللہ حافظ۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔ جمیلہ پیچھے سے آوازیں دیتی
 رہ گئی لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شا دی کے معاملے کو وہ یہی پر دبا دینا چاہتا تھا۔
 نو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ اپنی تربیت گاہ میں پہنچا تو خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ اس گھر میں مقیم
 لوگ شاید سو رہے تھے۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔
 اسکی آنکھ دو بارہ گھریز کی آواز سے کھلی جو اسے عصر کی نماز کیلئے اٹھانے آیا تھا۔
 وضو کر کے وہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔

بڑے مولانا صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔ نماز پڑھ کر آیا تو تھوڑی دیر بعد گھریز نے اطلاع دی۔ وہ
 ماتحتہ گھر میں بڑے مولانا صاحب کے پاس چلا گیا۔

واپس جلدی کیوں آئے ہوئے؟؟ بیٹھنے کے بعد انہوں نے پوچھا
 کچھ ایسی خاص وجہ نہیں ہے مولانا صاحب۔ بس گھر والے شا دی کرنے کیلئے مجبور کر رہے تھے
 ۔ میں یہاں چلا آیا۔

تو تم شا دی نہیں کرنا چاہتے کیا؟؟ انہوں نے پوچھا
 اسے جیسے سوواٹے کا کرنٹ لگ گیا۔ وہ تو سب کچھ جانتے تھے پھر ایسا سوال کیوں کیا؟؟

آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں شادی کیسے کر سکتا ہوں؟؟ وہ آہستہ سے بولا

شادی کیوں نہیں کر سکتے؟؟ انہوں نے پھر اسے حیران کیا

مولانا صاحب آپ تو خود کہتے ہیں کہ تربیت مکمل ہونے کے بعد مجھے جہاد کیلئے بھیجا جائے گا۔ اور ابھی تربیت ختم بھی ہونے والی ہے اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم مجاہدین کی زندگی اور موت کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ تو ایسے میں میں شادی کیسے کر سکتا ہوں؟؟

ہاں یہ سب میں کہتا ہوں لیکن تم نے غور نہیں کیا میری بات پر بیٹے۔ میں نے اگر کہا ہے کہ مجاہد کی زندگی اور موت کا کوئی پتا نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا کوئی مجاہد شادی ہی نہ کرے۔ اگر زندگی کا پتا نہیں چلتا تو موت کا بھی نہیں چلتا اور زندگی اور موت کا تو اس دنیا میں کسی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ لوگ اچھے خاصے ہشاش بشاش ہوتے ہیں اور اچانک سے ملک الموت آکر روح قبض کریتا ہے۔ کبھی کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی شادی ہی نہ کرے۔

لیکن مولانا صاحب ہم لوگوں کی زندگی تو ہر وقت خطرے میں ہے پھر کیوں کسی کو اپنے ساتھ جوڑ لوں۔ کہ کل کو وہ بھی مجھے بد دعا دیتی رہے۔۔۔

بیٹے تمہاری یا میری زندگی کو ہمارے پیغمبر کی زندگی سے زیادہ خطرہ تو نہیں ہے نا۔ انکی زندگی زیادہ خطرے میں تھی۔ طائف والے انکے دشمن یہودی انکے دشمن کافر انکی جان کے درپے۔۔۔ کون انکا دشمن نہیں تھا۔ انکی زندگی بہت خطرے میں تھی لیکن انہوں نے پھر بھی نکاح کیا اور ایک نہیں کئی کیسے کیوں کہ یہ بھی اللہ کا ایک دیا ہوا فرض ہے ہم مسلمانوں پر۔ نکاح ایک فرض ہے جسے پورا کرنا ہے۔ اور رہی بات زندگی برباد کرنے کی تو ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹے۔ تمہاری بیوی فخر کرے گی کہ وہ ایک مجاہد کی بیوی بنے گی جو صرف اپنا نہیں بلکہ اسکے لیے بھی جنت کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔ وہ تمہیں بد دعا کبھی نہیں دے گی۔ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے انہیں بد دعا دی؟؟ نہیں نا کیوں کہ وہ انکے لیے رحمت کا ذریعہ تھے۔

تو میں کیا کروں؟؟ وہ جیسے راستہ مانگ رہا تھا۔ اپنی غلطی پر مادم تھا

تم نے اپنی ماں اور باپ کو ناراض کیا ہے۔ تم کل صبح ہی صبح دوبارہ روانہ ہو جاؤ اور جا کر اپنے ماں باپ سے معافی مانگو اور شادی کیلئے ہاں کر دو۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور اللہ بھی۔

مولانا صاحب وہ چاہتے ہیں کہ شادی کر لوں تاکہ وہی انکے پاس رہا کروں۔ یہاں کا سب کچھ چھوڑ دوں۔ وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔

یہ جو دین ہے نا بیٹے یہ اپنے عاشقوں کو خود بلاتا ہے۔ تم کچھ بھی کر لو یہ دین اور انکی خدمت سے تم دور نہیں ہو سکتے۔ اور سب سے بڑی خدمت جہاد ہے۔ اسلیے تم اس بات پر پریشان نا ہو کہ تم

مجبور ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گے۔ گھر وہ بیٹھتے ہیں جنہیں اللہ کی محبت کا چسکا نہیں پڑا ہوتا۔ تم کبھی بھی دور نہیں ہو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔

وہ خاموش رہا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کر رہے تھے۔
اور دوسری صبح اس نے دوبارہ وہی کپڑوں کا تھیلا اٹھا کر گھر کی راہ لی۔ مولانا صاحب نے اسے ان دونوں کی مزید چھٹی دے دی تھی جو سفر میں ضائع ہو گئے تھے۔

اماں شا دی کر دیں میری۔ وہ آہستہ سے بولا
کیا؟؟؟؟ جیلہ کا منہ مارے خوشی کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔
تو واقعی سچ کہہ رہا ہے رحمۃ؟؟؟ شا دی کے نام پر اسکے اس شدید عمل کے بعد اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کل غصے میں نکلنے کے بعد آج واپس آیا تھا اور شرمندہ تھا۔
ہاں اماں میں کچھ نہیں کہوٹگا۔ کر دیں آپ جہاں بھی چاہتی ہیں۔ وہ نظریں نیچی کیے زمین کو ہی گھور رہا تھا۔

میں آج ہی تیرے ابا سے بات کرتی ہوں۔ وہ اپنا دریس چاچا ہے نا تیرا۔ جو تیرے ابا کا جگری یار ہے اسکی مٹی عالیہ بہت پسند ہے مجھے۔ وہ بہت خوش تھی۔ شا پید اس خیال سے کہ اب اسکا بیٹا اسکے پاس رہے گا یا پھر اگر پاس نا بھی رہے تو جلدی جلدی ضرور آیا کرے گا۔

ٹھیک ہے لیکن اماں میری چھٹی تھوڑی سی ہے اب۔ دو تین دن۔ پھر میں چلا جاؤنگا۔
تو بیٹا تو اپنا پتا چھوڑ جانا۔ جب رشتے کی کوئی بات بنے گی تو تیرا ابا چھٹی بھیج دے گا۔ پھر تو آ جانا۔
اس نے ایسا حل بتا دیا جو بظاہر تو بہت آسان تھا لیکن حقیقت میں بہت مشکل تھا۔ اور خاص طور پر اس کے لیے۔ انہیں جنتی سے یہ تاکید بھی کی گئی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے اپنے ٹھکانے اور مدد سے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ اور وہ ان ہدایات کا پابند تھا۔

ٹھیک ہے اماں۔ اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جیلہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
رات کو جیلہ نے فضل اور باقی چاروں بیٹوں سے بھی بات کی۔ وہ سب تو پہلے ہی سے یہی چاہتے تھے۔ سو بہت خوش ہو گئے۔۔۔

جیلہ تو زینت یا طاہرہ کو لے کر کل ادریس کے گھر جا اور بات کر لے۔ وہ منع نہیں کریں گی۔ فضل نے تجویز دی۔

اور دوسرے دن ہی جیلہ زینت کو لے کر ادریس اور فیسمہ کے گھر چلی گئی۔ عالیہ کا رشتہ اپنے بیٹے

رحمت اللہ کیلئے مانگئے۔۔

۱ دریس کوفت ہوئے تقریباً دو سال ہونے کو تھے۔ اپنے پیچھے اسنے ایک بیوہ تین بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑے تھے۔ بیٹیاں بڑی تھیں۔ اسکے بعد اللہ نے تین بیٹے دیے تھے جو ابھی کافی چھوٹے تھے۔ بڑا بیٹا لاری اڈے پر ریڑھی لگانا تھا اور فیہمہ خود گاؤں کے واحد سکول میں صفائی وغیرہ کرتی تھی۔ گھر کا گزارہ کافی مشکل سے چلتا تھا۔ اور اوپر سے تین جوان ہوتی بیٹیوں کا بوجھ الگ۔ فیہمہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

فیہمہ نے سوچنے کیلئے کچھ وقت مانگا تھا لیکن جیلہ جانتی تھی کہ وہ انکار کبھی بھی نہیں کرے گی۔ رحمت اللہ کا رشتہ اسکے صحن میں بہار کا جھونکا ہی تو تھا۔

اور جو تھے روز رحمت اللہ واپس چلا گیا۔ اپنے مدرسے اور ٹھکانے کا پتا تو نہیں بتایا لیکن ایک مہینے بعد آنے کا وعدہ کر کے ہی گیا۔

اسکے باقی دوست بھی آچکے تھے۔ اب انکی تربیت کا دوسرا دور شروع ہونا تھا۔

مولانا صاحب نے کہا ہے کہ تم لوگ ناشتے کے بعد میرے یہاں سے تیسرے گھر میں چلے جانا۔ وہاں کنگیل نامی ایک شخص ملے گا۔ وہ تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہوگا۔ مولانا صاحب نے اسے تم سب کے بارے میں بتا دیا ہے۔ گلریز نے صبح ناشتہ دیتے ہوئے اطلاع دی۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہدایات کے مطابق اس گھر سے دائیں طرف تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں چلے گئے۔ وہاں واقعی ایک شخص انکا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اپنی پچھلی دس سال کی زندگی میں مدرسوں میں دیکھے ہوئے لوگوں کے برعکس نامی اس شخص کی داڑھی تھی اور نامی سر کے بال لمبے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ انہی کا انتظار کر رہا تھا۔

السلام علیکم۔۔۔ وہ انکے پاس گئے تو انکے سلام کرنے سے پہلے ہی اس نے پر جوش لہجے میں خود ہی سلام کر دیا۔

بیٹھو بیٹھو۔۔ اس نے انکو بیٹھنے کا کہا اور اس کمرے سے ماحقہ کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو ایک ٹرے میں چائے کے چھ کپ تھے۔ وہ میز پر رکھے تو دوبارہ جا کر کھانے کے کچھ لوازمات لے کر آیا۔

مجاہد اللہ نے یہاں پہلی بار چائے دیکھی تھی ورنہ یہ لوگ سبز چائے ہی بناتے تھے۔ مدرسے میں تھا تو بھی سبز چائے اور یہاں بھی سبز چائے ہوتی تھی۔ بیچ میں جب وہ گھر جاتا تھا تو دودھ والی چائے

پیتا تھا۔ لیکن آج پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔ اور اب تو اتنی عادت ہو گئی تھی کہ دودھ والی چائے مزا بھی نہیں دیتی تھی۔

چائے لے لو بھئی۔۔۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ وہ بسکٹ وغیرہ میز پر رکھتے ہوئے بولا
اور وہ خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرا نام نکلیل ہے۔ ڈاکٹر نکلیل احمد۔ پیشے کے لحاظ سے تو میں ڈاکٹر ہوں لیکن چھیر پھاڑ نہیں کرتا۔ صرف لوگوں کی زہنی بیماریوں کا علاج کرتا ہوں۔ شہروں میں ایسے لوگوں کو سلائیڈ سٹریٹس کہتے ہیں۔ سو میں ایک سلائیڈ سٹریٹس ہوں۔۔۔ وہ ساتھ میں چائے کے ہلکے ہلکے سپ بھی لے رہے تھے۔
تم لوگ مجھے اپنے نام بتاؤ۔۔۔

امیر حمزہ۔۔۔۔۔

عمر فاروق۔۔۔۔۔

سیف اللہ۔۔۔۔۔

مجاہد اللہ۔۔۔۔۔

علی حیدر۔۔۔۔۔

سب نے اپنے نام بتا دیے۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتے رہے۔

اگر تم لوگ میرے جیسے کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو اور یہ سوچ رہے ہو کہ میں یہاں رہنے والوں جیسا نہیں لگتا تو بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میں اس لیے انکے جیسا نہیں دیکھتا کہ میں یہاں رہتا نہیں ہوں۔ میں شہر میں رہتا ہوں لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ میری سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اگر وہاں پر میں داڑھی رکھ لوں اور بال لمبے کر لوں تو لوگ دور بھاگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے انکے جیسے جیسے میں رہنا پڑتا ہے۔ اب خود سوچو کہ جہاں دین اور سنت پر عمل کرنے سے لوگ دور بھاگتے ہیں وہاں کے لوگوں کی زہنی حالت کیا ہوگی۔

آپ یہاں کیوں آئے ہیں اور ہمیں مولانا صاحب نے آپ کے پاس کیوں بھیجا ہے؟؟ حیدر نے سوال کیا۔

میں اس لیے یہاں آیا ہوں کہ میں یہاں آتا رہتا ہوں اور مجھے اسکے پیسے ملتے ہیں اور آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اس بار آپ ہی کیلئے آیا ہوں۔

وہ کافی دوستانہ مزاج کے بندے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ انکے ساتھ ایسے مل گئے جیسے وہ پرانے دوست ہوں۔ کافی دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ سب اپنے اپنے گاؤں کی باتیں کرتے بچپن میں

کھو گئے۔ پھر ہنستے۔ مدر سے کی باتیں ہوتی رہی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اٹھ گئے اور اپنے گھر واپس آ گئے کیونکہ گلریز ان کو بلانے آیا تھا۔

ڈاکٹر ٹکلیل کو چھوڑ کر جانے کا ان میں سے کسی کا بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ تھے ہی اتنے اچھے۔ کتنے عرصے بعد وہ سب ایسے دل کھول کر اور منہ پھاڑ کر بنے تھے۔ اور یہ سب انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ وہ واپس آئے تو استاد جی صحن میں بیٹھے انکا انتظار کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اچھے لگے؟؟؟ انہوں نے پوچھا

جی استاد جی وہ بہت اچھے ہیں۔ انکے ساتھ بہت مزا آیا۔

چلو اچھا ہے اب آ جاؤ میرے ساتھ۔ وہ لوگ پھر سے اس تہہ خانے کی طرف چلے گئے۔

وہاں سے استاد جی نے ایک اور طرح کا بندوق اٹھایا اور انہیں لے کر اس دوسرے گھر میں آ گئے جہاں وہ نٹانے کی مشق کیا کرتے تھے۔

اسکو ماسٹر گن کہتے ہیں۔۔۔ وہ اس بندوق کے بارے میں بتانے لگے۔

اگر تم لوگ کسی چیز پر سوچتے سوچتے تھک جاؤ اور یہ فیصلہ نہ ہو پائے کہ وہ ٹھیک ہے یا غلط؟ یا جب کوئی کام کرنے لگوا اور کچھ سمجھ نہ آئے یا پھر کوئی کام بالکل ٹھیک لگے لیکن دل مطمئن نہ ہو رہا ہو، یا ضمیر کی غلطی باقی ہو تو ایک خاموش سی جگہ میں بیٹھ جایا کرو۔ جہاں بالکل خاموشی ہو۔ کوئی انسان آپکے آس پاس نہ ہو اور پھر اس خاموشی میں آنکھیں بند کر کے خود سے وہ سوال پوچھ لیا کرو۔ یقین کرو جواب خود ہی مل جائے گا۔ یہ جو دل ہوتا ہے اس میں اللہ کا مسکن ہے تو دل سے پوچھنا مطلب اللہ سے ہی پوچھ لینا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ دل کبھی کھل کر قرار نہیں کرتا۔ اسکے پاس کرنے کو صرف دو کام ہوتے ہیں۔ یا تو یہ انکار کرتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے۔ تو اگر کوئی کام ٹھیک نہیں ہے یا ہمارے دل کو پسند نہیں ہے تو سوال پوچھنے پر صاف انکار آئے گا۔ اور اگر کوئی کام اسے پسند ہے تو پوچھنے پر یہ کچھ نہیں کہے گا۔ صرف خاموشی ہی رہے گا۔ پھر ہم سوچتے ہیں کہ آیا یہ ٹھیک ہے یا غلط۔ لیکن یاد رکھو کہ جس چیز میں اندر سے خاموشی کی آواز آئے۔ بالکل گہری خاموشی تو سمجھ جاؤ کہ تم کسی غلط رستے پر نہیں ہو۔ اور اندر کی خاموشی ہی اس بات کا اقرار ہے کہ آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ آپ لوگ خود تجربہ کر لیں اس چیز کا۔ یقین جانیئے اس خاموش جگہ سے اٹھنے سے پہلے ہی سکون کی ایک بہت بڑی لہر آپکے سر آپے میں سرایت کر جائے گی اور آپ ایک ان ہوا سکون محسوس کریں گے۔ کیونکہ آپ نے خود کو اللہ کی مرضی کے سپرد کیا ہوگا۔ انہیں ڈاکٹر ٹکلیل کے پاس آتے ہوئے آج آخری دن تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ رہ

کر چلے جا بیٹھے۔ اور کل وہ جانے والے تھے۔ ڈاکٹر ٹکلیل کی شخصیت سے وہ کافی متاثر تھے۔ انکی باتیں دلوں کو چھوتی تھی۔ زہنوں کی پیچیدہ گھتیاں سلجھانے میں وہ بہت ماہر تھے۔ جانے وہ کیسے جان لیتے تھے کہ انکے زہنوں میں کن سوچوں کا بسیرا ہے لیکن جب بھی وہ ان سے مل کر آتے تھے واقعی سکون کی ایک لہر بدن میں پھیلی ہوتی تھی۔

کافی دیر تک باتیں کر کے وہ واپس آئے تو انہیں اپنی گھتیاں کو سلجھانے کا طریقہ مل گیا تھا۔ اب وہ بہت پرسکون تھے۔ اس ایک ہفتے کے دوران انہوں نے ڈاکٹر ٹکلیل سے ان سب باتوں پر بھی بحث کی جن کے بارے میں وہ کبھی کبھی پریشان رہتے تھے۔ جیسا کہ مجاہد اللہ کا سب سے پہلا استاد قاری ادریس جواسے ہمیشہ ایسی کسی بھی چیز سے منع کرتا تھا جس سے کسی کو نقصان پہنچے۔ چاہے سامنے والا بندہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ یا پھر اسکی ماں جیلہ جواسے ہر وقت اپنے پاس رکھنے کی ترکیبیں سوچا کرتی تھی۔ تو اسکا حق ضروری تھا کہ دین کا؟؟؟ وہ بھی تو ماں ہے۔ اور ماں کیوں روئے؟؟؟

یا پھر علی حیدر کا معذور باپ جو چاہتا تھا کہ وہ اسکے پاس آ کر اسکی کچھ خدمت کر لے لیکن اسکے گھر میں تو دوسرے بھائی ہیں اور گھر کا خرچہ وغیرہ بھی تو کافی اچھے سے چل رہا ہے پھر وہ صرف باپ کے ساتھ رہنے کیلئے اتنے عظیم مقصد کو کیوں چھوڑے۔۔۔۔

اور کل وہ چلے جائیں گے۔ لیکن انہیں ایک سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت دے کر۔ فیصلے کیا تھے یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ ڈاکٹر ٹکلیل کے آنے سے انکے سوچنے کا زاویہ تو نہیں لیکن سوچنے کا انداز کافی حد تک بدل گیا تھا۔

اور زندگی کا ڈگر بدلنے کیلئے سوچ کا انداز نہیں زاویہ بدلنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تو ہر انداز سے سوچ کر ایک ہی فیصلے پر پہنچا جاتا ہے۔

اور پیچھی نہیں جانتا ہوتا کہ شکاری کس طرح سے اسے پھنسا رہا ہے۔ دراصل شکاری کا دانہ ہی تو اس کی اصل چال ہوتی ہے۔

اپنے وعدے کے مطابق ایک مہینے بعد وہ گھر آیا۔ تو جیلہ نے انکی شادی کی بات چکی کر دی تھی۔ اس بار وہ آیا بھی صرف تین دنوں کیلئے تھا۔ جیلہ بہت خوش تھی۔ عالیہ کیلئے کچھ کپڑے اور معمولی سا زیور بھی بننے کیلئے دیا گیا۔ اب گھر میں اتنی تنگی نہیں رہی تھی۔ مغرب کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد وہ اور فضل قاری ادریس کے پاس بیٹھ گئے۔ قاری ادریس اب جوانی کی عمر سے نکل کر اذیت عمری میں داخل ہو گئے تھے۔ جب رحمت علی انکے پاس پڑھتا تھا تب تو وہ تیس تیس سال کے جوان تھے لیکن اب

پنالیس چھیالیس سال کے درمیانی عمر کے آدمی تھے۔

رحمت بیٹے میں اکثر تمہارے والد سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کا مدرسہ کدھر ہے تو انکو نہیں پتہ ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ وہاں کیا کر رہے ہو جبکہ ابھی آپ کی تعلیم بھی ختم ہو چکی ہے تو انہیں آپ کے وہاں رہنے کی وجہ کا نہیں پتا۔ بیٹے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کوئی آپ کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر آپ کو غلط راستے پر ماڈال دے۔ وہ اپنے مخصوص میاں نہ روادار میں بولتے رہے۔

قاری صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم بس تبلیغ کا کام کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ ہمارا کوئی غلط راستہ ہے ہی نہیں تو اس راستے پر جاؤنگا کیسے۔ وہ پر اعتماد تھا۔

بیٹے تم کہاں رہتے ہو آج کل؟

میں مدرسے میں رہتا ہوں۔ مختصر جواب

کوئٹہ مدرسے میں اور کہاں واقع ہے یہ مدرسہ؟ وہ پتا پوچھ رہے تھے

یہ میں نہیں بتا سکتا قاری صاحب۔ مدرسے کا قانون ہے کہ کسی کو بتایا جائے۔ اس نے مدرسے میں کئی بار سنی ہوئی بات دہرائی۔

کیوں؟؟؟ وہ حیران ہوئے

قاری صاحب ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس میں کھلم کھلا تبلیغ کا کام کرنا اتنا آسان نہیں ہے جس معاشرے میں داڑھی والے کو مزاق کا نشانہ بنایا جائے اور تبلیغ کرنے والے کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ اور ناچ گانے اور بے حیائی کو اچھا کہا جائے اس میں ہم تبلیغ کا کام کھلم کھلا کیسے کر سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد دین کی سر بلندی ہے۔ شہادت کا حصول تو نہیں۔ کہ ہم کام کریں اور کوئی گولی سے اڑا دے۔ اس کا جواب بہت تفصیلی تھا۔

قاری صاحب منہ کھولے اسے دیکھتے جا رہے تھے۔ اگر وہ ہندو ہوتے اور جنموں پر یقین کرتے تو

آج ضرور مان جاتے کہ رحمت اللہ کی شکل میں ایک اور ہارون نے جنم لیا ہے

رحمت اللہ ایک سچی کہانی سنو گے؟ بلکل تم جیسے ہی ایک لڑکے کی کہانی ہے۔

سنائیں قاری صاحب۔

میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں۔ ہارون نام تھا اس کا۔ وہ بھی بلکل تمہاری طرح جذباتی تھا۔ کسی بھی طرح سے دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ ایک بہت بڑا عالم بننا چاہتا تھا۔ شہادت بھی چاہتا تھا۔ اور یہی حصول علم کا شوق اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں اسے لگا کہ اسکی منزل اسے مل گئی ہے۔ اس کے ماں باپ

اسکے اتنا دور جانے کے ارادے کے خلاف تھے لیکن وہ نہیں مانا۔ اسکی منزل اسے مل ہی گئی۔ اسے مختلف قسم کی تربیت دی گئی۔ مختلف اسلحہ چلانے کی۔ یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے۔ وہ خوش تھا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ اسکا اللہ اس سے خوش ہے۔ تربیت دے کر اسے ایک غیر قانونی طریقے سے سرحد پار بھیجا گیا۔ وہاں اسے روسیوں سے لڑنے کا کہا گیا۔ وہ لڑتا رہا لیکن کچھ عرصے بعد اسے کہا گیا کہ وہ جا کے ایک بازار میں دھماکہ کر دے۔ وہ حکم کے مطابق وہاں گیا لیکن جیسے ہی اس نے دھماکے کا ارادہ کیا اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ قریب میں ہی ایک ٹولی سی بنا کر ایک جماعت کی شکل میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اسکے اندر سے اسکے ماں باپ کی تربیت جاگی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا لیکن ایک مسلمان کا قتل کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے خود کو قتل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اندر کا مسلمان اسے دوسرے مسلمان نمازی کے قتل کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ یہاں دھماکہ کیے بغیر اپنے سردار اور ساتھیوں کے پاس گیا تو کوئی بھی اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ انکی نظر میں ایک غدار ہوگا اور غدار کی سزا وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن وہ دھماکہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگا۔ آبادی سے باہر آ کر اس نے اس مواد کو ضائع کیا اور بھاگ گیا لیکن بھاگتا تو کہاں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکے ساتھیوں کو دھماکہ نہ ہونے اور اسکے بھاگنے کی خبر ملنی تھی اور اسکے بعد وہ اسکی تلاش شروع کر دیتے۔ اور اگر وہ انکے ہاتھ لگ جاتا تو اسکی بوٹی کا بھی پتہ ملتا۔ وہ بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ بغیر کوئی سمت جانے، بغیر راستے بغیر منزل اور بغیر مسافت کے پتے کے لیکن وہ چلتا رہا۔ مسلسل تین دن چلنے کے بعد اسے کہیں چھوٹا سا ٹھکانہ مل گیا۔ ایک دو دن اسنے وہاں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ گزارے اور پھر منزل کا پتا کر کے وہ دوبارہ روانہ ہوا۔ مزید چار دن بعد وہ سرحد پر پہنچا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ کیسے ثابت کرنا کہ وہ پاکستانی ہے۔ وہ کچھ عرصہ جیل میں رہا۔ اس نے اپنے علاقے کا اور اپنا پتا بتا کر گھر سے کسی کو بلانے کی درخواست کی لیکن گھر سے کوئی نہ آیا۔ آخر کافی وقت بعد اسکے باپ کا ایک دوست اسکے پاس آیا اور اسکی شناخت کر کے اسکی ضمانت کر دی۔ وہ انکے ساتھ اپنے گھر آیا۔ لیکن یہ کیا؟؟؟ اسکا گھر کہاں تھا؟؟ جبار چچا کے گھر کے سامنے ہی تو اسکا گھر تھا لیکن اب تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس جگہ جگہ سے زمین کالی تھی جیسے جل گئی ہو۔

تمہارا گھر جل گیا ہے بیٹا۔ پیچھے کھڑے جبار چچا نے کہا۔

اسنے پیچھے مڑ کر جبار چچا کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہے تھے۔ لیکن وہ رو کیوں رہے تھے۔

تو چچا گھروالے کہاں ہیں۔ اسے اپنے ماں باپ، بیوی، دو جوان بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کی فکر ہوئی۔

تو چل بیٹا میرے ساتھ بتاتا ہوں۔ جبار چچا بولے۔
لیکن چچا بتا تو دیں نا کہ وہ سب کہاں ہیں۔ مجھے پتا تو دے دیں انکا۔۔۔ وہ فکر مند تھا
تو چل بیٹا میرے ساتھ بتاتا ہوں سب تجھے۔ بس تو چل نا۔ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ
گھر لے آئے۔
چچا اب بتا بھی دیں انکا پتا کہ وہ سب کہاں رہتے ہیں اب۔ گھر جل جانے کے بعد وہ کہاں چلے گئے

وہ اب اللہ کے پاس رہتے ہیں بیٹا۔

کیا؟؟؟؟؟ وہ زور سے چیخا۔

ہاں بیٹا۔ صرف گھر نہیں جلا تھا۔ گھر کے مکین بھی جل گئے تھے۔ گھر کو چاروں طرف سے آگ نے
ایسا گھیرا تھا کہ باوجود کوششوں کے کسی ایک بھی انسان کو زندہ نہیں بچایا جا سکا۔ محلے داروں نے بہت
کوشش کی۔ کئی ایک تو جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آگ میں بھی کودے لیکن بے فائدہ رہا سب کچھ
اور دوسرے دن گھر کے بلے سے چھ لاشیں اس حالت میں ملی کہ کسی کی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی۔ گھر کی
راکھ میں سے لاشیں بہت مشکل سے الگ کی گئی۔ غسل کیسے دیا جاتا؟ وہ بیچارے تو ویسے بھی شہادت کی
موت مرے تھے۔ بے گناہ تھے سارے۔

یہ کب ہوا چچا؟؟؟ انکی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔

رمضان کی نویں رات کو۔۔۔ جبار چچا نے بتایا

کیا؟؟؟؟؟؟؟ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس کی نیس پھٹ رہی تھی۔

یہ ٹھیک وہی تاریخ تھی جس شام وہ بازار میں دھماکہ کرنے کی بجائے بھاگ گیا تھا۔ اسکے بعد وہ
بھگتا رہا۔ اور کافی عرصہ جیل میں بھی رہا۔

تو اسکا مطلب تھا کہ اسکے بھاگنے کا بدلہ انہوں نے اسکے خاندان سے لیا تھا۔

انکی کچھ عجیب دیوانوں سی حالت ہو گئی تھی۔ بس ایک جگہ بیٹھے بیٹھے گھنٹوں ایک ہی نقطے
کو گھورتا رہتا۔ نیند تو انکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لیکن جب کبھی بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتا تو ایک جھٹکے سے
ڈروانے خواب کی وجہ سے جاگ جاتا۔ کافی عرصہ وہ اسی حالت میں رہا۔ وہ جان نہیں پا رہا تھا کہ انکی
خدا کی سزا اسکے خاندان سے کیوں لی گئی۔ وہ سارے تو بے گناہ تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ
کس ورکس کے جرم کی پاداش میں جل رہے ہیں۔

پھر کیا کیا اس نے قاری صاحب؟؟؟ اب وہ دلچسپی سے سن رہا تھا

بس پھر ایک دن اس نے جبار چچا کو صرف اتنا بتا دیا کہ وہ یہ علاقہ چھوڑ کر جا رہا ہے۔ کوئی جامد اور غیرہ اسکی تھی نہیں۔ بس صرف ایک خاندان تھا جو کہ اب نہیں تھا اور اسی رات وہ جبار چچا کا گھر چھوڑ کر کسی ایسی منزل پر چلا گیا جہاں اسکا پتا کسی کو بھی مانتا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل دیا۔ اور اسنے سہی معنوں میں دین کی خدمت کا کام شروع کر دیا۔ آج اسے کوئی بھی ہارون کے نام سے نہیں جانتا۔

آپ اسے جانتے ہیں قاری صاحب؟؟؟

سوال تھا یا آگ کا کولہ جس سے قاری صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کافی دیر وہ چپ رہے جیسے اپنی ہمتیں مجتمع کر رہے ہوں یہ بتانے کیلئے کہ وہ اسے جانتے ہیں۔

مجھے لگ رہا ہے کہ آپ اسے جانتے ہیں۔ اس نے دوبارہ وہی سوال کیا

جانتا ہوں بیٹا اور صرف میں ہی تو جانتا ہوں اسکے بارے میں۔ آخر بڑی مشکل سے وہ یہی کہہ سکے۔ تو مجھے بتا دیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔۔۔

تم ملنا کیوں چاہتے ہو بیٹے؟؟؟ انہوں نے دھیمی سی آواز میں پوچھا

تاکہ ان سے مل کر تسلی کر لوں کہ آیا یہ کہانی سچ ہے بھی کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے قاری صاحب کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو اور اسکی اصل کہانی ایسی ما ہو یا پھر کچھ تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ کچھ وجہیں مختلف ہوں۔ اگر آپ اسے ابھی تک جانتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اتنی دور نہیں رہتا ہوگا کیوں کہ کسی نے آپ کو کبھی کہیں دور جاتے نہیں دیکھا۔ آپ بس مجھے بتا دیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔۔۔

اور اگر میں مانتا ہوں تو؟؟؟ جانے کیا امید تھی انہیں

تو پھر میں اس ساری کہانی کو سچ نہیں سمجھوں گا۔ قاری صاحب آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنا رستہ ترک کر لوں اور آپ مجھے ایسی کہانی سنارہے ہیں جس کا کسی سے تعلق نہیں ہے۔ ایسی کہانیوں پر زندگی تو ترک نہیں ہوتی ما قاری صاحب۔

اور اگر اس سے مل لو گے اور تسلی ہو جائے گی تو واپس آ جاؤ گے اس راستے سے؟؟؟

وعدہ نہیں قاری صاحب لیکن سوچ لوں گا۔ لیکن یہ سوچ بھی میں ہارون سے ملنے کے بعد ہی

سکتا ہوں۔

تو پھر مل لو ہارون سے۔۔۔۔۔

کہاں ملوں؟ آپ بتا دیں تو ہی ملوں گا نا۔

یہ جو تمہارے سامنے قاری اور بس بیٹھا ہے یہی ہارون ہے بیٹا۔ آواز ایسی لگی جیسے گہری کھائی میں سے آرہی ہو۔

کیا؟؟؟؟؟؟؟؟ وہ فقر سا چیخا۔

ہاں بیٹا یہی سچ ہے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ جو میں نے کہا وہ لفظ بہ لفظ سچ تھا۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا میں نے۔ اب تم نے خود ہی سوچنا ہے اور خود ہی فیصلہ بھی کرنا ہے۔ بیس سال کے جوان مرد میں عقل کی کمی نہیں ہوتی۔ اپنی یہ کہانی میں نے پچھلے بیس سال سے کسی کو نہیں سنائی۔ جبار چچا کے گھر سے نکل کر میں ایک گاؤں میں گیا اور وہاں امام بن گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہاں سے بھی نکل کر یہاں آ گیا اور اب کتنے عرصے سے یہاں ہوں۔ بیٹے جب سے تم نے مدرسے جانے کی ضد کی تھی میں اسی دن سے تمہارے اسی فیصلے کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم جہاں جا رہے ہو وہاں کیا ہوتا ہے لیکن میں تمہارے اندر ایک دوسرے ہارون کو دیکھ چکا تھا۔ اس لیے بہت بار فضل کو بھی روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ تمہاری کچھ حرکتوں سے اتنا پریشان ہے کہ تمہیں بھیجنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ یا پھر شاید اسے امید تھی کہ وہاں تربیت ہو جائے گی۔ یہ کہانی آج سے بیس سال پہلے دفن ہوئی تھی لیکن آج پھر زندہ ہو گئی۔ صرف اس لیے کہ تمہیں ہارون بننے سے بچالوں۔ اب تم جاؤ اور اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کر لو۔ خوب سوچ سمجھ کر۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا فیصلہ سمجھداری کا ہوگا۔۔۔۔۔

وہ آہستہ سے اٹھ گئے اور مسجد کے اندر اس کمرے میں چلے گئے جہاں وہ رہتے تھے۔

قاری صاحب میں ہارون بن گیا ہوں۔ بلکہ ہارون سے بھی بری حالت میں آ گیا ہوں۔ ہارون کو تو اللہ نے دوسرا موقع دیا کہ وہ اپنی پچھلی زندگی سے توبہ کر لے۔ مجھے تو یہ موقع بھی نہیں دے رہا۔ آپ نے کہا کہ فیصلہ کر لو اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ اپنی زندگی کا ایک اور غلط فیصلہ۔ لیکن میں کیا کرتا۔ اس وقت تک میں دلدل میں اتنا دھنس چکا تھا کہ نکلنے کا راستہ نہیں تھا میرے پاس۔

میں بہت گناہگار ہوں قاری صاحب۔۔۔ بہت گناہگار۔۔۔ ہارون سے بھی زیادہ۔۔۔ پھر اللہ مجھے ہدایت کیوں دیتا؟؟؟

اور دو آنسو آہستہ سے اسکے گالوں پر بہہ نکلے۔ وہ تصور میں قاری اور بیس سے مخاطب تھا جو اسے اس رستے پر چلنے سے روکنے کی بے انتہا کوشش کرتے تھے جس پر چلنے پر اب وہ پچھتا رہا تھا۔

یہاں کیا کر رہے ہو مجاہد؟؟؟ عمر اسے ڈھونڈتا ہوا آیا

کچھ نہیں یا ربس ایسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

تمہیں آخر ہوا کیا ہے یا رب؟ تم اتنے پریشان اور بیزار کیوں رہنے لگے ہو؟ کچھ بتاؤ تو۔ وہ سب اسکی

فکر کرتے تھے۔

کچھ نہیں یار۔ بس یہ زندگی کبھی کبھی ایک بوجھ بننے لگتی ہے۔ اور جب زندگی خود ہی بوجھ ہو تو انسان بیزار تو ہو جاتا ہے۔ وہ نفاہت بھرے لہجے میں بولا۔

کیا مطلب ہے تمہارا یار؟ تم مجھے الجھا رہے ہو۔۔۔ وہ اور الجھ گیا
تو میں تمہیں الجھن سے نکال نہیں سکتا عمر۔۔۔ جو خود الجھنوں کو سلجھا نہیں پارہا وہ تمہیں کیا نکالے الجھن سے۔ تمہارے لیے اچھا یہ ہے کہ میری فکرنا کرو۔
میں سمجھ نہیں پارہا۔۔۔ وہ اسکی باتیں بالکل نہیں سمجھ پارہا تھا اور وہ غلط بھی نہیں تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے کوئی بھی تو اسکی باتیں نہیں سمجھ پارہا تھا۔

تم تبھو گے بھی نہیں اور کبھی سمجھنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ یہ التجا ہے میری تم سے اور دعا بھی کرنا ہوں کہ تم میں سے کوئی کبھی نا سمجھے ورنہ بالکل میرے جیسے ہو جاؤ گے اور پھر زندگی تمہیں بھی بوجھ بننے لگے گی۔ بس میری بات مان لو کہ مجھے میرے حال پر رہنے دو ورنہ پچھتاؤ۔ تمہارا بھی مقدر ہو گئے۔ وہ ایک نقطے کو گھورتے ہوئے بولا

تم پچھتا رہے ہو؟؟؟ عمر نے حیرانگی سے پوچھا کیونکہ جہاں تک وہ مجاہد کو جانتا تھا وہ کبھی نہیں پچھتا یا تھا۔

ہاں۔۔۔۔۔ جواب بہت مختصر تھا

لیکن کیوں؟؟؟ میرا مطلب ہے کس بات پر اور کس فیصلے پر؟؟؟
کاش کہ میں کسی ایک بات پر اور کسی ایک فیصلے پر پچھتا تا تو تمہیں بتا بھی دیتا لیکن میری زندگی تو پوری کی پوری ہی پچھتاوہ ہے۔ ایک ایک لمحے کا پچھتاوہ۔ اور میں اب تمہیں ایک ایک لمحے کا تو نہیں بتا سکتا مایا اور جب گزرا ہوا ہر لمحہ پچھتاوا ہو تو گزرتا ہوا ہر لمحہ اذیت بن جاتا ہے۔۔۔ وہ تلخی سے مسکرایا
تم کبھی بھی ایسا نہیں بولے مجاہد۔۔۔۔۔ عمر کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ بہت الجھ گیا تھا وہ بھی۔۔۔

یہ بھی ٹھیک کہا تم نے کہ میں کبھی بھی ایسا نہیں بولا۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اب میں کبھی بھی ویسا نہیں بول پاؤں گا۔۔۔

لیکن ایسا کیا ہوا ہے یار؟؟؟ وہ چیخا

عمر یا کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی زبان بالکل بند ہوتی ہے۔ ایک قفل ہوتا ہے جو ہونٹوں کو بند کیے رکھتا ہے۔ ہماری لاکھ خواہش کے باوجود بھی ہم اس قفل کو توڑ نہیں پاتے۔ اور میں اپنی عمر کی اس

جگہ پر آکر سمجھ گیا ہوں کہ ہونٹوں کا قفل اور بے بسی کی رسیوں کو توڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے جیسے آپ ننگے پاؤں خاردار رتا پر چل رہے ہوں۔ بہت بڑی قربانی مانگتا ہے یہ سب۔ اتنی بڑی کہ مجھ میں ہمت نہیں ہے وہ قربانی دینے کی۔۔۔ وہ انجان لہجے میں بولا۔ ایسا لہجہ جو عمر کیلئے تو بالکل انجانا تھا۔ وہ ہونٹوں کی طرح اسکی طرف دیکھے جا رہا تھا

میں نے کہا تھا تمہیں عمر کہ تم میرے پاس اپنی الجھن سلجھانے کیلئے بیٹھو گے تو مزید الجھ جاؤ گے لیکن سلجھا نہیں پاؤ گے اپنی الجھن۔۔۔ وہ پھر تلخی سے مسکرایا۔۔۔

ما میں سمجھ پا رہا ہوں اور ماتم بتا رہے ہو کہ ایسی کیا الجھن ہے تمہیں۔ لیکن میں دعا کرونگا کہ تمہاری الجھن جلد سے جلد ختم ہو جائے۔۔۔۔۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا

تو پھر جلد سے جلد میری موت کی دعا کر لو۔۔۔ وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولا
عمر مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔۔۔

اور عمر کی آمد اور اس سے باتوں کے ساتھ وہ اپنی ماضی سے نکل آیا تھا۔ اپنے بچپن سے اب تک کی زندگی کو وہ آج ایک بار پھر بسر کر چکا تھا۔ اور اس زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو اسے خوشی دیتا۔ ہر لمحے پر اور زندگی کے ہر فیصلے پر پچھتا رہا تھا وہ۔

کاش مجھے کوئی سچائی پتانا چلتی اور کسی دن میں بھی جنت کی امید اور خواہش میں اپنی موت کو شہادت سمجھ کر گئے لگا لیتا۔۔۔ اس نے تلخی سے سوچا اور پھر ظہر کی نماز کی تیاری کیلئے اٹھ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجاہد بیٹا مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا اگرچہ میرا بہت دل تھا کہ تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر مجبور کیا جائے لیکن کچھ بھی کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ بس یوں سمجھ لو کہ جو بندہ خود اتنا مجبور ہو وہ کسی اور کی مجبوری سمجھ تو سکتا ہے لیکن اسے ختم نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ بہت افسردہ تھے۔
ایسی کوئی بات نہیں ہے تشکیل بھائی۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے اور مجھے آپ سے تو کیا اپنی قسمت سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ گلہ تو تب ہوتا جب کچھ میری مرضی کے بغیر ہوا ہو۔ یہ سب تو میری مرضی سے ہوا میں نے خود منتخب کیا تھا۔ مجھے تو روکا گیا، سمجھایا گیا، ڈرایا گیا۔ وہ ایک شخص تھا جس نے کیا کچھ نہیں کیا مجھے یہاں آنے سے روکنے کیلئے۔ اب اسے کہتا رہا کہ کچھ بھی کر لو لیکن اسے جانے مت دو۔ میں اسے پڑھایا کرونگا اور ابامان گیا تھا لیکن میں نہیں مانا۔ اور ایک اماں تھی جس نے میرا نام اس امید پر رحمت رکھا تھا کہ میں اپنے نام کی لاج رکھوں گا۔ مجھے عالم بنانا چاہتی تھی کہ اللہ میرے ساتھ انہیں بھی بخش دے

گا لیکن مجھے دیکھیں میں وہ بن گیا ہوں کہ جسکے خواب میں آکر بھی وہ کہتے ہیں کہ رحمت تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ آپ یقین کریں ٹھیکل بھائی کہ وہ ڈرگئی ہے۔ وہ ڈرگئی ہے کہ اللہ میرے ساتھ اسے بھی دوزخ میں ڈالے گا جب روز حشر اعلان ہوگا کہ جیلہ بی بی کا ظالم اور قاتل بیٹا رحمت اللہ سامنے آجائے اور وہ اپنے گناہوں کے انبار رسمیت آجائے گا اور اسے کوئی معافی ملنے کی بھی کوئی امید نہیں ہوگی تو ماں کا دکھ اور شرم سے کیا حال ہوگا۔ سو وہ دعا کر رہی ہے کہ اللہ مجھے روز قیامت اسکے نام سے مابلایے۔ اب آپ بتائیں ٹھیکل بھائی جسکی ماں بھی اسکے نام سے بھاگ رہی ہو اور ڈر رہی ہو وہ شخص میرے ہی جیسے حالات کا مستحق ہے؟؟؟؟

میں نے کس کس کو دکھ نہیں دیا ٹھیکل بھائی۔ ماں نے شا دی کروادی کہ میں اس رستے پر چلنے سے رک جاؤنگا لیکن میں نے کیا کیا؟؟ میں اس معصوم لڑکی کو غازی کی بیوی یا شہید کی بیوہ بنانے کے شوق میں اسے دو مہینے بعد چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بھی روکتی رہی۔ وہ بیمار تھی کہہ رہی تھی رحمت اللہ رک جاؤ لیکن میں نہیں رک۔ پھر دوبارہ گیا تھا تو وہ میرے بیٹے کو جنم دے چکی تھی۔ میں صرف پندرہ دن رکا۔ میرا بیٹا صرف ایک مہینے کا ہو گیا تھا۔ میں نے واپسی کیلئے سامان باندھا تو وہ رونے لگ گئی۔ کہہ رہی تھی کہ اب تو رک جاؤ رحمت۔ اولاد تو بہت بڑے بڑوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے تمہاری کیوں نہیں بن رہی۔ اور ماں نے تو مجھے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر میں آ گیا یہ بتا کر کہ میں تبلیغ کا کام کر رہا ہوں۔ میں دین کی خدمت کر رہا ہوں۔ کسی قیمت پر نہیں رک سکتا اور پھر میں نے دین کی خدمت کے نام پر کیا کیا؟؟ ڈھیر سارے انسانوں کی جانیں لیتا رہا۔ اتنے سارے بچوں کو یتیم کر کے جانے کس جرم کی سزا دی میں نے۔ ٹھیکل بھائی کہتے ہیں کہ اگر کسی کی دعا قبول نہ بھی ہو رہی ہو تو ماں کی پھر بھی ہو جاتی ہے تو دیکھ لیں مجھے کتنی ماؤں کی بددعائیں لگی ہیں جن کی گودیں میں نے اجاڑ دی ہیں۔ میں نے کتنے باپوں سے انکا جوان بازو چھینا ہے جب شہر کے اس بھرے بازار میں میں نے اندھا دھند فارنگ کی تھی۔ کتنے بچوں کو یتیم کیا جب افغانستان میں میں نے بس میں بم رکھ کر دھماکہ کیا۔ کتنی سہاگنوں کو میں بیوہ کر چکا ہوں۔ تو وہ بددعائیں بھی تو لگی ہیں نا مجھے۔ بددعاؤں کا ایک بہت بھیا نک سایہ ہے میرے پیچھے بھائی۔ اس میں آپ کا یا کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

مجاہد وہ لوگ تمہیں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ تم میں سے جس جس نے جب جب جو جو کرنا ہے وہ سب تم لوگوں کو بتا دیا گیا ہے لیکن بس ایک ہی بات ایسی ہے جو تمہیں نہیں بتائی گئی۔ لیکن میں نہیں بتا سکتا تمہیں۔ اس کمرے میں کیمرے لگے ہوئے ہیں جس سے ہماری باتیں سنی جاسکتی ہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ تم سے میری ملاقات دوبارہ ہو بھی پائے گی یا نہیں لیکن میں دعا کرونگا کہ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش

رکھے اور اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

کیا مطلب ہے اس بات کا تکلیل بھائی؟؟؟ ہماری ملاقات دوبارہ کیوں نہیں ہوگی؟؟ وہ ٹھنکا۔
کیوں کہ کل تم لوگ چلے جاؤ گے اور اسکے بعد میں بھی نکل جاؤنگا۔ پھر کچھ دنوں بعد مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے وہاں ایک دو مہینے تو لگ جائیں گے اور جب تم واپس آؤ گے تو تم کتنا عرصہ یہاں پناہ میں رہو گے یہ میں نہیں جانتا۔

ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔۔۔ وہ جانے لگا

مجاہد۔۔۔۔۔ انہوں نے آہستہ سے کہا

مجھے معاف کرنا میں چاہتے ہوئے بھی کچھ باتیں تمہیں بتا نہیں سکا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں وقت کے ساتھ پتا چل جائیں گی۔ کوئی وقت آئے گا جب تمہیں میری خاموشی کا مطلب پتا چل جائے گا۔
ٹھیک ہے تکلیل بھائی اگر آپ بتا نہیں سکتے تو میرا خیال ہے کہ ایسی باتوں سے میں پھر مزید پریشان ہو رہا ہوں۔ آپ بس دعا کریں کہ میں کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں۔ مجھے ایسا مقصد دیا گیا ہے جس کو پورا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا کوئی معجزہ کر دے اللہ کہ میں کوئی مزید ظلم نہ کر پاؤں۔۔۔
اور اسکے بعد وہ وہاں نہیں رکا۔ کل صبح انہیں روانہ ہونا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد وہ پانچوں مزید چار افراد جن میں مولوی بلال بھی شامل تھے کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ کر نکل گئے۔ منزل کا ان پانچوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس اتنا بتایا گیا تھا کہ انہیں منزل کی فکر نہیں کرنی منزل پر انہیں پہنچانے کی ذمہ داری کسی اور کی ہے۔ انہیں بس منزل پر پہنچ کر اپنا فرض نبھانا ہے اور اسکے بعد انہیں بحفاظت وہاں سے نکالنے اور واپس اپنی جگہ پہنچانے کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔

سفر بالکل خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ چاروں آپس میں کوئی بات کر لیتے لیکن مجاہد تو بالکل ہی الگ تھا۔ گھڑکی سے سر نکالے سوچوں کی بلند پرواز پر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں سے واپس جا کر اپنے بیٹے کو بہت پیار کرے گا۔ عالیہ سے بھی معافی مانگے گا۔ اور اماں؟؟ وہ تو ماں ہے معاف کر ہی دینگی اور کتنی خوش ہوگی وہ جب میں انکے پاس ہی رہنے لگوں گا تو۔۔۔۔۔۔

بند آنکھوں کے ساتھ ایک مسکراہٹ اسکے چہرے پر دوڑ گئی۔

اسکا سفر کبھی بند آنکھوں سے تو کبھی کھلی آنکھوں سے طے ہوتا رہا۔ اسے باقیوں کی طرح باہر دیکھنے

کی بھی کوئی جستجو نہیں تھی۔ بس کسی طرح یہ کام جلدی سے ہو جائے اور وہ جلدی سے یہاں سے نکل جائے۔ اور یہاں سے نکلنے اور اپنوں کے پاس جانے کا خیال اسکے چہرے کی مسکراہٹ کا سبب تھا۔

اس ٹھنڈے موسم میں سورج آسمان کی بلند یوں پر اپنی کوشش سے زمین والوں کیلئے ٹھنڈ کو ختم کرنے کی سعی کر رہا تھا لیکن کچھ زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیوں کہ آسمان پر تھوڑے تھوڑے بادل تھے جن میں سے سورج کو کبھی بکھار ہی اپنی کرنیں بکھیرنے کا موقع مل رہا تھا اور مجاہد کھڑکی کی پٹ سے سر لگائے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ جانے بغیر اس کام کی ہامی بھری تھی صرف اس لیے کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھ جڑے دس لوگوں کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔۔

انسان کتنا خود غرض ہے۔ اپنے پیاروں میں سے کسی ایک کی بھی قربانی نہیں دے سکتا اور کسی اور کے بہت ساروں کا درد بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ اور پھر جب بات اپنے اور کسی اور کے پیاروں میں انتخاب کی آتی ہے تو پھر تو خود غرضی کی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی انسان کی حقیقت ہے۔۔۔ اس نے اپنا احتساب کیا۔ ضمیر کی عدالت اسکی بھی تھی لیکن جانے آج تک کسی جج کی آمد کیوں نہیں ہوئی تھی اس میں۔

اب جب میں کچھ نہیں کرنا چاہتا تو مجھے کوئی کرنے نہیں دے رہا۔ میں تو اب بھی انکار کرنا چاہتا ہوں لیکن یہاں میں انکار کرونگا وہاں میرے گھر کو بارود سے اڑا دیا جائے گا۔ اور پھر میں ہی خود غرض تو نہیں ہوں۔ ہر بند ہی خود غرض ہے۔ نکلیل بھائی بھی تو ایسے ہی کر رہے ہیں۔ میں تو پھر بھی نکل جاؤنگا وہ تو نکل بھی نہیں سکتے۔ اسکے بعد میں سہی معنوں میں دین سکھاؤنگا لوگوں کو۔ لوگوں کے بچوں کو اچھی تعلیم دیا کرونگا اور مولوی شہاب جیسے مولویوں کو تو اگر جان سے مارنا پڑا تو بھی دریغ نہیں کرونگا کہ ان جیسوں کا مارنا ہی بہتر ہے۔ اس نے خود ہی خود کو صفائی دی۔ گاڑی کے چلتے چلتے جانے کب اسکی آنکھ لگ گئی۔

نیند میں وہ مولانا صاحب کے اسی کمرے کے باہر کھڑا تھا اور ابھی اس ساری صورتحال پر سخت حیران ہو رہا تھا جو اس نے کمرے کے اندر دیکھی تھی۔۔۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ جانے کون تھے لیکن پیسے یہاں چھوڑ کر خوش ہو کر چلے گئے تھے۔۔

قاری صاحب نے پیسے لے لیے؟؟؟ وہ ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آکر اسے جکڑ لیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑاتا رہا لیکن دو بندوں کی گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ اسے کمرے کے اندر لایا گیا۔

کیا ہوا مجاہد؟ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟؟ مولانا صاحب نے پوچھا
مولانا صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ نے پیسے لیے ہیں؟ اور معاہدہ کر لیا دھماکے کرنے کا؟؟؟
وہ آنکھیں پھاڑے انکی طرف دیکھتا رہا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے مجاہد۔۔۔ تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔۔۔
مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خود سنا ہے۔۔ اور یہ جوا بھی
آپ کے سامنے پیسے پڑے ہیں یہ وہی تو ہیں۔ اس نے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

میں جانتا تھا کہ تم دیکھ رہے ہو اور مجھے ان لڑکوں نے بتایا تھا اس وقت جب تم آدھی چیزیں دیکھ چکے
تھے۔ پھر ماتو میں نے پردہ بند کروایا اور مابقی اس وقت تمہیں پکڑوایا کیوں کہ آدھی چیزیں جان کر تم
جانے کیا سوچنے اور سمجھنے لگتے۔ سو میں سمجھانا ہوں اب تمہیں۔۔۔

مجھے کچھ مت سمجھائیں مولانا صاحب۔۔۔ سب سمجھ گیا ہوں میں۔ میں سوچتا تھا کہ یہاں اتنا پیسہ
کہاں سے آتا ہے اور اتنا سلسلہ بھی لیکن اب پتا چلا کہ کہاں سے آتا ہے۔ کتنے پیسے لیے تھے ہمیں
افغانستان میں ایک سال جہاد لڑوانے کیا اور کتنے پیسے لیے آپ نے شہر کے ان دو دھماکوں کے جو میں نے
کروائے۔۔۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

مولانا صاحب کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگا۔۔۔
ایسا کچھ نہیں ہے مجاہد۔۔۔ میں سمجھاتا۔۔۔۔۔

سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ اس نے انکی بات کافی۔۔۔ میں سب کو بتاؤنگا کہ آپ
کیا کر رہے ہیں اور کتنے پیسے لیتے ہیں ہم سے دھماکے اور قتل کروانے پر۔۔۔

تم ایسا کچھ نہیں کرو گے مجاہد۔۔۔ وہ تیز آواز میں اسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔۔۔
میں ایسا ضرور کرونگا۔ اور وہ واپس جانے کیلئے مڑا لیکن اس سے پہلے کے وہ دروازے سے
نکلنا چار مضبوط ہاتھوں نے اسے ایک بار پھر جکڑ لیا۔

میں کہہ رہا ہوں تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ مولانا صاحب آج پہلی بار غصے میں بولے۔
میں ضرور کرونگا۔ اور میں آج سے آپ کے ہر کام اور ہر حکم سے انکار کرتا ہوں۔۔۔

اور پھر اسے وہاں نہیں رہنے دیا گیا۔ اسکی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور اسے اٹھالیا گیا باوجود اسکی
مزاحمت کے۔ اور جب اسے آزادی ملی اور اسنے اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو اسے کچھ بھی دکھائی نہیں
دے رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اندھیرے میں آنکھیں جھپکاتا رہا لیکن اندھیرا اتنا گھپ تھا کہ وہ نام کام رہا۔
یہ واقعہ آدھی رات کو ہوا تھا اور اب اس گھپ اندھیرے میں اتنی دیر گزر گئی تھی کہ اسے یقین تھا کہ

باہر دن کی روشنی پھیل گئی ہوگی۔ لیکن وہ جہاں تھا وہاں ابھی تک ویرانی اندھیرا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ پر کسی چیز کا ریٹکنا محسوس کیا اور جلدی سے اسے ہاتھ سے ہٹا دیا۔

کافی دیر گزری اور اب اسے بھوک اور پیاس بھی محسوس ہوئی لیکن اسکے اندر انگارے بھر گئے تھے۔ اگر مولانا صاحب غلط نہیں تھے تو اسکے ساتھ ایسا سلوک کیوں۔ اس نے تلخی سے سوچا

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص رات بھر میں لیے اندر آیا۔ اس رات کی روشنی میں اس نے کمرے میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو اندھیرے سے ادھر ادھر بھاگتے دیکھا۔

کہو جوان کیا حال ہے؟؟ آنے والے نے روشنی اسکی آنکھوں میں پھینکی۔

مجھے یہاں کیوں بند کیا ہے؟؟؟

ایک تو یہ کہ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں اور دوسرا یہ کہ تم اگلے مشن پر جاؤ گے۔۔۔۔۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ایسے کہا جیسے یہ سب کرنا انکے لیے معمول ہو۔

میں یہ دونوں باتیں نہیں مانوٹکا۔۔۔ وہ ایک بار پھر غصہ ہوا

تو ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔ اور وہ اٹھ کر چلا گیا اور اسے دوبارہ کمرے میں بند کر گیا۔

اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور اندھیرے میں لٹوٹا ہوا دروازے کے پاس آکر اسے خوب بھلیا لیکن کوئی نہیں آیا۔ اس نے آوازیں بھی دی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ دوبارہ وہی بیٹھ گیا۔

کبھی وہ جاگ جاتا اور کبھی بھوک کے ساتھ ہی اسکی آنکھ لگ جاتی لیکن اسکے جسم پر ریٹنگے والے کیڑوں سے وہ جاگ جاتا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ قبر میں ہے۔ وہاں بالکل قبر جیسا اندھیرا تھا۔ اور کیڑے بھی شاید قبر جیسے ہی تھے۔

اسی طرح بہت وقت گزرا اور اسکا اندازہ تھا کہ دوسرا دن بھی نکل آیا ہوگا تو اس نے وہی بیٹھے بیٹھے نماز کی نیت باندھی اور نماز پڑھ کر اللہ سے جانے کتنی دیر باتیں کرتا رہا۔

اور پھر کافی دیر بعد دروازہ ایک بار پھر کھلا اور رات والابندہ پھر اندر آیا۔

مجھے کھانے کو کچھ لاکے دو اور پانی بھی۔۔ اس نے جلدی سے کہا۔

جو دو باتیں میں نے کل بتائیں تھیں ان پر غور کرنے پر کس نتیجے پر پہنچے؟؟؟ وہ روشنی اسکی آنکھوں میں مارتے ہوئے بولا۔

مجھے کھانا لاکے دو۔۔

کھانا تو تب ملے گا جب شرائط مانو گے۔۔۔۔

کیا؟؟؟؟؟ وہ بہت حیران ہوا

یہ مولانا صاحب کا حکم ہے کہ جب تم ضد چھوڑ دو تو تمہیں کھانا دیا جائے گا۔
 میں یہاں مرجاؤنگا لیکن انکا ایک کام بھی نہیں کرونگا۔ وہ غصے میں بولا۔
 ٹھیک ہے۔ اور وہ چلا گیا۔ بھوک اور پیاس ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئے۔ پیاس سے اس کے
 حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔
 وہ بغیر کسی حرکت کے وہیں زمین پر پڑا رہا۔ اب اس نے جسم سے کیڑوں کو ہٹانا چھوڑ دیا
 تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھوک اور پیاس سے اسی کمرے میں مر جائے گا۔۔۔
 تیسرے دن وہ شخص آیا تو وہ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ واپس گیا اور پانی لایا۔۔۔ پانی اس کے چہرے
 پر ڈالا تو وہ اپنے حواسوں میں آیا۔ لیکن وہ ہڈ ہال تھا۔ اس شخص نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا۔۔۔
 تمہیں مرنے بھی نہیں دیا جائے گا۔ اگر سوچ رہے ہو کہ مرجاؤ گے تو موت اتنی آسان نہیں ہے
 ۔۔۔ وہ اس شخص کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں تھی۔
 مرجاؤنگا لیکن نہیں مانونگا تمہاری بات۔ اس نے سوچا۔
 مان جاؤ انکی باتیں۔۔۔ اس شخص نے مشورہ دیا۔ وہ صرف نفی میں سر ہلا سکا۔ لیکن اس میں اب
 شدت نہیں رہی تھی۔
 وہ شخص اٹھ کر جانے لگا۔ دفعتاً کارنا رتج کی روشنی کمرے میں ادھر ادھر ڈالنے لگا۔
 بہت کیڑے ہیں یہاں جوان۔ اور کچھ ڈسنے والے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں یہاں۔ کمرے
 کے کونے میں کیڑوں کو روشنی سے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھ کر وہ شخص بولا۔
 وہ زمین پر پڑا بے بس نظروں سے اسکی طرف دیکھتا رہا۔
 تمہیں ڈس بھی سکتے ہیں جوان۔ خیال رکھنا۔ وہ جانے کیلئے مڑا۔
 جب تک میں انہیں کچھ نہیں کہتا کیڑے مجھے بے وجہ نہیں کاٹیں گے۔ بے وجہ تو بس انسان ڈستے
 ہیں اور انسانوں کا ڈسا تو پانی تک نہیں مانگ پاتا۔۔۔ مجاہد ایسے بولا جیسے آواز پائال میں سے آئی ہو۔
 اور اس شخص نے اسکی طرف مڑ کر ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ بہت گہری بات کر گیا تھا وہ۔ وہ
 شخص بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گیا۔
 بھوک اور پیاس انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے۔ اسنے سوچا تھا کہ مرجاؤنگا لیکن وہ باتیں نہیں
 مانونگا۔ تب وہ نہیں جانتا تھا کہ مرجائے تو اچھا ہوگا لیکن اگر مر بھی مپائے تو کیا کرے گا۔ اور وہ بالکل اسی
 حالت میں تھا۔ مر بھی نہیں پا رہا تھا۔ مرنا اور جینا پھر بھی آسان ہوتا ہے۔ مشکل ترین تو وہ ہوتا ہے جب
 آپ موت اور زندگی کے بیچ انک جائیں۔ مرنا چاہیں تو مرنا پائیں اور جینا چاہیں تو جی مپائیں۔۔۔

۱۔ اور اس سے اگلے دن جب وہ شخص آیا تو اس نے روٹی کے عوض اسکی بات مان لی۔ ہاں صرف روٹی کے عوض۔۔

رومی

اسنے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول لیں۔ اسے خواب بہت ڈرانے لگے تھے آج کل۔۔۔۔۔
 بادل اور سورج کی اسی آنکھ مچھولی میں دوپہر سے تھوڑا پہلے وہ شہر پہنچ گئے۔ پچھلے اتنے عرصے سے وہاں مدد سے میں رہتے ہوئے اور پھر افغانستان کی پہاڑیوں میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد انکے لیے انسانوں کا یہ بے انتہام ہجوم کافی انجان تھا۔ وہ کافی دلچسپی سے باہر کا نظارہ کرتے رہے اور تھوڑی دیر بعد انکی گاڑی مختلف موٹر مڑنے کے بعد ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ آگے بیٹھا ہوا شخص اتر گیا اور انہیں بھی اترنے کا اشارہ کیا۔

ایک ایک کر کے وہ پانچوں بھی نکل آئے اور اس شخص کے اور مولوی ہلال کے پیچھے چلتے ہوئے اس گھر کے اندر داخل ہوئے۔ انہیں ایک کمرے میں بٹھادیا گیا اور تھوڑی دیر بعد انہوں نے ساتھ والے غسل خانے میں وضو کر کے آٹھ بندوں کی جماعت بنا کر نماز پڑھی۔ نماز کے بعد کھانے کیلئے دسترخوان بچھایا گیا۔ ایک تو انہیں بھوک بھی بہت لگی تھی اور دوسرا یہ کہ کھانے میں بھی کافی اہتمام کیا گیا تھا اسلئے سب نے کافی پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیلئے لیٹ گئے۔

انہیں آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا اور اتنے دنوں سے وہ اس کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے تھے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا تھا کہ باہر کوئی بھی انہیں دیکھ لے۔ یہ کس کا گھر تھا؟ انہیں بنا بنایا کھانا کون دیتا تھا یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ بس انہیں صرف اتنا کام دیا گیا تھا کہ ان سب کو پہلے دن ہی ایک ایک نقشہ دیا گیا تھا جس میں سب کی الگ الگ جگہ مختص کی گئی تھی۔ پانچ وہ دوست تھے اور ساتھ میں ایک جعفر تھا۔ انکو تین دنوں سے بس ایک ہی کام دیا گیا تھا کہ انہیں اس نقشے کو یاد کرنا تھا اور اسکے مطابق اپنا کردار نبھانا تھا اور پچھلے تین دنوں سے وہ یہ کام کر رہے تھے۔ آج اس کام کا آخری دن تھا۔ کل انہیں کوئی اور کام کرنا تھا اور پر سوں کا دن اس سارے منصوبے کا آخری دن تھا یعنی کہ انہیں منصوبے کو عملی جامی پہنانا تھا۔

ان تین دنوں میں وہ بہت کم سویا تھا۔ وہ لیٹ جاتا تھا لیکن پھر ایک انجان ڈر کی وجہ سے اٹھ جاتا تھا۔ اس ڈر کی وجہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بارہا ایسے کام کر چکا تھا۔ اسے حکم دیا گیا شہر میں دھماکہ کرنے کا۔ اس نے بہادری دکھائی۔ بازار میں فائرنگ کا حکم ملا تو وجہ پوچھے بغیر حکم بجا

لایا۔ افغانستان کی پہاڑیوں میں غاروں اور سرنگوں کے سچ میں زندگی اور موت کے سچ لڑتے ہوئے وہ نہیں ڈرتا تھا اور اصل میں وہ اپنی تنظیم کے بڑوں کو پسند ہی اپنی دلیری پر تھا کہ جب وہ گولی چلاتا تھا تو سامنے سے آنے والی گولی سے ڈرتا نہیں تھا۔

زندگی تو موت کی امانت ہے۔ جب چاہے آکر لے اپنی امانت۔ کمیں ڈرنا کیا؟ اسے اپنی بات یاد آئی جب کسی نے اس کی دلیری کی تعریف کی تھی اور جواب میں ہنستے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

مجاہد موت سے کیسے ڈر سکتا ہے مولانا صاحب؟؟ اور آپ نے ہی تو میرا نام مجاہد رکھا ہے۔ اور ایک بار جب مولانا صاحب نے انکی تعریف کی تھی تو اس نے جواب یہی دیا تھا۔

اور آج وہ ڈر رہا تھا۔ مجاہد اللہ ڈر رہا تھا آج۔ موت سے نہیں بلکہ خیند تک سے ڈر رہا تھا۔ تناؤ ڈر رہا تھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے آنکھیں بند کرنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں ایک بار پھر ڈراؤ نے خواب کے ساتھ ناجاگ جائے۔۔۔۔

یہ زندگی بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ کیسے ایکدم سے حالات پلٹا کھا جاتے ہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ اور انکی زندگی اور حالات دونوں ہی نے تو پلٹا کھا یا تھا۔

ابا۔۔۔۔۔ مجھے بچالو۔۔۔۔۔ ابا۔۔۔۔۔

اس نے دیکھا تو عبد اللہ اسی ویران میدان میں بھاگ رہا تھا۔ اسکے پیچھے ایک شخص تھا جسکے ہاتھ میں ایک لمبی چھری تھی اور وہ عبد اللہ کے پیچھے ہی بھاگ رہا تھا۔ رحمت اپنے بیٹے کو بچانے کیلئے اس طرف دوڑا لیکن اسکا ان دونوں سے فاصلہ بہت زیادہ تھا بہ نسبت ان دونوں کے سچ کے فاصلے کے۔ وہ انتہائی تیزی سے اپنے بیٹے کو بچانے کیلئے دوڑا۔ وہ شخص بہت خوفناک لگ رہا تھا اور جس انداز میں وہ چھری اٹھائے عبد اللہ کے پیچھے بھاگ رہا تھا وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

ابا۔۔۔۔۔ مجھے بچالو۔۔۔۔۔

عبد اللہ دوبارہ چیخا۔ وہ اپنی قوت سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بھاگ رہا تھا۔ رحمت گولی کی رفتار سے بھاگ کر پہنچا لیکن جیسے ہی اس نے چھلانگ لگا کر اس شخص کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی اسکا ہاتھ اٹھا اور چھرا اپنے دستے تک عبد اللہ کی پیٹھ میں گھس گیا۔

ابا۔۔۔۔۔ اس نے ایک آخری چیخ لگائی

عبد اللہ۔۔۔۔۔

وہ اٹھ گیا۔ سراسیمگی کی حالت میں اس نے اپنے ارد گرد دیکھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سب سو رہے تھے۔ اسکی پیشانی اس سردی میں بھی پسینے کی بوندیں برسا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسکی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو خواب تھا۔ لیکن جو بھی تھا تھا تو بہت ڈراؤنا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نہیں کرونگا یہ کام ابھی اور اسی وقت بھاگ جاؤنگا یہاں سے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا۔

کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ تمہارے علاوہ کیا رافرد کی زندگی بھی تمہارے ساتھ جڑی ہے۔ مولانا صاحب کی آواز آئی

لیکن میں جان بوجھ کر بے گنا ہوں کی جان نہیں لوں گا۔ اور مزاحمت پھر جاگ گئی۔

کتنوں کی پہلے ہی لے چکے ہو رحمت اللہ۔ اب نہیں لو گے تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم نہیں لو گے تو یہ باقی سب لے لیتے لیکن اسکے ساتھ ان گیارہ افراد کی بھی جو تمہارا راستہ تک رہے ہیں۔۔۔ یہ آواز اسکے اندر کی تھی۔

اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ تواب بھی نہیں کرے گا۔۔۔ پھر اندر سے کوئی بولا

لیکن آج تک میں نے انجانے میں سب کیا۔ دھوکے میں آ گیا تھا میں۔۔۔

نہیں رحمت دھوکہ تمہیں دیا نہیں گیا بلکہ تم نے خود کھایا۔ آنکھ بند کر کے کھایا۔ اسمیں قصور کسی اور کا نہیں تمہارا اپنا ہے۔ آواز اب بھی اسکی اپنی ہی تھی

لیکن اب میں نہیں لے سکتا کسی کی جان۔ رات کے اس پہر اسکی زہنی کشمکش عروج پر تھی۔

تو پھر اپنے بیٹے کی لے لو۔ اس بار آواز مولانا صاحب کی تھی۔

اور اسکی مزاحمت بیٹھ گئی۔ یہی ایک ہی تو کاری وار تھا جس سے مولانا صاحب بہت سوں کو مجبور کر رہے تھے اور کر چکے تھے۔

میں اعلان کرتا ہوں کہ جب یہ لوگ واپس آئیں گے تو چونکہ رحمت کی کچھ ذاتی مجبوریاں ہیں تو اسے ہماری طرف سے اجازت ہوگی کہ وہ اپنے گھر ہمیشہ کیلئے لوٹ جائے۔ لیکن اسکے لیے ضروری ہے کہ وہ دل لگا کر اس منصوبے کو کامیاب بنائے۔

اسے یاد آیا جب اس دن مولانا صاحب نے مجمع کی باجماعت نماز کے بعد اعلان کیا تھا۔ چونکہ انکے درمیان یہ طے پایا تھا کہ مولانا صاحب سب کے سامنے اس بات کا اقرار کر بیٹھے تاکہ بعد میں مکر نے کی صورت میں انہیں اپنے شاگردوں کے باغی ہونے کا ڈر لگا رہے۔ سوانہوں نے وہی کیا تھا۔

اور پھر دل اور دماغ کی جنگ میں پتا نہیں جیت کس کی ہوئی لیکن فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کام سے

چھپے نہیں ہٹ سکتا۔ وہ کسی صورت اپنے عبداللہ کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اور پھر بات صرف عبداللہ کی بھی نہیں تھی۔ اماں، ابا، عالیہ اور باقی سارے۔ کیسے میں ان سب کی موت کا باعث بن سکتا ہوں۔ اور پھر اس کام کے بعد میں سب چھوڑ کر چلا جاؤنگا۔۔۔ اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھیجنے لیں۔

احسان مجھے کل زاہدہ کے پاس جانا ہے۔

کیوں خیریت ہے؟؟؟

ہاں خیریت ہے لیکن وہ دو تین دن پہلے کہہ رہی تھی کہ وہ تھوڑی سی بیمار ہوگئی تھی تو اس لیے ملنے جانا چاہتی ہو۔۔

تو ٹھیک ہے چلی جاؤنا۔ میں نے پہلے تمہیں کب روکا ہے جواب روکونگا۔۔ وہ خوش باشی سے بولا۔
زاہدہ اسکی چھوٹی بہن تھیں جو اسی شہر میں لیکن اس سے کافی دور رہتی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے کے گھر بہت زیادہ نہیں جاتی تھیں لیکن اب جب اس نے ایک دو دن پہلے بتا بھی دیا تھا کہ اسکو دو تین دن بخار رہا ہے تو بہن ہونے کے ماطے اس سے رہا نہیں جا رہا تھا اور دوسری بات یہ کہ پچھلے ایک دو دنوں سے اسکا اپنا دل بہت تنگ ہو رہا تھا اور اسے کچھنا معلوم قسم کی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔۔
لیکن کیسے جاؤں گی میں؟؟؟ پہلے تو آپ لے کر جاتے تھے۔۔۔ وہ تو بے پروئی ڈالتے ہوئے بولی۔۔

اب تمہارا بیٹا جوان ہو گیا ہے اسے ساتھ لے کر چلی جاؤ۔۔

اور نعمان اور شا لو؟؟؟ اسکا ایک اور مسئلہ ابھرا۔

وہ دونوں مدرسے جا کینگے اور پھر ٹیوشن پر تو انکی واپسی تک میں کوشش کر کے آ جاؤنگا۔ انہوں نے مسئلے کا حل چکی میں نکال لیا تھا۔

ابا میں بھی جاؤنگا۔۔ نعمان بولا

میں بھی جاؤنگی۔۔ چھوٹی شا لو چینی

تم دونوں ٹیوشن پڑھنے نہیں جاؤ گے کیا؟ اور سبق پڑھنے؟ فیصل نے ان دونوں کو ڈانٹا

امی میں کل سکول سے آ جاؤنگا تو چلے جائیں گے۔ وہ کورسے جگ میں پانی بھرتے ہوئے بولا۔

نومی یہ رکھاؤ جا کر۔ شاہدہ نے روٹی کی چنگیر اسے دیتے ہوئے کہا

نہیں لے کر جاؤنگا۔ نعمان غصے میں بولا

کیوں؟؟؟؟؟ احسان کو حیرانگی ہوئی۔۔

امی مجھے دے دیں میں رکھ آتا ہوں۔۔ فیصل انکے ہاتھ سے چنگیر لیتے ہوئے بولا

نعمان ابھی بھی غصے میں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ شہر وز کے گھر جانا چاہتا تھا۔ وہ اسکا دوست بھی تھا لیکن کوئی اسے بھیجے پر تیار نہیں تھا کیونکہ سکول میں نعمان اور شاہ لو کی حالت دیکھتے ہوئے احسان نے ان دونوں کو ٹیوشن سنٹر میں داخل کروا دیا تھا۔ فیصل کوشش کرتا تھا کہ وہ دونوں اسکے ساتھ بیٹھ کر پڑھیں اور کچھ تھوڑا بہت اس سے بھی سیکھیں لیکن وہ دونوں ہی اسکے قابو میں نہیں آتے تھے۔ وہ بیٹھتے تک نہیں تھے تو پڑھنا تو دور کی بات۔ سوا احسان کو مجبوراً ان دونوں کو سنٹر میں داخل کروانا پڑا۔ حالانکہ ایک ٹیکسی میں اسکے لیے ٹیوشن سنٹر کا خرچہ ایک اضافی بوجھ ثابت ہو رہا تھا لیکن مجبور تھا۔ نعمان تو بمشکل پاس ہوا تھا اور شاہ لو پھر تھوڑے گزارے لائق تھی۔ اور رہا فیصل تو وہ تو پڑھائی میں اتنا چھٹا تھا کہ اسے کبھی ٹیوشن رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ اپنے شوق سے پڑھتا تھا اور چھوٹے دونوں مجبوری میں پڑھتے تھے۔ فیصل کل سکول سے چھٹی کر لو تو ہم صبح چلے جائیں گے اور انکی واپسی تک واپس بھی آجائیں گے۔ شاہدہ کا دل نہیں کر رہا تھا انہیں اکیلا چھوڑنے کو چاہے وہ کچھ لمحے ہی کیوں نا ہو۔ اسکا دل پتا نہیں کیوں ڈر رہا تھا۔

امی میں رک جاتا لیکن کل ہمارا ٹیسٹ ہے۔۔ وہ سالن میں جھجھکاتے ہوئے بولا۔

بڑی بیٹی کی غیر موجودگی کے باوجود شاہدہ کو کبھی اپنے کام کے لیے بیٹی کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ فیصل بیک وقت اسکے لیے پیٹا بھی تھا اور بیٹی بھی اور ساتھ میں اسکا دوست بھی تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنی ماں کے ہاتھ سے جھاڑو لے کر لگا بھی لیا کرتا تھا اور گھر کا سودا سلف لانا تو کب سے انکی ہی ذمہ داری نہر گئی تھی۔۔

احسان پتا نہیں کتنے دنوں سے میرا دل کچھ عجیب انداز میں گھبرا رہا ہے۔ مجھے خود بھی بالکل سمجھ نہیں آتی ایک لمحے میں ایسے جیسے ڈوبنے لگتا ہے اور چند ہی لمحوں میں بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ شاہدہ اپنی کیفیت سنار ہی تھی جو اسکے ساتھ پچھلے کچھ دنوں سے ہو رہا تھا

امی آپ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی ہیں۔ دیکھنا کل خالہ سے مل کر آئیں گے تو آپ بالکل ہشاش بشاش ہو جائیں گی۔۔ فیصل نے ہنستے ہوئے جواب دیا

ایسا کچھ بھی نہیں ہے تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو، پہلے ایسی کیفیت کبھی نہیں ہوئی میری۔۔ وہ اپنی بات پر تھی

وہ اس لیے امی کہ پہلے کبھی آپ ایک مہینہ دور بھی تو نہیں رہیں نا خالہ اور ماموں لوگوں سے۔۔۔ وہ

اب بھی ہنس رہا تھا اور ساتھ میں احسان بھی اسکے ساتھ شامل ہو گیا۔۔۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔۔۔

ہاں بس آپ باپ بیٹا اور میرا مذاق تم لوگوں سے تو بات کرنی ہی نہیں چاہیے۔۔۔ وہ ماتھے پر ہل لاتے ہوئے بولی۔۔۔

تو تمہارے دل کو کیا کریں ہم؟؟؟ اسکو نکال کر سمجھا دیں کہ بھائی خوش رہا کرو اور زیادہ فضول حرکتیں مت کرو ورنہ مار پڑے گی ایسے۔۔۔ قہقہہ لگاتے ہوئے احسان نے باقاعدہ ہاتھ سے مارنے کا اشارہ کیا۔۔۔

شاہدہ چپ ہو گئی۔ وہ باپ بیٹا ہر بات میں ہی ہنسی کا کوئی نا کوئی پہلو نکال ہی لیتے تھے اور اسکی پریشانی کو کوئی نہیں سمجھے گا۔ وہ جتنا اپنی ماں سے محبت کرتا تھا اتنی ہی اپنے باپ سے بھی۔ اگر وہ ماں کے ساتھ سالن میں چیخ ہلاتا تھا اور پیاز ٹماٹر کا ٹٹا تھا تو اپنے باپ کے چنگلوں پر بھی خوب دل کھول کر ہنستا تھا۔ اگر کبھی اپنی ماں کیلئے جھاڑو لگاتا تھا تو اکثر باپ کے ساتھ ٹیکسی بھی دھوتا تھا۔ اور اسکے علاوہ وہ خود سے سات سال چھوٹے نعمان اور شاہدہ سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو نعمان کا ہوم ورک بھی کر دیا کرتا تھا جب اس نے نہیں کیا ہوتا تھا اور اسٹاڈ سے ڈر رہا ہوتا تھا تو۔۔۔

وہ تینوں ہی احسان اور شاہدہ کی چھوٹی سی دنیا تھے اور وہ اپنی چھوٹی دنیا میں بہت خوش تھے۔۔۔۔

تم سب کو یاد ہے! اپنا پنا کام؟؟؟ انہوں نے سوال کیا

جی یا د ہے۔۔۔

شاہدہ میرے بچے! تم لوگ وہ کام کرنے جا رہے ہو جو اللہ کا پسندیدہ کام ہے جو اسکے رسول ﷺ نے سرانجام دیا ہے اور جسکو کرنے کی شدید خواہش ہر صحابی کے دل میں تھی۔ مولوی بلال سامنے چٹائی پر بیٹھے تھے۔

اسکے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایسی مسکراہٹ جسکی کوئی وجہ نہیں تھی۔

اور رسول اور صحابہ نے کب کسی بے گناہ کو مارا ہے؟؟؟ انہوں نے تو دوران جنگ بھی اعلان کر دیا کہ کوئی کسی بے گناہ کسی بچے کسی بوڑھے اور کسی خاتون کی جان مارے اور ہم کل ایسے ہی سب کی جان لینے جا رہے ہیں۔ یہ کیسے اللہ کا پسندیدہ کام ہے؟؟؟

وہاں موجود سب کے اچانک بدلنے والے تاثرات سے صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی بھی اس سے ایسی بات کی امید نہیں کر رہا تھا نیز کسی کو اسکی بات پسند بھی نہیں آئی تھی۔

یہ کیسی باتیں کر رہے ہو بچے؟؟؟ ہم ایسا کچھ نہیں کر رہے جو غلط ہو۔ ہم پر حملے کر کے ہمارے بچوں کو مارا جاتا ہے، گھروں کے اندر کام کرتی ہماری خواتین پر بمباری کر دی جاتی اور کہا جاتا ہے کہ وہاں دہشتگرد تھے، ہمارے مدرسوں پر ایسے بم پھینک دیئے جاتے ہیں کہ وہاں پڑھنے والے معصوموں کو ایک کے بعد دوسری سانس نہیں آتی اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم ظلم کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بچے۔ اگر ہمارے بچوں کی لاشیں ہم اٹھا رہے ہیں تو ہمارا حق بنتا ہے کہ انکے ہاتھوں میں بھی انکے بچوں کی لاشیں تھما دیں، اگر انہیں ہماری چار دیواری کی عزت کا خیال نہیں تو ہم پر بھی انکی خواتین کی عزت فرض نہیں اور یہ سب ہم اس لیے نہیں کر رہے کہ ہمیں کوئی ذاتی فائدہ ہے بلکہ اس سے یہ ہوگا کہ جب انہیں انکے کیے کا ویسا ہی جواب ملے گا تو وہ آئندہ احتیاط کریں گے۔ ہم صرف اپنا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور ٹانگ کے بدلے ٹانگ کا تصور تو ہمارا مذہب ہمیں دیتا ہے۔ پھر ہم چپ رہ کر ان ظالموں کو اور ہبہ کیوں دیں کہ کل کو وہ پھر ہمارے ساتھ وہی سب کریں۔

انہوں نے اپنی بات کے اختتام پر سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
سب کی نظروں میں انکی بات کی تائید عیاں تھی۔ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ رحمت اللہ نے وہ بات کیوں کی تھی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ جتنی بات وہ کر سکتا تھا اس نے کی تھی اور اس سے آگے انکی پروا نہیں تھی۔ وہ کچھ کہتا بھی تو کوئی انکی کسی بات کا یقین نہ کرتا اور کرتا بھی تو کیوں؟ کل تک وہ خود بھی اس سب کو بالکل بجا سمجھ رہا تھا اور آج کچھ دنوں میں ہی جبکہ انکی کا یا پلٹ گئی تو وہ خلاف ہو گیا۔

وہ سارا دن وہ لوگ مختلف حوالوں سے منصوبے کا جائزہ لیتے رہے اور بار بار ان سب سے اپنے اپنے کام کے حوالے سے پوچھتے رہے۔ ہر نماز کے بعد وہ اللہ سے معافی مانگتا رہا۔ معافی قبول ہوئی یا نہیں یہ تو وہ نہیں جانتا تھا لیکن ہر بار جائے نماز پر چند آنسو بہا دینے کے بعد اسکا دل کچھ ہلکا ضرور ہو جاتا۔
یہ آنسو بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو بے رنگ نمکین پانی کے قطرے ہوتے ہیں لیکن انکی طاقت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہو اور ایسا کوئی گوشہ اسے میسر نہ ہو یا پھر اسے ان چند قطروں کے گرانے کی اجازت نہ ہو۔

وہ عشاء کی نماز کیلئے مصلے پر بیٹھا ہوا یہی سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو کر رہا تھا اور حالات تھے کہ انکی اجازت بالکل نہیں دے رہے تھے صبح سے ایک غبار تھا جو اسکے اندر جمع تھا اور وقتاً فوقتاً اس نے اس کو نکالنے کی کوشش بھی کی تھی چند قطروں کی صورت لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ آج ایک دریا اسکے اندر جمع ہو رہا ہے جس کو آنسو کے چند قطروں سے کوئی فرق نہیں

پڑ رہا تھا۔

ممکن پانی کے چند قطرے ایک بار پھر اسکے گالوں کو بھگوتے ہوئے جائے نماز پر گر گئے۔

پاپا کل میں سکول نہیں جاؤنگا۔۔۔۔

کیوں؟؟؟

کیوں کہ کل آپ اتنے دنوں بعد آئیں گے تو مجھے آپ سے ملنا ہے۔۔۔ وہ بہت خوش تھا

لیکن میرے آنے تک تو آپ واپس آجاؤ گے بیٹا۔

لیکن پاپا میں کل نہیں جاؤنگا۔ اس نے اعلان کیا

مما سے پوچھا ہے؟؟؟

ان سے پوچھا ہے وہ بھی کہہ رہی ہیں کل آپ دیر سے آئیں گے اس لیے میں سکول چلا جاؤں اور

وہ کہہ رہی ہیں کہ میں آپ کے آنے کے اگلے دن چھٹی کر لوں۔۔۔

وہ تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ ایسا کرتے ہیں کہ کل آپ چلے جاؤ اور اگلے دن چھٹی کر لینا۔ پھر ہم

خوب مزہ کریں گے۔ ٹھیک ہے؟؟؟

لیکن آپ لوگ مجھے پھر بھی چھٹی کرنے نہیں دیں گے۔ میں جانتا ہوں ماما مجھے بھیج دیں گی اور آپ بھی

انہی کی سائیڈ لین گے۔۔۔ وہ ماما راض ہو رہا تھا

نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ آپ بے شک چھٹی کر لینا اور ماما کی فکرنا کروان سے پریشان پاپا لے لینے

۔۔۔ ٹھیک ہے؟؟؟

ٹھیک ہے پاپا لیکن میں پرسوں سکول نہیں جاؤنگا۔ اس نے ایک بار پھر یا دوہائی کروائی۔

ارے پاپا کی جان۔۔۔ بالکل مت جانا بیٹا۔

سنا ہوا زکل ایک مہینے کی چھٹی پر آ رہا تھا اور اس وقت کا وہ تینوں ہی بڑی شدت سے انتظار کرتے

تھے۔ اور شہر چاہتا تھا کہ وہ کل سکول نہ جائے تاکہ اپنی ماما اور نانو کے ساتھ وہ بھی اپنے پاپا کا استقبال

کر سکے لیکن عا نشہ ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سنا ہوا شہر سے اس ایک مہینے کے دوران

چار پانچ چھٹیاں کروائی لے گا۔ جب وہ یہاں ہوتا تھا تو ایک لمحے کیلئے بھی ان تینوں کی جدائی اسے گوارہ

نا ہوتی۔ بس اس کا دل کرنا کہ اسکی کل کائنات یعنی ماں شہر اور عا نشہ کسی بھی لمحے اسکی آنکھوں سے اوجھل

نا ہوں۔ شاید وہ ان سے دوری کی پیاس بجھاتا تھا۔ اسکا بس چلتا تو جس وقت اسے آنا ہوتا اسی مہینے میں

شہر کے سکول کی چھٹیاں کروا دیتا۔

آپ پھر اسے چھٹیوں کی آس دے رہے ہیں۔۔۔
عاشی کچھ نہیں ہوتا تم بس ایسے ہی وہم پالتی ہو۔ چھٹی کر بھی لے گا تو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔
اس بار تو جلدی نہیں جائیں گے نا؟؟ عانشہ نے پوچھا
اور فون کے دوسری طرف سٹا ہنواز کو ایک بار پھر احساس ہوا کہ اسوقت کا کوئی اس سے بھی بڑھ
کرا نظار کرتا ہے۔
نہیں بلکل نہیں۔۔۔
میجر صاحب آپ کا بیٹا بہت خوش ہے۔ اسکی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔
اور میرے بیٹے کی ماما خوش نہیں ہے کیا؟؟؟
اسکا نہیں پتا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔
چلو میں انشاء اللہ کل خود آکر معلوم کرتا ہوں کہ وہ خوش ہے کہ نہیں۔
کب روانہ ہونگے؟؟؟
صبح چار بجے۔۔۔
اور پینچیس گئے کب؟؟؟
دس گیارہ بجے۔۔۔
ٹھیک ہے۔۔۔
ویسے یہ بات میں ایک دو دن پہلے انہی الفاظ میں اور یہی ٹائمنگ بتا چکا ہوں تمہیں عاشی۔۔۔
میں بھول گئی تھی۔
بھول گئی تھی یا دوبارہ سن کر خوش ہو رہی ہو۔۔۔
ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔
واقعی؟؟؟؟ وہ اب چھیڑ رہا تھا
مجھے نہیں پتا۔ اللہ حافظ
اور اس نے فون بند کرنے کیلئے کان سے ہٹایا۔
اچھا سنو۔۔۔۔۔ کریڈل میں سے آواز آئی
جی۔۔۔ اس نے دوبارہ کان سے لگایا۔
میں بہت خوش ہوں کہ ایک مہینہ میں اپنی مکمل دنیا میں گزاروں گا۔۔۔
وہ خاموش رہی۔

اللہ حافظ عاشی ---

اللہ حافظ ---

روز کی طرح فجر کی اذان سے پہلے اسکی آنکھ نہیں کھل سکی۔ اسے کسی نے کندھے سے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اسکے ارد گرد سوئے ہوئے اسکے سب دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ جسے نیند پچھلے کئی دنوں سے ڈرا رہی تھی آج اس پر اتنی مہربان کیسے ہو گئی تھی کہ وہ ساری رات سوتا رہا تھا اور وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے اٹھ نہیں بیٹھا۔
پریشان مہوتم لوگوں کی چائے میں رات کو تم نے تھوڑی سی نیند کی دواملا دی تھی تاکہ پرسکون ہو کر سو جاؤ اور صبح اٹھو تو اپنے آپ کو بہتر محسوس کرو۔ مولوی بلال نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

لیکن کیوں؟؟؟ وہ سب حیران ہوئے

بتا چکا ہوں کہ اسلیے تاکہ تم لوگ آرام سے سو جاؤ۔ اور ابھی سوال جواب کا وقت نہیں ہے جلدی سے اٹھو اور نماز پڑھ کر اپنی کامیابی کیلئے نفل بھی پڑھ لو اور دعا بھی مانگ لو۔

اور ان سب نے اٹھ کر باری باری وضو کیا اور بتاعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد کامیابی کی دعا بھی مانگی گئی۔

ان آٹھ بندوں کی مختصر سی جماعت میں وہ ایک واحد شخص تھا جو اس وقت کامیابی کی نہیں بلکہ کسی معجزے کی دعا کر رہا تھا۔ وہ یہ چاہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے بس کسی طرح یہ منصوبہ نام کام ہو جائے۔
لیکن ہر دعا اگر قبول ہوتی تو کسی کسی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری کیوں رہتی؟؟؟؟

اور پھر ناشتہ کر کے انہوں نے پہلے سے تیار شدہ سامان اٹھایا اور گھر کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہیں کوئی کام نہیں کرنا تھا۔ انہیں طے شدہ جگہ پہنچانے کی ذمہ داری کسی اور کی تھی اور انہیں واپس وہاں سے نکالنے اور بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری بھی انکی نہیں تھی۔ انہیں تو بس اپنا اپنا کام کرنا تھا جو انہیں بتایا گیا تھا۔ گاڑی میں وہ چھ لڑکے تھے اور آج ڈرائیونگ ایک انجان شخص کر رہا تھا جسکو انہوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔

گاڑی میں بالکل موت کی سی خاموشی تھی اور ایسے لگ رہا تھا کہ کسی ویران قبرستان سے گزر رہے ہیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ شاید اسی طرح کچھ لمحے سکون کے مل جائیں۔

اور کتنا مشکل ہوتا ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو کہ آپ ایسا کام کرنے جا رہے ہوں جو آپ کی بھی نظر میں بدترین ہو لیکن آپ پھر بھی اسکو کرنے پر مجبور ہوں۔ جب کبھی آپ کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر کوئی آپ سے وہ سب کام کروائے جو آپ کسی صورت کرنا نہیں چاہتے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے خود سے لڑتے رہنا اور گناہ پر اپنے ضمیر کو وضاحتیں دیتے رہنا اور جب آپ جانتے بھی ہوں کہ آپ کی ساری تاویلیں ایک ظلم لفظ کے سامنے بے وقعت ہوں۔ کتنا کھٹن ہوتا ہے کہ جن میں آپ کو اپنے پیارے دیکھتے ہوں انہیں کو بے دردی سے تکلیف دی جائے۔

ابا مجھے بچالو۔۔۔۔۔ ابا۔۔۔۔۔

زہن کے پردے پر اچانک سے عبداللہ کا چہرہ نمودار ہوا۔ کوئی بھیانک شخص اسے لٹائے اسکی گردن پر چھرا رکھے ہوئے تھا اور وہ رحم زدہ نظروں اور ڈبڈبائی آواز میں باپ کو مدد کیلئے بلاتا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی خواب بھی نہیں تھا بس اسے ایک لمحے کو ملکل بچ لگا۔

اب کی بار اس نے اپنے دائیں طرف کے شیشے سے سر لٹکا دیا۔ لیکن آنکھیں کھلی رکھیں۔ کھڑکی سے باہر کی دنیا میں لوگ اور زندگی بہت رواں دواں تھی۔ افراتفری تھی لیکن اسکے اندر قبر کی سی خاموشی تھی۔ شاید اپنے آپ سے چھپ رہا تھا وہ اور کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے آپ اور اپنی حقیقتوں سے چھپنا۔۔

گاڑی مختلف راستوں پر چلتی رہی اور وہ کھڑکی سے سر لٹکا کر باہر لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اپنے دوستوں کی طرف نہیں دیکھا۔ شاید وہ بھی اسی کی طرح زہنی کشمکش کا شکار تھے لیکن کسی میں دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لیکن وہ کیوں پشیمان ہو گئے۔ وہ تو کوئی سچائی نہیں جانتے بلکہ وہ تو خوش ہو رہے ہیں کہ انہیں جنت میں جانے کا ایک اور موقع مل رہا ہے لیکن جانتے نہیں ہیں کہ میری طرح جنت نہیں بلکہ جہنم میں اپنے لیے ایک اور ٹھکانہ بنا رہے ہیں۔

گاڑی اچانک سے رک گئی۔ اس نے گاڑی کے اندر سے دیکھا تو ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک چھوٹا سا خالی میدان تھا۔ وہ شخص پیچھے اتر اتر کر اس کے پیچھے ایک ایک کر کے وہ سب بھی نکل آئے۔ یہ جگہ انکے لیے انجان نہیں تھی۔ تصویروں کے ذریعے یہ جگہ انہیں کئی بار دکھائی اور یاد کروائی گئی تھی۔ اور اس سے آگے کے راستے بھی ان سب کو ازبر تھے۔

یہاں سے تم لوگ ملکل اسی طرح اور اسی رستے سے جاؤ گے جو تم لوگوں کو سمجھا یا گیا ہے۔ میں یہی

رہوں گا اور یہی پر انتظار کرونگا تم لوگوں کا۔ اپنا کام کرتے ہوئے یہ بالکل مت سوچنا کہ اسکے بعد کیا ہوگا۔ یقین رکھو کہ جس بات کا جس سے وعدہ کیا گیا ہے بالکل ویسا ہی ہوگا لیکن بس شرط یہ ہے کہ سب اپنا کام ایمانداری سے کریں۔ بس اب اپنی اپنی چیزیں نکالو اور اللہ کا نام لے کر جاؤ۔ بولتے ہوئے اس شخص نے کن انکھیوں سے مجاہد اللہ کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسکے سارے معاملے سے وہ شخص بھی باخبر ہے۔

ان سب نے گاڑی کی ڈگی میں سے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور باہر آ کر کھولا۔ ان سب کے متمنا تے چہروں میں سے ایک وہی چہرہ تھا جس پر جنت پانے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔

اپنے اپنے سامان میں سے ان سب نے وردیاں نکالی جو انہیں اس کام کیلئے دی گئی تھیں۔ گاڑی کے اندر جا کر لباس تبدیل کیا اور کچھ ہتھیرا لباس کے اندر چھپائے اور کچھ لباس میں اڑس لیے۔ کچھ ہتھیرا اسکے علاوہ بھی تھے جو چمڑے کے ایک بیگ میں تھے۔ کل رات ہی ہدایات کے مطابق ان سب نے اپنی اپنی داڑھی منڈائی تھی سو وردی پہن کر وہ ہر لحاظ سے فوجی ہی لگ رہے تھے۔

سب نے مل کر ’اللہ اکبر‘ کا ایک نعرہ بلند کیا اور اس شخص کو وہیں چھوڑ کر وہاں سے روانہ

ہو گئے۔

وہ پیدل اس عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ رستے انہیں سب معلوم تھے۔ تصویروں اور نقشوں کو یاد کر کے منزل تک پہنچنا انہیں خوب اچھی طرح سکھایا گیا تھا۔ عمر، جعفر اور سیف اللہ عمارت کے پیچھے کی طرف سے گھوم کر بڑے گیٹ کی طرف گئے لیکن ابھی کسی کی نظروں میں نہ آنے کیلئے تھوڑی دور کھڑے تھے۔ مجاہد، حیدر اور امیر حمزہ پیچھے کی طرف ہی رہ گئے۔ تھوڑی دیر وہاں رہ کر دور ہی دور سے وہ مختلف زاویوں سے دیواروں کا اندازہ لیتے رہے۔ مناسب جگہ اور اپنے دوستوں کا اشارہ پا کر مجاہد نے اپنے لباس میں چھپائی ہوئی دو ربین والی بندوق نکالی اور لمبی دیوار کے ایک کونے میں لگے ہوئے کیمرے کا نشانہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کیمرہ زمین پر تھا۔ حیدر جو پہلے ہی سلاخوں کو کاٹنے والی بڑی قینچی تھا مے کھڑا تھا فوراً سے بھاگا اور دیوار پر لگی ہوئی بازو کو کاٹنے لگا۔ اسکے بالکل پیچھے حمزہ ایک مضبوط رسی جس کا ایک سرا پہلے سے ایک گانٹھ کی صورت بندھا ہوا تھا لے کر اسی سمت بھاگا۔ مجاہد نے اپنی بندوق دوبارہ اپنے لباس میں چھپائی اور اسلحے سے بھرا بیگ اٹھا کر انکے پیچھے بھاگا۔ حیدر نے چند ہی لمحوں میں اس بازو کو اس طرح سے کاٹ لیا کہ بیچ میں انکے دیوار پھاند نے کا کافی کھلا رستہ بن گیا تھا۔ حمزہ نے کوئی بھی دیر کیے بغیر رسی ایسے پھینکی کہ وہ جا کر بازو کیلئے لگائے گئے سلاخ میں پھنس گئی اور چند ثانیوں کے بعد ہی وہ

تینوں اسی سے چڑھ کر دیوار پھاند چکے تھے۔ اپنا اپنا اسلحہ سنبھالتے وہ تینوں اپنے مقررہ اہداف کی طرف بھاگے اور اس بیگ کو وہی چھوڑ دیا۔ اس بیگ میں ان تین بندوں کا اسلحہ تھا جو گیٹ سے ہو کر آ رہے تھے۔ کچھ اسلحہ تو ان کے اپنے پاس موجود تھا لیکن باقی اس بیگ میں پڑا ہوا تھا۔

فوجی وردی میں ملبوس اور کندھوں اور سینے پر تمنغے سجائے وہ تینوں بڑے بارعب انداز میں سکول کے گیٹ پر پہنچے۔ وہ چونکہ کسی فوجی گاڑی سے نہیں اترے تھے اس لیے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کے شک کے امکان کو زائل کرنے کیلئے وہ بڑے خراماں خراماں چلتے رہے اور ادھر ادھر دیکھتے رہے ایسے جیسے وہ معمول کی ڈیوٹی پر نکلے ہوں اور چلتے چلتے ادھر بھی آ نکلے ہوں۔ چوکیدار نے ان کی طرف دیکھا اور ان کے حلیے کو دیکھ کر زمین پر ایک سیلوٹ مار کر دروازہ کھول کر انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ تینوں دل ہی دل میں بہت بنے لیکن چہرے پر صرف مسکراہٹ ہی آنے دی۔

سب سے آگے عمر اس کے بعد جعفر اور اس کے بعد سیف اللہ کے بعد دیگرے اندر داخل ہوئے۔ وہ آگے جا ہی رہے تھے کہ اچانک گولی کی سی تیزی سے سیف ایک طرف اور عمر دوسری طرف مڑا۔ گیٹ کے دونوں طرف بیٹھے چوکیدار چونکہ اس اچانک حملے کیلئے بالکل تیار نہ تھے سو بغیر کسی مذاحمت کے ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ یہ ان تینوں کا پہلا ہدف تھا جو کہ انہوں نے بخوبی سرانجام دے دیا تھا۔ اس سارے مرحلے کے دوران انہوں نے اپنے ساتھیوں کو عمارت کی دیوار پھلانگتے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً وہی بھاگے اور چند سیکنڈ کے دوران ہی وہ اپنے اپنے ہتھیار اٹھا کر اپنے مقررہ اہداف پر پہنچ گئے تھے۔

کسی ایک بے گناہ کی جان لینا اور پوری انسانیت کی جان لینا ایک برابر ہیں رحمت۔ کہیں دور سے قاری ادریس کی آواز آئی۔ اس کمرے کی طرف اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ اس عمارت کی بجلی کی تار کاٹ چکا تھا اور اب اپنے اگلے ہدف پر جا رہا تھا جو بچوں سے بھرا ہوا ایک کمرہ تھا۔ مجاہد یا در کھوکھو کہ تم نے کوئی بھی ما پسندیدہ حرکت کی تو اس کا خمیازہ صرف تمہیں نہیں بلکہ تمہارے پورے خاندان کو بھگتنا پڑے گا۔ مولانا صاحب کی آواز آئی۔

تم ایسا کچھ مت کرنا رحمت۔ اگر خاندان کی قربانی دینی پڑ رہی ہے تو دے دو لیکن بے قصور جانیں مت لو۔ قاری ادریس ایک بار پھر بولے تھے۔

تو ٹھیک ہے تم نہیں کرو گے تو یہ کام کوئی اور کر لے گا لیکن اپنے لحاظ گن لو اور اپنے ساتھ اپنے

گیا رہ پیاروں کے بھی۔ ایک قہقہے کے ساتھ مولانا صاحب کی آواز ابھری تھی۔
 بیٹا تم انکی باتوں میں مت آؤ۔ یہ تمہیں بھی قاری ادریس بنانا چاہتے ہیں۔ آگے مت بڑھو۔۔
 یہی تو کہہ رہا ہوں کہ خود کو قاری ادریس بننے سے بچالو۔ ورنہ تم بھی ساری زندگی ویسے ہی رہو گے
 جیسے وہ رہے ہیں۔ آگے بڑھو اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے اور عبداللہ۔۔۔۔۔
 نہیں نہیں۔۔۔ عبداللہ نہیں۔۔۔ عبداللہ کو کچھ مت کہنا۔۔۔ میں کرتا ہوں۔۔۔ سب کرتا ہوں۔۔۔ وہ
 خود سے بولتا رہا۔

قاری ادریس ایک بار پھر ہار گئے تھے جیسے وہ ہمیشہ ہارتے تھے اور مولانا صاحب ایک بار پھر جیت
 گئے تھے جیسے وہ ہمیشہ جیتتے تھے بس فرق اتنا تھا کہ پہلے دل مولانا صاحب کا مصدق تھا اور اب
 آخر کار قاری ادریس کی صداقت پر ایمان لے ہی آیا تھا لیکن اب شاید دیر ہو گئی تھی۔
 کتنا عجیب ہے کہ اتنا عرصہ انسان حق اور باطل کے بیچ میں فرق ہی نہ کر پائے اور جب اسے سمجھ
 آ جائے تو تب تک اسکی واپسی کے سارے رستے مسدود ہوں۔ اسنے حسرت سے سوچا۔
 کہیں سے اسے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ اسکے ساتھیوں کی طرف سے ہی
 کیا گیا ہے یہ بتانے کیلئے کہ ان سب کا وقت شروع ہو گیا ہے اور انہیں جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر کے
 یہاں سے نکلنا بھی ہے۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کام میں اگر اس نے اب چند لمحوں کی بھی تاخیر کر دی تو اس
 پر قیامت ڈھانے والے حشر برپا کرنے میں چند لمحے دیر نہیں کریں گے۔ وہ جلدی سے اس کمرے کی طرف
 بھاگا۔

ٹھاٹھا ٹھاٹھا۔۔۔۔۔

مسلل فائرنگ شروع ہو چکی تھی اور ایسی کہ ایک لمحے کو بھی نہیں رک رہی تھی۔ وہ ایک کمرے میں
 داخل ہو چکا تھا جہاں بچے باہر سے مسلل فائرنگ کی آوازن کر بہت سہم گئے تھے۔ اس نے جلدی سے
 دروازہ بند کیا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔

زندگی میں آج یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اسے فائرنگ کرنا تھا یا کسی کی جان لینی تھی یا پھر پہلی بار اسکے
 ہاتھ میں ہتھیار تھا۔ وہ تو بہت عرصے سے کھلونے کی طرح ہتھیاروں سے کھیلتا آ رہا تھا لیکن آج اسکی زندگی
 کا مشکل ترین کام تھا۔ اسے فوجی وردی میں ملبوس اور سینے پر فوجی تمنغے سجائے ہاتھ میں اسلحہ لیے دیکھ
 کر بچے سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ وہ آخر ہے کون اور کیا کرنے آیا ہے؟؟

تو اپنی پندرہ روپے کی گولی سے ان کے ماں باپ کی دس سال کی محنت کو بے قصور ختم نہیں کر سکتا

سڑھیاں پھلانگتا کچھ ہی لمحوں میں چھت پر جا پہنچا۔ اپنا ایک کام وہ کر چکا تھا۔ اب اسکا دوسرا کام یہ تھا کہ چھت پر سے وہ اپنے ساتھیوں کا بچاؤ کرے۔ وہ اچھا نشتہ باز تھا اس لیے اسے یہ کام دیا گیا تھا۔

چھت پر جا کر اس نے اپنی دور بین والی بندوق نکالی اور دور دور تک دور بین سے جائزہ لیا۔ کچھ دور اسے ایک فوجی گاڑی بڑی تیز رفتاری سے سکول کی جانب آتی دکھائی دی۔

مطلب یہ کہ انہیں خبر ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا

وہ بھاگ کر چھت کے کونے میں گیا اور اس گاڑی کو اپنے دور بین کے حصار میں لیے مسلسل اسکی حرکت دیکھتا رہا۔ وہ کافی قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی اور خود چار دیواری کے پیچھے ایسے کھڑا ہو گیا کہ اگر کوئی گولی چلاتا بھی تو اسے مانگتی۔ اور اس کام میں وہ کافی ماہر تھا۔ پہلے بھی وہ ایسے کام کرتے ہوئے اکثر دور کے نشتہ والی زمرہ داری ہی لیتا تھا۔ لیکن فرق اتنا تھا کہ پہلے کبھی اسے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔ آج وہ موت سے ڈر رہا تھا۔ پہلے وہ شہادت کی خواہش میں لڑتا تھا آج وہ زندگی کی آس میں لڑ رہا تھا۔

پچھے سے فائرنگ اور انسانی چیخوں کی آوازیں ابھی بھی آرہی تھی۔

گاڑی سکول کے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ اسکی دور بین سے اسکا محاصرہ جاری رہا۔ وہ گاڑی رکی اور آگے والی سیٹ سے ایک نوجوان بڑی تیزی سے نکلا۔ مجاہد نے اس پر گولی چلانے کی کوشش کی لیکن اسکا زاویہ ایسا تھا کہ وہ گولی نہیں چلا سکا۔ گاڑی کے پچھلے حصے سے مزید سپاہی بھی نکلے۔ اس نے نشتہ نہ لیا اور گولی چلا دی۔

اسکی خدا داد نشتہ بازی کی صلاحیت ایک بار پھر کام کر گئی تھی۔ گولی سیدھی جا کر ایک سپاہی کے ماتھے پر لگی۔ اور اس نے دوبارہ کوئی حرکت نہیں کی۔ اس اچانک حملے کیلئے شاید وہ لوگ تیار نہیں تھے سو فورا زمین پر لیٹ گئے اور سینے کے بل حرکت شروع کی۔

اب اسکے لیے انکا محاصرہ کرنا اور انہیں نشتہ نہ بنانا آسان نہیں تھا۔ اس نے کچھ اور فوجی گاڑیوں کو بھی اسی طرف آتے دیکھا۔

اللہ اکبر

اس نے نعرہ بلند کیا اور فوجیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی گولی ان میں سے کسی کو لگی نہیں ہے کیونکہ وہ سب اب دیوار کی اوٹ میں چل رہے تھے لیکن وہ پھر بھی گولیاں برساتا رہا کیونکہ وہ فوجیوں کی رفتار کو کم کرنا چاہتا تھا تا کہ انہیں نکلنے کا موقع مل سکے۔

اب نیچے سے فائرنگ کی آواز کم ہو گئی تھی۔ اور کچھ عجیب افراتفری کا سماں تھا۔

اب نکل جانا چاہیے۔ اس نے سرگوشی کی اور سیزمیاں پھلانگتا پچھے اتر آیا۔ فوجی اندر آچکے تھے۔ وہ ادھر ادھر بھاگتے ابھی تک زندہ بچ جانے والے بچوں کے بیچ میں سے بھاگتا رہا۔ اسے اس دیوار تک پہنچنا تھا۔

سامنے اسے سیف اللہ نظر آیا۔ وہ بھی کمرے سے نکل آیا تھا۔

لیکن پلک جھپکتے ہی مٹ جانے کہاں سے گولی آئی اور سیف کاسینہ چیر کر چلی گئی۔ وہ وہی گرجا گیا۔ مجاہد نے گولی کی سمت دیکھا تو گولی اسی نوجوان فوجی افسر کی پستول سے نکلی تھی۔ مجاہد نے جلدی سے اپنی پستول سیدھی کی لیکن وہ اسکا نشانہ نہیں لے سکا وہ ایک لمحے میں وہاں سے ہٹ چکا تھا اگر مجاہد اچھا نشانہ نہ باز تھا تو وہ بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ تربیت یافتہ فوجی افسر تھا وہ بھی۔

وہ پھر سے بھاگا وہ گولیاں بھی چلاتا رہا لیکن اب اسکے پاس زیادہ گولیاں نہیں بچیں تھیں سو وہ اندھی گولیاں چلانے سے اجتناب کرنے لگا۔ جانتا تھا کہ اسکے ساتھیوں کے پاس بھی گولیاں تقریباً ختم ہو چکی ہوں گی۔ بس اب ان سب کو جلدی سے اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اس دیوار کو پھاندا تھا اور پھر وہاں سے بھاگتا تھا۔۔۔

وہ کبھی جھک کر اور کبھی لیٹ کر فوجیوں کی گولیوں سے خود کو بچاتا بھاگتا رہا۔ وہ پہلے کبھی ایسے بھاگا نہیں تھا لیکن آج زندگی کی تلاش اسے بھاگنے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ سب چونکا فوجی لباس میں تھما لیے انہیں پچھا۔ نئے میں فوجیوں کو دقت پیش آرہی تھی۔

ایک بار اسے موقع ملا اور اس نے کھڑے ہو کر دوڑ لگا دی۔ سامنے اس نے حمزہ کو بھی دیکھ لیا۔ لیکن وہ بھاگ نہیں رہا تھا بلکہ فوجیوں اور بھاگتے بچوں پر تانک کر گولی چلا رہا تھا وہ۔

حمزہ۔۔۔۔۔ اس نے آواز دینے کی کوشش کی۔

لیکن ٹھیک اسی لمحے ایک گولی آئی اور اسکی مانگ میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ آواز اسکے گلے میں دب گئی۔

حمزہ سے تھوڑے فاصلے پر اب حیدر بھی اسے نظر آیا۔ وہ گولیاں بھی چلا رہا تھا اور اس ٹوٹی ہوئی دیوار کی سمت جا بھی رہا تھا لیکن انکی فائرنگ کی آوازوں سے اب لگ رہا تھا کہ انکے پاس بھی اب گولیوں کی وہ طاقت نہیں رہی۔ وہ جھک کر چلتے پھر اٹھ کر ایک گولی چلا کر اپنے لیے راستہ بناتے اور دوبارہ جھک جاتے

-----حیدر

اس نے مدد کیسے بلانے کی کوشش کی لیکن اسکی آواز اسکے منہ میں ہی رہ گئی اور اسی لمحے ایک

دھماکے سے حیدر کا جسم کئی بچوں سمیت روٹی کے گالوں کی طرح فضا میں بکھر گئے۔۔۔

دھماکہ برآمد ہونے میں ایک کمرے کے سامنے ہوا تھا اور وہاں آگ لگ گئی تھی۔ کمرے کے اندر سے آنے والی معصوم بچوں سے لگ رہا تھا کہ کمرے کے اندر زندہ بچے موجود تھے برآمد ہونے میں پھیلی آگ کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ وہ اس منظر سے کافی دور تھا لیکن اس نے دیکھا کہ وہ نو جوان فوجی بھاگتا ہوا آگ کے اندر گیا اور چند لمحوں بعد اپنے کندھوں پر تین چار بچے اٹھائے نکل آیا اور انکو دوسروں کے حوالے کر کے خود دوبارہ آگ میں کھود گیا۔ لیکن اس بار وہ نکل نہیں سکا اور فضا ایک بار پھر ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ اس فوجی کا جسم دھماکے کے ساتھ فضا میں اوپر اٹھا اور آگ سے باہر جا کر گرا۔ مجاہد کو ایسے لگا جیسے اللہ نے اسے جہنم کی آگ سے باہر نکال دیا ہو۔

کچھ فوجی اندر کمروں سے زخمی بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا اٹھا کر باہر لا کر گیٹ سے باہر نکال رہے تھے اور کچھ حملہ آوروں کی تلاش میں تھے۔ عین اسی لمحے ایک نامعلوم سمت سے گولی آئی اور حمزہ بغیر کچھ جانے بوجھے اسی سمت میں گر گیا۔

اب مجاہد کو اندازا ہوا کہ وہاں سے نکلنا کتنا مشکل تھا۔ اگر وہ مولانا صاحب کے ہاں تربیت یافتہ تھے تو وہ تو ان سے بڑھ کر فوجی تربیت یافتہ تھے۔

اور پھر وہ تو زندگیاں لینے والوں کے مقابلے میں زندگیاں بچانے آئے تھے۔ اور بچانے والا ہمیشہ سے مارنے والے سے زیادہ طاقتور رہا ہے۔

وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا رہا۔ دھماکے کے نتیجے میں پھیلنے والے دھوئیں سے اسے تھوڑی مدد ملی اور وہ اٹھ کر اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ خود کو گھسیٹتا ہوا دیوار تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔

ابھی وہ دیوار سے تھوڑے فاصلے پر تھا کہ اس نے دیکھا دیوار پر سے وہ رسی غائب تھی۔

ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ اونچی دیوار کو دیکھ کر اور اپنی زخمی ٹانگ کا سوچ کر وہ پریشان ہو گیا۔ جعفر پہلے سے وہاں انتظار کر رہا تھا اور اسی لمحے عمر بھی چپتا چپتا کہیں سے آ نکلا۔ وہ تو بالکل خالی ہاتھ تھا مطلب وہ اپنے ترکش کے سارے تیر آزما کر آیا تھا۔

اب انہیں ہر حال میں چند لمحوں میں ہی نکلنا تھا ورنہ انکی تلاش تو جاری تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ انکی تلاش میں سب سے بڑی رکاوٹ معصوم بچوں کی چیخیں ہیں ورنہ فوجی انہیں لمحوں میں تلاش کر لیتے۔

رسی کہاں ہے عمر؟؟؟ اس نے چیخ کر پوچھا۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے دو دھماکوں کے نتیجے میں اتنا دھواں پھیل گیا تھا کہ انکو بھاگنے کا وقت مل گیا تھا۔

عمر نے مڑ کر جعفر کی طرف دیکھا۔

رسی میں نے کافی ہے اور یہ ہم بھی میں نے رکھے تھے کیونکہ مجھے حکم ملا تھا کہ کوئی ثبوت نہیں پہنچا چاہئے

لیکن ہمیں تو نکلنا بھی ہے۔۔۔ وہ دور سے چپنا

ہم میں سے کوئی نہیں نکل رہا اور نکل سکتا ہے۔۔۔ ہم اس وقت پورے طور پر فوجی گھیرے میں ہیں۔ میں یہاں پر تم لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا تا کہ ایک آخری فرض بھی نبھالوں۔۔۔

اللہ اکبر

اس نے نعرہ لگایا اور فضا ایک بار پھر ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ جعفر نے اپنے جسم سے ہم باندھ کر خود کو اڑا لیا تھا۔ ساتھ کھڑے عمر کے جسم کے بھی پر فچے اڑ گئے تھے۔ وہ چونکہ دور تھا اس لیے دھماکے سے مزید دور جا گرا۔۔۔

وہ ہوش میں تھا۔ جسم میں درد کی ایسی لہریں اٹھ رہی تھیں جیسے کوئی اسے تختے میں لگے ہوئے ہے۔ شمار کیلوں پر گھسیٹ رہا ہوا اور جسم ایسے جل رہا تھا جیسے جہنم کی شدید آگ کی لپیٹ میں ہو۔ اسکی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ درد کے آنسو ہیں۔ اسکا سر کیاری کے گرد پڑی اینٹ پر لگا تھا اور اسی پر پڑا تھا اس لیے وہ آنکھیں کھول کر اپنے جسم کو دیکھ سکتا تھا۔ اور ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اسکے دائیں طرف اسکے سر سے نکلا ہوا خون پڑا تھا، اسکی ایک ٹانگ کا پچھے والا حصہ تقریباً کٹ گیا تھا بس گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جس سے وہ اوپر والے حصے سے منسلک تھا۔ دوسری ٹانگ کٹی تو نہیں تھی لیکن اسکے کافی حصے سے چمڑا گوشت سمیت ایسے الگ ہو گیا تھا کہ اندر کی ہڈی صاف نظر آرہی تھی اور زخم جلنے کیوجہ سے سارا گوشت کالا ہو گیا تھا۔ سر اینٹ پر لگنے سے اس میں سے بھی خون کا ایک فوارہ ابل پڑا تھا۔ جسم کا اوپری حصہ وہ دیکھ نہیں سکا لیکن درد اور جلن سے لگ رہا تھا کہ سارے جسم کا گوشت پوست اسی طرح ہڈیوں سے الگ ہو کر جل گیا ہوگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے آخری بار اپنے رب کو یاد کرنے کی کوشش کی اور کلمے کے لیے زبان ہلائی۔ لیکن اسکی زبان سے کلمہ نہیں نکل سکا۔

اللہ نہیں چاہتا کہ میں اپنی زبان سے اسکا نام لوں۔ اس نے تلخی سے سوچا

آنسوؤں کی شدت میں اضافہ ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جا مجاہد اللہ۔ تو جیت گیا لیکن تیری ماں ہار گئی۔ اپنی بھی اور اپنی مانتا بھی۔ تجھے کسی کی جان لیا تو نہیں سکھایا تھا پھر تو نے اتنے بے قصوروں کو کیسے بے رحمی سے مارا؟؟

اماں مجاہد اللہ بول۔ ایک آخری بار رحمۃ بول لے۔ وہ اپنے ذہن کی پرواز سے ماں سے التجاء کر رہا تھا

مجاہد اللہ۔۔۔۔۔ میرا رحمۃ تو زندہ نہیں ہے۔ وہ تو تب کامر گیا تھا جس دن وہ میری مانتے ہوئے بڑے بدر سے چلا گیا تھا۔ تو تو مجاہد اللہ ہے رحمۃ نہیں۔

اماں۔۔۔۔۔ اسنے بلانا چاہا
نہیں نہیں۔۔۔۔۔ تو رحمۃ نہیں ہو سکتا۔ رحمۃ تو میرا بیٹا تھا۔ ہمارے عبداللہ کا سایہ تھا وہ۔ تو تو قاتل ہے
بہت سارے عبداللہ کا۔۔۔

اماں۔۔۔۔۔
وہ جا رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ روکنا چاہتا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی
میں اللہ سے کہوں گی کہ تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ ہاں تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ تو تو قاتل ہے صرف
قاتل۔۔۔۔۔

اور وہ چلی گئی۔ بند آنکھوں کا پردہ ایک بار پھر شفاف ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔
اسے لگد ہاتھا جیسے کوئی اسکے جسم سے چمڑی اڈھیز رہا ہو اور جلن اتنی تھی جیسے کوئی اسے بھڑکتے شعلوں
پر بھون رہا تھا۔۔۔

کیا موت کی تکلیف اتنی زیادہ ہوتی ہے؟ دوسروں کو موت دیتے ہوئے آج وہ خود اسی کا شکار تھا
اسے یاد آیا وہ جوان فوجی جو خود بھڑکتے شعلوں میں کھودا تھا اور پھر بھڑکتے شعلوں نے اسے خود ہی
خود سے دور پھینکا۔۔۔

اسے بھلا کیوں تکلیف ہوگی رحمت؟؟؟ وہ تو تیرے ظلم کے شکاروں کی جانیں بچانے آیا تھا۔ اس
بار ذہن کے پردے پر ابھرنے والی ہیبیہ۔ عالیہ کی تھی۔

تیرے بڑوں نے تو پیسے اور مفادات کیلئے کیا ہے رحمت۔ تم نے کیا کیا؟؟؟ اپنے ساتھ بھی اور ہم
سب کے ساتھ بھی۔ اس سب سے بہتر یہ ہونا کہ تم ایک ہی بار میں اپنی جان لے لیتے جب تمہیں پتا چلا
تھا سب کا اور مجبور کیا جا رہا تھا۔ زندگی کی آس میں اتنے قتل کر کے مرنے سے تو بہتر ہونا کہ ایک حرام
موت کا گناہ اپنے سر لے لیتے۔

وہ بول کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ مرنا چاہ رہا تھا لیکن۔۔۔۔۔
یہ موت اتنی دور کیوں ہو گئی ہے؟ مجھے کیا موت بھی قبول نہیں کرے گی؟؟؟ اسنے تلخی سے سوچا۔ آج
اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ موت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ خود بھی تو موت کا ہی سودا گر تھا لیکن اپنے

سودے کا زائغہ آج چاک رہا تھا اور جان گیا تھا کہ اسکی دی ہوئی تکلیف کتنی زیادہ تھی۔
وہ درد سے چیخنا چاہ رہا تھا لیکن نہیں چیخ سکا۔ اسکی زبان اور آواز بند تھی۔

میں نے تم سے کہا تھا مجاہد کہ ایک بات ایسی ہے جو میں تم سے نہیں کہہ سکتا اور وہ یہی بات تھی کہ اس کام میں ایک تو تمہارا زندہ بچنا ناممکن تھا اور اگر بچ بھی جاؤ گے تو تمہاری واپسی کا کوئی رستہ نہیں ہے۔ اس بار زہن کے پردے پر ابھرنے والی شبیہ ڈاکٹر شکیل کی تھی۔

تو دھوکہ ہوا ہے میرے ساتھ۔۔۔ وعدہ خلافی کی انہوں نے۔۔۔ وہ صرف سوچ ہی سکا کہ بیک اپنے گناہوں کو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کا رنگ دیتے رہو گے رحمت؟؟ ہر بار تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہوتا بلکہ اس بار تمہارے چپکلے گناہ تمہارے سامنے آئے ہیں۔ اللہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ تمہیں معاف کر دے اور تمہیں آزادی ملے۔ یاد کرو کہ کتنوں کو تکلیف دے چکے ہو تم۔ اب کی بار پھر عالیہ بولی تھی۔

تو ہمارے ساتھ جعفر کو بھیجا ہی اس لیے گیا تھا کہ ہم میں سے کوئی زندہ مانچے۔ ہم میں سے کسی کے پاس ہم نہیں تھے مطلب سارے دھماکے کرنے والا جعفر ہی تھا جس نے پہلے دھماکے کر کے بچوں سمیت حمزہ کو مارا اور پھر ہم دونوں بچ جانے والوں کو اپنے سمیت اڑالیا۔ رسی بھی تو اسی نے کاٹی تھی اور اس نے دھماکے سے پہلے بتا دیا کہ اسے یہی حکم ملا تھا۔۔۔ زہن میں آگئی کے درواہ پر ہے تمہارا اسکی تکلیف کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ کیسی تکلیف تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اسے لگا جیسے موت بھی اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔ وہ جو زندگی کی آس میں یہاں تک آیا تھا اب اپنے لیے موت کی تمنا کر رہا تھا۔

ہاں بالکل ٹھیک سمجھے تم۔ لیکن افسوس کہ بہت دیر سے سمجھے ہو۔ شکیل بھائی کی آواز آئی۔
اس نے آنکھیں کھول لی۔ درد کی شدت سے چلانا چاہا لیکن ایسا کرنا بھی ناممکن تھا اس کے لیے۔
پورے جسم میں صرف اسکی آنکھیں تھیں جو سلامت تھیں۔ یعنی کہ اللہ اسے دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھ لو رحمت اللہ ایک تیری رسی تھی اور ایک میری۔ تیری رسی کی مارتو وہ تھی جو نو جوان فوجی نے کھائی۔ ہلکی اور کم وقت کی۔ اور یہ میری رسی کی مار ہے کہ تو جو موت بانٹتا پھرنا تھا اب اپنے لیے موت مانگ رہا ہے
تیرے مولانا صاحب نے دام لیے ہے رحمت۔ میرے عبداللہ جیسے بہت سارے معصوموں کے لہو کے دام لیے ہیں۔۔۔ عالیہ شدید غصے میں تھی۔۔۔

اس وقت وہ دو درروں میں مبتلا تھا۔ ایک پچھتاوے کا شدید درد تھا جو کسی بھی قریب المرگ شخص کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اور دوسرا دھڑے ہوئے جسم کا جسمانی درد تھا جو ناقابل بیان تھا۔ اس

نے آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں۔ آنسو اسکی بند آنکھوں سے نکلے اور گال پر اپنی راہ بنا گئے۔

پشاور، ورسک روڈ پر واقع آرمی پبلک سکول پر دہشتگردوں کا حملہ۔ سکول کے اندر سے دھماکوں کی آوازیں متعدد دہلاکتوں کا خدشہ۔۔۔

ارسلان میننگ سے نکل کر ابھی صبا کو فون کرنے کیلئے اپنا فون نکال ہی رہا تھا کہ نظر سامنے داخلی دروازے کے بالکل اوپر لگے ہوئے فی وی سکرین پر پڑی جہاں یہ خبر چل رہی تھی۔ وہ بت بنا سکرین کو نکلے جا رہا تھا۔ ساتھ کھڑے کوئی بات کرتے جنید کی نظر پہلے اس پر اور پھر اسکی نظروں کے تعاقب میں سکرین پر پڑی تو سارا معاملہ سمجھنے میں لمحے کی بھی دیر نہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ارسلان اپنے ہاتھ میں پکڑی فائلیں وہی زمین پر پھینک کر دروازے سے باہر دوڑا۔

ارسالان

ارسلان ----- رکو میری بات سنو۔ وہ پیچھے سے پکارا لیکن وہ نہیں رکا

جنید تیزی سے اسکے پیچھے بھاگا اور اسے چالیا۔۔

ارسلان رکونا بات تو سنو میری۔ کہاں جا رہے ہو ایسے؟؟؟

مُٹھے جاتا ہے۔۔۔۔۔ مُٹھے جاتا ہے وہاں۔۔۔ صبا و وہیں ہے۔۔۔

تو میں جانتا ہوں یہ تم بس مجھے یا رنگ سے گاڑی نکالنے دو میں بھی چلتا ہوں

ارسلان کو خاموش دیکھ کر وہ مڑا اور بھاگ کر پارتنگ میں جا کر گاڑی نکال لایا۔ ارسلان کو بٹھا کر اس نے انتہائی تیزی سے گاڑی گھمائی اور روڈ پر لے آیا۔

اس وقت سڑکوں پر اتنا رش نہیں تھا اور جنید کافی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن جو حالت ارسلان کی تھی اس میں تو ایک لمحہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے تو پھر اسلام آباد اور پشاور کا فاصلہ زیادہ ماسکی دو گھنٹوں کا تو تھا ہی۔

جذیتیز چلاؤنا یا راتنی دیر کیوں لگا رہے ہو۔۔۔ وہ بار بار کہتا اور جذید بغیر کچھ کہے خاموشی سے سڑک پر توجہ رکھے ہوئے تھا کیونکہ جس رفتار سے وہ گاڑی چلا رہا تھا اس میں گاڑی کا بے قابو ہونے کا بہت خدشہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر عام حالات ہوتے تو اس سے بہت کم رفتار میں چلنے پر ارسلان اس سے لڑتا رہتا کیونکہ وہ تیز ڈرائیو نگ بالکل پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت بس وہ وہاں پہنچنا چاہ رہا تھا۔

ارسلان تم کا مران کو فون کرو اور اس سے کہو کہ وہاں پہنچ جائے۔

اور اس نے کامران کو فون ملا یا۔ فون بہت مشکل سے ملا اور کامران جہاں کھڑا تھا وہاں بہت شور کی

آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ارسلان کی سن رہا تھا اور ارسلان اسکی سن پارہا تھا۔ بس اسے صرف یہ سمجھ آگئی کہ کامران وہاں گیا ہے لیکن وہاں کسی کو قریب جانے نہیں دے رہے کیوں کہ آرمی کا آپریشن شروع ہو گیا ہے۔۔۔

اسکے بعد فون بند ہو گیا۔ اس نے دوبارہ ملانے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار اسکا فون بند مل رہا تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر لگا دیا۔

پریشان مت ہوا اور دعا کرویا۔ بھائی کو کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ سب ٹھیک ہوگا۔۔۔ اسکے پلکوں سے گرنے والے آنسوؤں کو دیکھ کر جنید نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تو تھا کہ وہ صبا سے بہت محبت کرتا ہے لیکن اسکی آنکھوں سے بہتے آنسو اسکی شدتوں کو بیان کر رہے تھے۔ وہ خاموش رہا آنسو اب بھی بہتے رہے۔

کتنا غم رہتا ہے؟؟؟

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو بس یہی ایک سوال کیا۔۔۔ جنید کا دل کیا کہ کاش اسکے پاس کوئی جاو کی چٹری ہوتی اور وہ پلک جھپکاتے ہی اسے وہاں پہنچا سکتا۔ بس تھوڑی دیر۔۔۔

اور ارسلان نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔

اسکی آنکھوں کی لالی جنید دیکھ چکا تھا۔ اور اسکی آنکھوں سے گرتے آنسو جنید کے دل پر پڑ رہے تھے۔ ہوا کی رفتار سے گاڑی بھگاتے اسلام آباد سے پشاور تک کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کر کے وہ شہر کے اندر آئے اور جنید نے گاڑی کا رخ سیدھا ورساک روڈ کی طرف رکھا لیکن شہر کے حالات اس وقت تک بہت بدل چکے تھے۔ آرمی اپنا کام کر رہی تھی اسلیے شہر کی سڑکوں کو جگہ جگہ ٹراکوں پر بند کر دیا گیا تھا۔ اور میلوں تک پھیلی گاڑیوں کی قطاریں بتا رہی تھیں کہ وہاں سے نکلنے میں کافی وقت لگے گا۔ سکول کے رڈر کا کافی دور تک علاقے کو گاڑیوں کیلئے بند کر دیا گیا تھا۔ جنید انتہائی آہستہ سے آگے والی گاڑی کے پیچھے چلتا ہوا گاڑی کو لائن میں ڈالنے ہی والا تھا کہ ارسلان نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ جنید پیچھے سے آوازیں دیتا رہا لیکن وہ نہیں رکا۔ جنید نے گاڑی لائن میں کھڑی کرنے کی بجائے باہر نکال لی۔ جسکو لے جانے کیلئے وہ یہ کر رہا تھا وہ تو چلا گیا تھا۔ اس نے گاڑی موڑی اور فٹ پاتھ کے اس پار دوکانوں کے سامنے بنی چھوٹی سڑک پر لے جا کر روکی اور تالا لگا کر وہ بھی ارسلان کے پیچھے دوڑا اور دور تک وہ اسے نظر نہیں آیا جانے اتنی دیر میں ارسلان کہاں پہنچا تھا اور کہیں پہنچا بھی تھا یا نہیں۔

دیوانگی اور پاگل پن کی اگر کوئی حقیقی جاہلی صورت ہوتی تو اس وقت ارسلان رضا اسکی ایک مکمل تصویر تھا۔۔۔

بکھرے ہوئے بال جو صبح اس نے بہت سلیقے سے سجائے تھے، بلیک پینٹ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی نیلی شرٹ میں ملبوس وہ انتظار میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کے بیچ میں رستہ بناتے ہوئے ایسے بھاگ رہا تھا جیسے اسے ارد گرد کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ جگہ جگہ بھاگتے بھاگتے کھڑی گاڑیوں کے شیشوں میں شرٹ پھنس جانے سے وہ کچھ جگہوں سے پھٹ چکی تھی اور ایک جگہ کسی گاڑی کی ڈگی سے ٹکرانے اور گرنے کے نتیجے میں اسکے دائیں ہاتھ پر چھوٹ بھی آئی اور اس سے خون بھی نکل رہا تھا لیکن اس سب کی پروا اسے کہیں تھی۔ اسے تو صبا کے پاس پہنچنا تھا جو جانے کس مشکل میں ہوگی اور اس نے ارسلان کو کتنا یاد کیا ہوگا۔

وہ بھاگتا رہا ایسے جیسے کبھی تھکے گا نہیں۔۔۔۔۔

سر آپ آگے نہیں جاسکتے آگے علاقہ کلیئر کیا جا رہا ہے۔ ابھی وہ سکول سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا کہ ایک فوجی نے اسے روک لیا۔

وہ ہفتوں کی طرح اسکی طرف دیکھتا رہا۔ اسکا حلیہ اور اسکی حالت اسکی آنکھوں کی لالی سمیت اسکا حال بتانے کو کافی تھی۔

مم مجھے جانا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے بولا

میں جانتا ہوں سر لیکن وہاں کام ہو رہا ہے اور آپ سب کا جانا نقصان میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ فوجی جوان نے وہاں کھڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے ارد گرد دیکھا، وہاں واقعی بہت سارے لوگ کھڑے تھے جو اپنے پیاروں کیلئے وہاں جمع ہوئے تھے بہت سارے مرد اور بہت ساری خواتین۔ سب کو اپنے پیاروں کی فکر تھی اور ہر کوئی آگے جانا چاہتا تھا لیکن وہاں بہت سارے فوجی کھڑے تھے جو ان کو آگے نہیں جانے دے رہے تھے کیونکہ وہاں اتنے افراد کے جانے سے امدادی کاروائیوں اور آپریشن میں بہت مشکل پیش آسکتی تھی۔

اور اسوقت فلک نے پہلی بار اس فٹ پاتھ پر کسی انسان کو سجدے میں گرتے دیکھا ہوگا۔ اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر آسمان اور اس میں بیٹھے ہوئے فرشتے آنسو بہا سکتے ہوتے تو اس وقت سجدے میں گرے ہوئے اس جوان شخص کی سسکیوں سے ہلکورے لیتے جسم کو دیکھ کر ضرور رو پڑتے۔ وہ اس بے خاک زمیں پر سجدے میں پڑا ہوا تھا۔

جانے کتنی دیر وہ سجدے میں پڑا رہا جب کسی نے آکر اسے زبردستی اٹھایا۔ وہ نہیں اٹھنا چاہ رہا

تھا لیکن اسے اٹھا لیا گیا۔ وہ کامران اور جنید تھے جو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آپہنچے تھے۔ وہ ماتھا اور اس پر آگے آتے ہوئے بال جسکو دیکھ کر صبا کو ہمیشہ اس پر بہت پیارا آتا تھا اس وقت دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ جنید نے جیب سے رومال نکال کر اس کے چہرے اور ماتھے سے دھول ہٹائی۔ اور صرف وہ نہیں رو رہا تھا۔ عمر کے اس حصے میں آکر صبا کی شکل میں اپنی بڑی بہن پانے والے کامران کی آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ اور صرف وہ ہی کیا اس جگہ پر کھڑے ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو ہی رواں تھے۔

بس کر دو کامی۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ میں کہہ رہا ہوں نا بھابی کو کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ بس تم لوگ دعا کرو۔ چند نے کامران کو ڈانٹا

وہ تینوں وہی زمین پر بیٹھے تھے۔ فوجی کہہ رہے تھے کہ تھوڑی دیر میں علاقہ کلیئر ہو جائے گا تو ان سب کو آگے جانے دے دیا جائے گا لیکن انتظار تھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اور اگر انتظار آنسوؤں کے ساتھ ہوا اور زندگی کا ہوا تو اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی چیز اس دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔۔۔

عاشی۔۔۔۔۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے عانشہ کو آواز دی جو کچن میں مصروف تھی۔
اسکی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ عانشہ کچھ بھی پوچھے بغیر فوراً لاؤنج میں آئی۔ اور اسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگی جوئی وی کی سکریں پر جمی تھی۔
پشاور ورسک روڈ پر واقع آرمی پبلک سکول میں دھماکہ آرمی کا آپریشن شروع۔ ابتدائی
اطلاعات کے مطابق دس بچے جاں بحق۔۔۔
وہ دونوں دم سادھے سکریں کو ننگے چارے تھے۔۔۔

شاہنواز شہر۔۔۔۔۔۔ عانشہ کے منہ سے بس اتنا نکل سکا
اور شاہنواز بجلی کی سی تیزی سے گاڑی کی چابی اٹھا کر بھاگا۔ پیچھے عانشہ بھی لپکی۔ اماں اپنے کمرے میں تھی اور وہ دونوں انہیں بتائے بغیر ہی نکل گئے

گاڑی میں بیٹھتے ہی شاہنواز نے انتہائی تیزی سے گاڑی ریورس کی اور سکول کے راستے پر ڈال دی۔

وہ انتہائی خراب ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن پھر بھی کر رہا تھا اور ساتھ میں بیٹھی ہوئی عائشہ جو تھوڑی سی تیز رفتاری سے ڈرجائی تھی اس وقت ایسی ڈرائیونگ پر بھی بالکل خاموش تھی۔ وہاں سوال انکے

شہر کا تھا جو بہک وقت ان دونوں کی جان تھا۔

شاہنواز شہر ----- عائشہ بس اتنا کہہ سکی۔

کچھ نہیں ہوا شہ کو۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگا انشاء اللہ۔۔۔ اس نے تسلی دی۔

ماں کے دل کا قصور تھا یا پھر اسے ہونے والے وہم کا کہ اسے بالکل تسلی نہیں ہوئی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی۔

وہ وہاں پہنچے تو لیکن آگے کچھ فوجی کھڑے تھے اور کچھ لوگ بھی وہاں کھڑے تھے جن کو وہ فوجی آگے جانے سے روک رہے تھے۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر ا اور سپدھا جانے لگا۔۔

سر آپ آگے نہیں جاسکتے۔ ابھی آپریشن شروع ہو گیا ہے اور امدادی کاروائیاں بھی چل رہی ہیں ایسے میں لوگوں کا وہاں جانا مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ ایک فوجی اسے روکتے ہوئے بولا ارے کیسی مشکل؟؟؟ میرا بچہ وہاں ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نہیں جاسکتا۔۔۔

سرا ان سب کے بچے وہاں ہیں لیکن ایسے ہم کسی کو بھی جانے نہیں دے سکتے۔۔۔

اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور فوجی کے ہاتھ میں نھادیا جس پر اسکی آرمی کی جاب کی ساری تفصیلات تھیں۔۔۔ فوجی اسکے راستے سے ہٹ گیا۔۔۔

سراپنی مز کو مت لے کر جائیں۔ ا سے ریکوئسٹ سمجھ لیں۔ سپاہی نے عا نشہ کو اس کے پیچھے جاتے دیکھ کر کہا۔۔۔

اس نے پیچھے دیکھا تو عارضہ بالکل اسکے پیچھے ہی کھڑی تھی۔۔

عاشی تم یہاں رکو میں تھوڑی دیر میں شہر کوڈھونڈھ کر آتا ہوں۔ وہاں سے روکتے ہوئے پولا

نہیں مٹا ہوا زمیں بھی جاؤ گی۔۔۔ وہ روتے ہوئے پوچھ

عاشی میں آتا ہوں مانتھوڑی دیر میں۔ تم پلیز یہی رہو۔

اور وہاں جاتے ہوئے بھی رک گئی۔ کربھی کیا سکتی تھی وہ اس کے علاوہ۔

وہ چلا گیا۔ اور تقریباً بھاگتے ہوئے سکول تک پہنچا

وہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ سپاہی نے عائشہ کو ساتھ نالے جانے کی درخواست کیوں کی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ یہاں پہنچ جاتی تو اس وقت شہنواز کو شہر سے زیادہ عائشہ کی فکر ہوتی کیوں کہ جو وہاں ہو رہا تھا وہ کبھی بھی وہر داشت نہ کر پاتی۔

مسلسل کولیاں چل رہی تھیں اور رضا کا اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر اندرجا کر بچوں کو اٹھا کر لارے تھے۔ اور جن بچوں کو لارے تھے ان میں سے زیادہ تر انکے ہاتھوں میں جمبول رہے تھے

اور خون انکے معصوم یونیفارم کوڑے کے ہوئے تھا۔۔۔۔۔
وہ گیٹ کی طرف گیا اور تھوڑی دیر وہاں رک کر ٹکٹے اور ٹکالے جانے والے بچوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ بچے ایسے تھے جو زندہ نکل رہے تھے اور روتے ہوئے اپنے والدین کو تلاش رہے تھے۔ وہ ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھتا رہا لیکن ان میں کوئی بھی بچہ شہید نہیں تھا۔
اچانک تین چار بچوں کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی نکلا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اسکے مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ شاہناز کے دل اور جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔

شہید۔۔۔۔۔ وہ زور سے چیخا
لیکن وہ انکی طرف دیکھے بغیر معصوم قدموں سے بھاگتا رہا۔ وہ بھی اسکے پیچھے لپکے اور چند قدموں میں ہی اسے جالیا اور پیچھے سے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھالیا اور تقریباً بھاگنے ہی لگے۔ تھے ک۔۔۔۔۔
شہید۔۔۔۔۔ انکے منہ سے خود ہی نکلا۔
وہ شہید نہیں تھا۔۔۔۔۔

ایک بار پھر ایک اذیت نے اسے گھیر لیا۔ وہ کسی کا شہید تھا تو لیکن اسکا شہید نہیں تھا۔ وہ بچہ رورہا تھا۔ شاید ڈر گیا تھا اس لیے گیٹ سے ٹکٹے ہی کچھ بھی دیکھے بغیر ایک طرف کو بھاگ گیا تھا۔
بیٹا اس طرف مت جاؤ۔ اس طرف جاؤ وہ دیکھو وہاں آپ کے دوست بھی جا رہے ہیں وہاں آپکے پاپا بھی ہونگے۔ شاہناز نے اس طرف اشارہ کیا جس طرف سارے سلامت ٹکٹے والے بچوں کو بھیجا جا رہا تھا اور جس طرف سب بچوں کے والدین کھڑے تھے۔
وہ بچہ کچھ کہے بغیر اسی سمت میں بھاگا جو شاہناز نے اسے کہا۔
اسکے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی اور وہ ایک بار پھر گیٹ کی طرف گیا اور وہاں کھڑے ہو کر ہر سلامت اپنے پاؤں پر نکلے والے اور ہر رضا کار کے ہاتھ میں ٹکٹے والے زخمی بچوں کو غور سے دیکھنے لگ گیا۔ شاید اسکا شہید بھی نکل آئے۔۔۔۔۔

بہت دیر گزر گئی لیکن اسکا شہید نہیں نکلا۔ نا سلامت نکلا اور نا ہی کسی کے ہاتھوں میں۔۔۔ وہ وہی کھڑا شہید کا انتظار کرتا رہا۔ پھر عا نشہ بھی وہاں آ گئی اور سب والدین جن کے بچے نہیں ملے تھے وہ اپنے جگر کوشوں کی تلاش میں لگ گئے۔ آپریشن ختم ہو چکا تھا۔ وہ اور عا نشہ بھی شہید کو تلاش کرتے رہے۔ وہ اسکے کلاس روم میں گئے اس حسرت میں کہ ہو سکتا ہے وہ وہاں ملے۔ لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اس کے

کلاس کے کچھ بچے خون میں لٹ و ہاں پڑے تھے لیکن ان میں شہرہ نہیں تھا۔ ایک فوجی کی بیوی ہو کر بھی معمولی سے خون سے ڈر جانے والی عا نشہ جانے کیسے اتنے حوصلے سے اپنے بیٹے کو تلاش کر رہی تھی۔۔۔
 شہرہ اس لیے کہ وہ اس وقت ایک ستائیس سالہ لڑکی نہیں بلکہ ایک ماں تھی جسکی اولاد مشکل میں تھی اور مشکل بھی جانے کیسی تھی۔۔۔ نہ جانے ماںیں اتنا حوصلہ کہاں سے لاتی ہیں؟؟؟
 اور پھر اچانک عا نشہ کی نظر سامنے آنے والے رضا کار پر پڑی جسکے ہاتھوں میں ایک معصوم وجود جھول رہا تھا۔۔۔

شہرہ ہنوا ز شہرہ۔۔۔۔۔ وہ اپنے شہرہ کو لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اور اپنے وجود کے ٹکڑے کو ایک عورت کیسے نہیں پہچانے گی۔۔۔
 شہرہ ہنوا ز نے بھی ادھر ہی دیکھا جہاں عا نشہ دیکھ رہی تھی۔

اور پھر وہ بھاگ کر اس شخص کے پاس پہنچی شہرہ ہنوا ز بھی اسکے ساتھ ہی تھا۔ وہ شخص واقعی شہرہ کو اٹھائے ہوئے تھا۔

وہ شخص جلدی سے ایک خالی ایمبولینس کی طرف بھاگا اور اس میں شہرہ کو لٹا کر شہرہ ہنوا ز اور عا نشہ کو بھی ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کر کے فوراً دوبارہ سکول کے اندر بھاگ گیا۔ کسی اور شہرہ کو پہچانے کیلئے۔۔۔
 شہرہ زخمیوں سے چور تھا۔ وہ دونوں اسے آوازیں دیتے رہے لیکن وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔
 وہ مجھ سے کہتا رہا کہ میں کل نہیں جاؤنگا لیکن میں نے اسے بھیجا۔ میں نے اسے مار دیا ہے۔ اپنے بیٹے کو مار دیا ہے میں نے۔۔۔ عا نشہ کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔

ہمارا بیٹا زندہ ہے عا نشہ۔۔۔
 وہ کچھ بھی تو نہیں بول رہا۔ کیسے زندہ ہے۔۔۔ وہ بہت رورہی تھی۔
 وہ سانس لے رہا ہے تم بس دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اندر سے آہستہ آہستہ ٹوٹ کر بکھرنے والا شہرہ ہنوا ز تسلی کے بس اتنے ہی الفاظ بول پایا۔۔۔

اٹھ جاؤ بیٹا دیکھ لو تمہارے پاپا آگئے ہیں۔ عا نشہ نے اسے ہلایا۔ لیکن وہ تب بھی بے ہوش رہا۔
 ہسپتال پہنچتے ہی شہرہ ہنوا ز نے اسے گود میں اٹھا لیا اور ایمبولینس سے پیچھے اتر کر امیرجنسی کی طرف بھاگا۔ وہاں بھی کچھ فوجی جو یہی کام کر رہے تھے شہرہ ہنوا ز کے ہاتھ سے شہرہ کو اٹھا کر اندر بھاگے۔
 شہرہ ہنوا ز اور عا نشہ بھی انکے پیچھے ہی تھے۔

عا نشہ شہرہ نے آنکھیں کھولی تھیں ابھی۔ قسم سے میری گود میں تھا تو آنکھیں ہلکی سے کھول لی تھیں۔
 وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے آنسوؤں کے ساتھ جانے کیا پڑھ رہی تھی

شہر نے واقعی آنکھیں کھولی تھی تھوڑا سا کسمپاسا تھا اسکے تھوڑی ہی دیر بعد جب عا نشہ نے اسے یاد دلایا کہ اسکے پاپا اس سے ملنے آگئے ہیں تو اپنے پاپا کی گود میں اس نے واقعی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی اور وہ تھوڑا سا کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اپنے پاپا کو ایک نظر دیکھ لیا تھا اس نے لیکن اس کوشش کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو گیا اور نا چاہتے ہوئے بھی اسکی آنکھیں بند ہو گئیں۔۔۔

ہیلو امی۔۔۔۔۔

کیا ہوا؟؟؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟؟؟ وہ پریشان ہوئیں۔

کچھ نہیں امی۔ آپ نے ٹی وی نہیں دیکھا کیا؟؟؟

نہیں۔۔ کیوں کیا ہوا؟؟؟

امی وہ آرمی پبلک سکول میں دھماکہ ہو گیا ہے۔۔۔ وجہ۔ نے بغیر کسی تمہید کے کہا

کیا؟؟؟ یہ کیا کہہ رہی ہو وجہ؟؟؟

جی امی۔۔ میں بس گھر آ رہی ہوں تھوڑی دیر میں۔ یونیورسٹی کو بھی خالی کروا رہے ہیں۔

لیکن کیسے آؤ گی؟؟؟

امی زونیراڈ راپ کر دے گی مجھے۔۔۔

اچھا ٹھیک ہے۔۔ میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں۔۔

امی۔۔۔۔۔ وجہ۔ پکاری

کیا ہوا بیٹا؟؟؟ وہ محبت سے بولیں

امی صارم ٹھیک ہیں؟؟؟ وہ ہلکے سے بولی

کیوں صارم کو کیا ہوا ہے؟؟؟ وہ بے حد فکر مندی سے بولیں

امی وہ آرمی کا آپریشن شروع ہو گیا ہے نا اس لیے۔۔۔۔

اچھا؟؟؟ تمہیں کیسے پتا؟؟؟ وہ یقین نہیں کر رہیں تھی

آپ ٹی وی دیکھ لیں امی۔۔۔ میں گھر آتی ہوں۔ اللہ حافظ۔۔۔ پریشانی میں اسکے منہ سے بس

ایسے ہی الفاظ نکل سکے

میں ابو سے بات کرتی ہوں تمہارے۔۔۔ اور فون بند کر دیا۔۔۔

میں نے ٹی وی آن کیا تو یہی خبر چل رہی تھی۔۔۔ حیدر کوفون ملا یا تو فون بند۔ پریشانی کے عالم میں وہ

ماں بیٹی مجھے زبیدہ کے پاس چلی گئیں جو اس سب سے بے خبرناشتہ کے برتن دھونے میں مصروف

تھی۔ لیکن وہ اسکو صرف اتنا ہی بتا پائے تھے کہ سکول پر حملہ ہو گیا ہے کہ سفیر علی خود ہی آگئے۔
سفیر کیا ہوا ہے؟؟ آپ اتنی جلدی کیوں آگئے؟؟ غزالہ جو وجہ کی باتوں سے ہی ڈری ہوئی تھی
فوراً پوچھا

صارم اور ریحان کہاں ہیں؟؟ وہ بھی پریشان تھے
صارم آفس اور ریحان یونیورسٹی۔۔۔
اتنے میں وجہ بھی پہنچ گئی۔ وہ سب لاؤنچ میں جمع تھے۔
میٹھے نے فی وی آن کر دیا جس میں آرمی کے آپریشن کی خبر چل رہی تھی اور سکول کے اندر دو تھے و تھے
سے ہونے والے دھماکوں کی خبر بھی۔ زبیدہ کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔۔
میں پتا کرتا ہوں پریشان نا ہو۔ انہوں نے فون نکالا اور صارم کا نمبر ملا یا۔ لیکن یہ نمبر تو وہ پچھلے
پندرہ منٹ سے بیسیوں دفعہ ملا چکے تھے لیکن جواب ایک بار پھر نہ ملا۔۔۔
انہوں نے ریحان کا فون ملا یا۔ چند بار لائن کٹ جانے کے باعث نہیں مل سکا لیکن پھر ایک بار مل
گیا اور اس سے صرف ایک دو باتیں ہی ہو سکی۔ لیکن تسلی ہو گئی کہ وہ خیریت سے ہے۔۔
انہوں نے ایک بار پھر صارم کا نمبر ملا یا لیکن نہیں ملا۔۔۔
ابا انکے آفس سے معلوم کر لیں۔۔ میٹھے نے تجویز دی جو کافی معقول تھی۔
انہوں نے اس کے آفس کا نمبر ملا یا لیکن فون وہاں کا بھی مصروف ہی تھا۔۔
میرا صارم کہاں ہے حیدر بھائی؟؟ اسکا پتا کر لیں۔ زبیدہ اب رونے ہی والی تھی
پریشان نا ہو زبیدہ اللہ خیر کرے گا۔ انہوں نے تسلی دی۔
لیکن ماں کے دل کو آج تک کبھی تسلی دی جاسکی ہے جو انکے دل کو ملتی۔ جانے اللہ نے ہر نعمت
دے کر ماں کے دل کو تسلی کی نعمت سے کیوں محروم رکھا ہے۔ کمبخت کبھی ماں کو تسلی کھاتا ہے اور نا ہی جھوٹی
امید باندھتا ہے۔

آپ کسی طرح پتا کریں نا اسکا سفیر بھائی۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟؟
میں کر رہا ہوں زبیدہ لیکن نا اسکا فون مل رہا ہے نا ہی اس کے آفس کا۔ میں چلا بھی جاؤنگا لیکن رستے
سارے بند کر دیے ہیں اور اس طرف جانے والے تو سارے راستے مکمل طور پر بند ہیں۔ میں
کیا کروں؟؟ اب وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔

وجہ یہ بالکل الگ تھا۔ کھڑی خود کو سنبھالے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی کئی دفعہ صارم
کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن نہیں مل سکا۔ زبیدہ خالہ تو اب رو رہیں تھیں۔ امی اور میٹھے انہیں تسلی ہی دے

رہی تھی جو اس پریشانی میں بالکل بے سود تھی۔

جب وہ لاؤنچ کے اس کونے میں آنسوؤں کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرنے لگی تو وہاں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے مزید اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں اور انہیں بہنے دیا۔۔۔ وہاں نہیں تھی لیکن اسکا دل پھر بھی ڈر رہا تھا۔

جب دل کچھ ہلکا ہوا تو وہ اٹھی اور واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر تویلیے سے منہ خشک کر کے دوبارہ نیچے آ گئی۔۔۔

ریحان بھی آ گیا تھا۔۔۔ گھر کے سارے مکین آ چکے تھے۔ نہیں آیا تھا تو صارم ہی نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔

۔ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔

یہ جان تو آتی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔۔۔

اسکے ذہن میں شعر کے الفاظ گونجنے لگے۔۔۔۔

نہیں صارم ایسا کچھ مت کرنا۔ تمہاری جان کی بہت قیمت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ بس اتنا ہی سوچ پائی کہ ابا کا فون صارم کے آفس میں مل گیا، انہوں نے اشارہ کر کے چپ رہنے کا کہا اور بات کرنے لگے۔۔۔

فون پر انکی باتوں سے لگ رہا تھا کہ انہیں دوسری طرف کی آواز کچھ زیادہ اچھے سے سنائی نہیں دے رہی لیکن وہ بات کرتے رہے۔۔۔

کیا ہوا ابا؟؟؟ جیسے ہی انہوں نے فون بند کیا اس نے بے صبرے پن سے پوچھا

کیا ہوا سفیر بھائی؟؟؟ انکی چند لحوں کی خاموشی زبیدہ سہہ نہیں سکی

وہ کہہ رہے ہیں کہ صارم آپریشن میں گیا ہے لیکن وہ پرامید ہیں کہ وہ انشاء اللہ خیریت سے ہوگا۔۔۔

ابو وہاں دھماکے ہوئے ہیں۔ وہ بغیر سوچے بولی

زبیدہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔۔۔

دھماکے پہلے ہوئے ہیں اور آپریشن بعد میں شروع ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے تصحیح کی۔ شاید صرف تسلی کی خاطر۔

وہ یہ کہہ کر اٹھے اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ریحان بھی انکے پیچھے لپکا۔۔۔

انکے ہی ساعت جانے کیا سوچ کر وہ بھی انکے پیچھے بھاگی۔

ابا مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

پیارا ہم صورتِ حال دیکھنے جا رہے ہیں۔ تم گھر پر رہو، ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔۔۔
وہ جانا چاہتی تھی لیکن اس حالت میں انہیں مزید تنگ نہیں کیا اور اندر آگئی۔۔۔

مشاہدہ کہاں ہو؟؟؟ میں کتنی دیر سے فون کر رہا ہوں۔۔۔ جیسے ہی مشاہدہ نے فون اٹھایا احسان گھبرائی ہوئی آواز میں بولا
کیوں کہا ہوا؟؟؟

کچھ نہیں میں گھر آ رہا ہوں۔۔۔ وہ بہت جلدی میں لگ رہا تھا
آپ کچھ بتائیں تو سہی ہوا کیا ہے؟؟ میرا دل گھبرا رہا ہے احسان۔۔۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔
کچھ نہیں میں دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ اور فون بند کر دیا
اور وہ دو کی بجائے ایک منٹ میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی گلی کے باہر ہی روک لی اور گھر آ گیا
شاہدہ چلو میرے ساتھ۔۔۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی بولا
احسان ہوا کیا ہے؟؟ وہ اب رونے ہی والی تھی۔۔۔
فیصل کے سکول پر حملہ ہو گیا ہے۔۔۔ اس نے بم پھوڑا
کیا؟؟؟؟؟ احسان۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔
فیصل کو کچھ نہیں ہوا لیکن اس کے سکول کو بند کر دیا ہے۔ ہم چل کر اسے لے آتے ہیں۔ وہ شاہدہ کو ہاتھ
سے پکڑ کر کراٹھاتے ہوئے بولا

جلدی سے آ جاؤ۔ اسے ہدایت دے کرو وہ گھر سے باہر نکل گیا۔
وہ بھی بھاگتی ہوئی پہنچی اور احسان نیکیسی کو سڑک پر بھگانے لگا۔ وہاں جہاں انکی دنیا کا ایک بہت بڑا ستون تھا۔

احسان میں آپ سے کہہ رہی تھی ماکہ میرا دل گھبرا رہا ہے اور آپ میرا مذاق اڑاتے تھے۔۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر گاڑی اسی رفتار سے بھگتا رہا۔
شاہدہ بار بار آنسوؤں کے سچ میں منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے تصور میں فیصلہ پر پھونکتی رہی۔۔۔

گاڑیوں کو کافی دور تک روکا گیا تھا۔ احسان نے گاڑی روکی اور بند کر کے پیدل تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں ایک قیامت صغریٰ برپا تھی۔ وہ بھی آگے جانا چاہتے تھے لیکن انہیں روکا گیا۔ وہاں زندہ

سلامت بچنے والے ڈرتے کانپتے بچے آتے رہے اور والدین انہیں گلے لگا لگا کر روتے رہے لیکن انکا فیصل نہیں آتا۔۔۔

پھر انہیں اندر جانے دے دیا گیا اور بہت سارے حواس باختہ والدین کے ساتھ وہ بھی اندر گئے۔ ہر طرف فوجی جوان کاموں میں مصروف تھے۔ کوئی زخمیوں کو اٹھا رہا تھا تو کوئی شہید ہونے والوں کی لاشوں کو اٹھا رہا تھا۔۔۔

وہ دونوں اپنے فیصل کو تلاشتے رہے۔۔۔

کسی کو اپنے پیارے مل رہے تھے اور کسی کو نہیں۔ اور احسان اور شاہدہ کا شمار بھی اس وقت ان بدقسمتوں میں ہو رہا تھا جن کی تلاش صرف تلاش ہی تھی۔۔۔

بھائی نویں جماعت کس کمرے میں تھی؟؟؟ اچانک شاہدہ نے اپنے پاس سے گزرنے والے فوجی سے پوچھا۔۔۔

اور اسکے ساتھ ہی احسان کا دھیان بھی اس جانب گیا۔ اس نے بھی نظر گھمائی تو کسی کمرے کے اوپر اسے نظر نہیں آیا۔۔۔

اوپر والے کمروں میں دیکھ لیں۔ اس فوجی نے کہا وہ دونوں دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے اور لوگوں سے ٹکراتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور وہاں سامنے ہی نويس جماعت کا پورؤ نظر آیا۔۔۔

شہدہ۔۔۔۔۔ وہ ہزیان پن میں چیتے ہوئے اس کمرے کی طرف بھاگا۔ اسکے پیچھے
شہدہ بھی ایسے بھاگی جس کا تصور عام حالات میں کوئی عورت نہیں کر سکتی۔ لیکن صرف وہ عورت کر سکتی ہے
جس کا جگر گوشہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہو۔۔۔

فیصل

اند رتین یا چار بچوں کو خون میں لت پت اور نہاد کچھ کراب ہڈیاں پن کی باری شاہدہ کی تھی۔ ان بچوں کو ایک نظر دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ ان میں اب زندگی کی رتق نہیں تھی۔

پتا نہیں موت کے فرشتے کو ایک ساتھ اتنی معصوموں کی زندگی چھینتے ہوئے رحم کیوں نہیں آیا تھا یا پھر ہو سکتا ہے آیا ہوا اور وہ بھی ایک لمحے کو رویا ہو۔۔۔ یا پھر شاید فرشتے کو رحم آیا ہو لیکن انسانوں کو بدلکل نہیں آتا۔

مثاہ وہی بیٹھ گئی، مانگوں سے کسی نے جان نکال لی تھی اور روح جسم کے پیچھے میں قید تھی۔ وہ تو رو بھی نہیں رہی تھی یا پھر اسکے آنسو بالکل ہی خشک ہو گئے تھے۔ وہ ہری طرح کاٹ رہی تھی بالکل ایسے

اور شاہدہ آنکھیں بند کر کے صرف سو گھ کر بھی بتا سکتی تھی کہ یہ اس کے فیصل کا خون ہے جسے اتنی بے دردی سے بہایا گیا۔۔۔

احسان اور شاہدہ ہسپتال گئے فیصل کے نام کی رٹ لگاتے رہے لیکن وہاں انہیں بہت سے لوگ اور بہت سے زخمی بچل گئے۔ وہ ایک ایک بستر پر گئے ایک ایک کمرہ چھان مارا بس نہیں ملا تو فیصل نہیں ملا۔۔۔

وہ وہاں سے ناامیدی میں نکل کر دوسرے ہسپتال میں گئے لیکن وہ تو وہاں بھی نہیں تھا۔ شاہدہ کا بالکل وہی حال تھا جو کسی بھی ماں کا ہو سکتا ہے۔ جسے ماں کے علاوہ دنیا کا کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا۔۔۔ احسان میرا فیصل کہاں ہے؟؟؟ فیصل کو ڈھونڈنا وہ ڈر گیا ہوگا۔ دوسرے ہسپتال میں بھی نہیں ملا انہیں تو شاہدہ تو بالکل ہی ہمت ہار گئی۔

سر آپ کو بچہ ملا؟؟؟ ایک فوجی شاہدہ کی حالت دیکھ کر گویا ہوا۔۔۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ آہستگی سے نفی میں سر ہلایا

دوسرے ہسپتال میں چیک کر لیں۔۔۔

وہاں نہیں ہے۔ احسان ضبط کی آخری حدوں پر کھڑا بس اتنا ہی کہہ سکا

آئیں سر میں آپ کو لے چلتا ہوں ہو سکتا ہے وہاں مل جائے۔۔۔ فوجی گویا ہوا

فوجی آگے اور وہ دونوں اس کے پیچھے ایک بڑے ہال نما جگہ پر گئے وہاں پر کچھ بے جان وجود سفید کپڑوں میں لپٹے تھے۔

نہیں احسان فیصل مر نہیں سکتا وہ تو مجھے کہہ رہا تھا کہ میں واپس آ کر تمہارے ساتھ خالہ کے گھر جاؤنگا۔ احسان کو فوجی کے پیچھے کمرے میں جانا دیکھ کر شاہدہ نے اسے روکا۔۔۔

وہ شاہدہ کو وہی چھوڑ کر فوجی کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ اندر چھ سات معصوم وجود تھے جن کو ابھی اپنے پیارے نہیں ملے تھے۔ احسان کے دل سے ایک گہری دعا نکلی کہ فیصل کا وجود ان میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ چاہے جہاں بھی ہو بس یہاں نہ ہو۔۔۔

فوجی نے اسے ایک چہرہ دکھایا، اس کا دل بہت دکھا وہ معصوم جانے کس وجہ سے اتنا مسکرا رہا تھا لیکن وہ فیصل نہیں تھا۔

اور دوسرے چہرے سے کپڑا ہٹاتے ہی احسان کو چند لہجوں کیلئے ایسا لگا جیسے اسکی مانگوں کے پیچھے سے کسی نے زمین چھین لی ہے اور وہ ایک خلاء میں مطلق ہو گیا ہے۔ اسے لگا زمین ڈمگ گئی ہے۔۔۔

کون کہتا ہے کہ دل سے مانگی گئی ساری دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو فیصل اسے کہیں بھی مل

سکتا تھا لیکن یہاں نامتا اور اس وقت سے زیادہ کس وقت دل سے دعا نکلتی گی۔
وہ چہرے پر خون کے چھینٹے لیے مسکراتا بچہ فیصل ہی تھا۔ وہ تو اب بھی مسکراتا رہا تھا لیکن احسان ڈھسے گیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے زلزلے میں بڑی بڑی عمارتیں بنیادوں تک ڈھسے جاتی ہیں۔ اب آنسوؤں پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس نے فیصل کو ہلانے کی کوشش کی جانے کس امید پر؟؟ لیکن جانے والے واپس لوٹ کر کب آتے ہیں۔۔۔

اس نے واپسی کیلئے قدم بڑھا دیے لیکن پھر رک گیا۔۔۔
صاحب اسے کیسے بتاؤنگا جس سے یہ وعدہ کر آیا تھا کہ واپس آ کر اس کے ساتھ خالہ کی عیادت کو جائے گا۔ وہ تو اسکے آنے کے انتظار میں ہے۔ اس نے بھیگی آواز میں ساتھ کھڑے فوجی سے پوچھا۔
فوجی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر سہارا دیا اور اسے کمرے سے باہر لایا۔۔۔
احسان کہاں ہے میرا فیصل؟؟؟؟

شاہدہ جواتنی دیر سے نقاہت کی وجہ سے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی ایکدم سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اسکے پاس آئی۔۔۔۔

شاہدہ ہمارا فیصل نہیں رہا۔ وہ تیرے ساتھ اب کبھی نہیں جاسکتا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔

اور شاہدہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔۔۔ اپنے تاریک ہوتے ذہن کیساتھ

پچھو ماما کہاں ہیں؟؟؟ طوبیٰ نے گھر پہنچ کر اپنی پچھو کو گھر میں دیکھ کر پوچھا
ماما کہیں گئی ہوئی ہیں بیٹا تھوڑی دیر میں آئیں گی۔۔۔ رضوانہ نے اسے مطمئن کیا۔
لیکن آج تو ہم جلدی آئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں ٹیچر نے ہمیں کہا کہ جلدی سے گھر چلے جاؤ سب۔۔۔ وہ اسکے پاس بیٹھ گئی تھی
ہاں بیٹا ٹیچر کو کوئی ضروری کام پیش آیا ہوگا۔۔۔

بیٹا تم لوگ یونیفارم بدل لو میں تم دونوں کے کھانے کیلئے کچھ بناتی ہوں۔ وہ اٹھ گئی اور پکتن میں جا کر پہلے چھوٹی فضا کیلئے دودھ گرم کیا اور پھر طوبیٰ اور حبا کیلئے نوڈلز بنانے لگی۔ اندر سے وہ بھی اپنا دل کھائے جا رہی تھی لیکن بچیوں کے سامنے فی وی بھی نہیں کھول سکتی تھی۔
پچھو آپ کب آئی ہیں؟؟ طوبیٰ اسکے پیچھے کچن میں آئی۔۔۔

صبح ہی صبح میرا دل کیا کہ میں اپنی شہزادیوں سے مل لوں تو میں آگئی۔ اس نے پیار سے کہا

اسے تو خاور نے فون کر کے بلایا تھا جب انہیں عمران کے سکول پر حملے کی اطلاع ملی اور طوبیٰ اور حباء تو سکول میں تھی لیکن فضا گھر پر ہی تھی۔ اسے ماما تو ساتھ لے جایا جاسکتا تھا اور ماما ہی اکیلے چھوڑا جاسکتا تھا اور ماما ہی وہ شہینہ کو گھر میں چھوڑ سکتا تھا کیوں کہ وہ حالات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ اگر اسے گھر پر چھوڑ دیا تو اسکی واپسی تک وہ جی نہیں پائے گی۔ عمران ان دونوں کو جان سے بھی پیارا تھا۔

ہمیں بھی آپ بہت یاد آتی ہیں پچھو۔۔۔

تو پھر آتے کیوں نہیں ہو پچھو سے ملنے؟؟؟ وہ نوڈلز بناتے ہوئے بولی
آتے تو ہیں پچھو۔۔۔

بہت دنوں بعد آتے ہو۔ پاپا سے کہا کرو کہ جلدی جلدی لایا کرے تم لوگوں کو پچھو سے ملوانے۔ وہ اسکے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے بولی۔۔

ٹھیک ہے پچھو آج عمی آئے گا تو پاپا سے کہہ دے گا اور پھر پاپا مان بھی جائیں گے۔ وہ شوق سے ابلتے نوڈلز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

عمی کے مام پر رضوانہ کے دل کو ایک جھٹکا لگا۔ پتا نہیں کیا حال ہوگا ہم سب کے عمی کا۔۔

کیوں پاپا تمہاری بات نہیں مانتے کیا؟؟؟ وہ بمشکل بولی

مانتے ہیں لیکن عمی بڑا ہے ماما پچھو تو ماما اور پاپا اسکی بات زیادہ مانتے ہیں۔ وہ معصومیت سے بولی اور رضوانہ کی آنکھیں نم ہو گئی۔۔

اس نے کیتلی چو۔ لمبے سے اٹھا دی اور قصداً منہ دوسری طرف کر کے نوڈلز باؤل میں ڈالنے لگی تاکہ وہ بچی اسکی آنکھوں کے بھیسے ہوئے گوشے نہ دیکھ لے۔۔

یہ لوہیا۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور جب ٹھنڈے ہو جائیں تو حباء کے ساتھ کھا لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ بچیاں کمرے میں چلی جائیں تاکہ وہ اپنے بھائی کو فون کر دے یا پھر ٹی وی آن کر کے دیکھ لے۔

پچھو یہی بیٹھ کر کھاتے ہیں ماما۔۔۔ وہ اسکی زمین سے بے خبر اسکے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔

نہیں بیٹا میں تھک گئی ہوں کچھ دیر لیٹ جاتی ہوں لاؤنج میں اور فضا کو بھی دودھ پلا دیتی ہوں تم اور حباء روم میں جا کر کھا لو۔ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی

پچھو جب ہم کھالیں گے تو پھر آپ کھیلیں گی ماما ہمارے ساتھ؟؟؟

ہاں بیٹا کھا کر آ جاؤ پھر کھیلتے ہیں۔۔۔ وہ تھوڑی دیر کیلئے ہی سہی لیکن بچیوں کو بھیجنا چاہتی تھی۔۔

اور وہ دونوں نوڈلز کا باؤل اٹھائے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے جلدی سے فون اٹھا کر خاور کا نمبر ڈائل کیا لیکن بند تھا، دوبارہ ڈائل کیا پھر بھی بند تھا۔ اس نے شمیمہ کا نمبر ملا یا لیکن وہ بھی بند تھا۔ اسے بہت فکر ہوئی۔ جانے وہ دونوں کہاں ہیں اور عمران کس حال میں ہوگا۔ اس نے اپنے شوہر کا نمبر ملا یا لیکن وہ بھی بند تھا۔ وہ بہت پریشان ہو گئی۔۔۔

اس نے جلدی سے فی وی آن کیا۔۔۔۔

اے پی ایس دھماکے کے بعد عمارت میں بڑے پیمانے پر امدادی کاروائیاں جاری ہیں۔ زخمیوں اور جاں بحق ہونے والوں کو ہسپتال منتقل کیا جا رہا ہے۔ شہر کے سارے ہسپتالوں میں ایمر جنسی نافذ کر دی گئی

رپورٹروں کے حالات رپورٹ کر رہی تھی اور رضوانہ کی سو فی ایک لفظ 'جاں بحق' پر انک گئی تھی۔۔۔

اس نے دوبارہ سے سارے نمبر ڈائل کیے لیکن جواب پھر بھی وہی تھا۔

اتنے میں اس کا شوہر ضیاء بھی آ گیا۔ وہ بھی پریشان لگ رہا تھا۔ ضیاء رضوانہ اور خاور کا ماموں زاد بھی تھا اور انکی خاور سے بہت بچپن کی دوستی تھی۔ رضوانہ اور انکی سٹا دی کو ابھی ایک سال ہوا تھا اور رضوانہ کی خاور کے بچوں سے انتہائی محبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اسکے ہاتھوں میں ہی پلے تھے۔

کچھ پتا چلا؟؟؟؟ اس نے آتے ہی پوچھا

نہیں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں فون کر رہی ہوں لیکن نہیں مل رہا اور میں آپ کو بھی فون کر رہی تھی لیکن آپ کا نمبر بھی بند ہے۔۔۔ پریشانی رضوانہ کے چہرے سے عیاں تھی میرا نمبر بند ہے؟؟؟ اس نے حیران ہوتے ہوئے فون نکالا۔۔۔ اوہ خدایا۔۔۔۔۔ سنگنز بالکل بند ہیں۔

اب کیا ہوگا ضیاء؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انکی آنکھیں ابھی برسنا شروع کر رہی تھیں۔

بچیاں کہاں ہیں؟؟؟

اند ر کمرے میں ہیں۔ میں نے کھانا دیا ہے۔۔۔

اچھا تم پریشان نا ہو اور بچیوں کا خیال رکھو میں جاتا ہوں خاور بھائی کے پیچھے۔ وہ واپس مڑا لیکن آپ جائیں گے کہاں؟؟ انکا تو کچھ پتا بھی نہیں ہے اور وہاں تو اتنا زیادہ رش ہے۔ وہ فی وی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ضیاء نے بھی وہیں دیکھا۔

ہاں ہے تو سہی لیکن کہیں ماکہیں مل ہی جائیں گے، اب ایسے بیٹھ بھی تو نہیں سکتا، جانے وہ کس حال

میں ہیں۔ ضیاء اگرچہ عمر میں خاور سے تھوڑا چھوٹا تھا لیکن دونوں کی دوستی میں بالکل بھائیوں جیسا پیار تھا
وہڑا اور دروازے سے نکل گیا۔
وہ دوبارہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

ضیاء کو گئے ہوئے اب تقریباً گھنٹہ ہو گیا تھا اور رضوانہ بچیوں کی ضد پر انکی گڑیا دیکھنے لگی اور بے دلی
سے انکے معصوم کھیل میں شریک تھی۔ اسکا دھیان سارا اسی طرف تھا کہ خاور اور شمینہ کس حال میں ہونگے
اور عمران کہاں اور کس حال میں ہوگا۔ انہی سوچوں اور فکروں کے جج میں دو بج گئے لیکن ان تینوں میں
سے کسی کا کوئی پتا نہیں تھا۔

رضوانہ نے بچیوں کو کھیلتے چھوڑ کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ اس نے عمران کی صحت اور سلامتی کیلئے بہت
دعا کی اور سجدے میں رو کر اللہ سے انکی زندگی مانگی۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے بچیوں کیلئے فرج میں
رکھا ہوا کھانا گرم کیا اور دو روٹیاں تو بے پر ڈال لیں۔ بچیاں ابھی بھی کھیل رہی تھیں۔
طوبی بیٹا ہاتھ دھو لوٹا باش کھانا بن گیا ہے۔۔

وہ دونوں ہاتھ دھو کر آئی تو وہ کھانا ٹیبل پر رکھ چکی تھی۔ اسکا دل بالکل کچھ بھی کھانے کو نہیں
کر رہا تھا لیکن طوبی کی ضد پر اسے دو چار نوالے لینے ہی پڑے۔ اسے یاد آیا کہ انکی شادی سے پہلے
عمران اسکے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا اور جب وہ ٹیبل پر بیٹھتی تو تب ہی وہ بھی کھاتا۔ اگر کبھی وہ یونیورسٹی سے
دیر سے آتی تو اس وقت تک وہ بالکل کھانا نہیں کھاتا تھا یا پھر کبھی اسکا دل نہیں کرتا ہوتا تو عمران کی
خاطر اسے کچھنا کچھ کھانا ہی پڑتا۔

تین بج چکے تھے لیکن ان میں سے کسی کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے بچیوں کو ہوم ورک کرنے
کے بہانے بٹھا دیا اور خود فون کرنے لگی۔ اس نے ضیاء کا فون ملایا اور مل بھی گیا لیکن آخری ہپ تک اس
نے ریسیو نہیں کیا۔ اس نے دوبارہ ملایا لیکن پھر بھی ریسیو نہیں ہوا۔
اس نے جلدی سے خاور بھائی کا نمبر ملایا اور وہاں بھی مل گیا۔

ہیلو بھائی۔۔ کہاں ہیں آپ؟ عی کہاں ہے؟؟ سب ٹھیک تو ہے؟؟؟ فون ریسیو ہوتے ہی اس
نے بے حد جلدی میں سارے سوالات ایک ساتھ ہی پوچھ لیے
فون کے اس طرف سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔۔۔

بھائی کیا ہوا؟؟ سب ٹھیک تو ہے؟؟؟

کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے گڑیا، اب کبھی بھی کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولے

کیا ہوا بھائی عی نہیں ملا آپ کو؟ اب آنسو انکی آنکھوں سے بھی بہنے لگے تھے
مل گیا ہے گڑیا مل گیا ہے اور ہم اسے لے کر ہی آرہے ہیں لیکن اب بس آخری بار دیکھنے کے لیے
لا رہے ہیں اسے۔۔۔

بھائی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟؟ وہ باقاعدہ چیخی۔
عی نہیں رہا گڑیا۔ تمہارا عی اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ وہ سسکیوں سے رو رہے تھے۔
فون اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔۔۔۔۔

جب دیوانوں کی طرح اس نے سکول کا ہر کونا چھان مارا تو وہی بیٹھ گیا۔ صبا اسے نہیں ملتی تھی۔
میں اگر مرونگی بھی تو آپکے ساتھ ہی مرونگی ارسل۔ اسے ایک دو دن پہلے صبا کا کہا ہوا جملہ
یا دآیا۔۔۔

صبا تم نے تو کہا تھا کہ تم صرف زندگی ہی نہیں مرنا بھی میرے ساتھ ہی چاہتی ہو۔ وہ خود سے
بولا جانے اسے اسکا کہا ہوا یا ددلا رہا تھا یا خود کو۔

اس نے ادھر سے ادھر بھاگ بھاگ کر سکول کا ایک ایک کمرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں
جانتا تھا کہ جب حملہ ہوا اس وقت وہ کس کمرے میں ہوگی۔ بچوں کے والدین تو پھر بھی یہ جانتے تھے کہ
انکے بچے اس قیامت کے وقت کہاں ہونگے لیکن وہ اس سے بھی بے خبر تھا۔ اسکے ساتھ کامران اور جنید
بھی تھے لیکن وہ ان سے بے خبر دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈتا رہا۔۔۔

انہیں بھائی۔۔۔ ہسپتال چل کر دیکھتے ہیں اگر یہاں نہیں ہیں تو ضرور ہسپتال میں ہی ہوگی۔ کامران
اسے دور سے دیکھ کر انکی طرف آیا اور اسے اٹھاتے ہوئے بولا
وہ کسی معمول کی طرح اسکے ساتھ اٹھ گیا اور ساتھ چلنے لگا۔

ہسپتال پہنچ کر ایک بار پھر وہ ہر وارڈ کے ہر بستر پر پڑے ہوئے زخمی کے پاس گیا اور اسے دیکھ
کر آیا۔ صبا وہاں بھی نہیں تھی۔۔۔

چلیں بھائی دوسرے ہسپتال میں چلتے ہیں ایک فوجی بتا رہا تھا کہ کچھ زخمی خواتین کو وہ دوسرے
ہسپتال میں لے کر گئے ہیں۔۔۔

اٹھو ارسلان۔ اب کی بار جنید نے بولا

وہ خاموش رہا۔۔۔

ارسلان اٹھو۔۔۔۔۔ پہلے سے تیز آواز میں جنید بولا۔ ارسلان ایک بار پھر اٹھ کر معمول کی طرح انکے

پیچھے چل پڑا۔ اسکی حالت دیکھ کر جنید اور کامران بہت خوف کھا رہے تھے۔ وہ رو رہا تھا اور چیخ رہا تھا تو اچھا تھا کہ پتا تو چل رہا تھا کہ وہ زندہ ہے لیکن اب ایک دم سے خاموش تھا تو ایسے لگ رہا تھا کہ زندگی ہی مر چکی ہے اسے اندر۔۔۔

بات سنیں سر۔۔۔ ایک فوجی رضا کار جو ساتھ ہی کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا نہیں روکتے ہوئے بولا۔

آپ آئیں میرے ساتھ۔۔۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ایک آپریشن تھیٹر میں لے آیا لیکن وہاں کچھ ڈاکٹر جھکے ہوئے کسی زخمی کا آپریشن کر رہے تھے۔ ارسلان کو لگا وہ زخمی صبا ہے لیکن تھوڑا قریب ہو کر دیکھنے پر وہ بچہ تھا۔ اس نے حیرانی سے فوجی کی طرف دیکھا

آؤ۔۔۔۔۔

فوجی آگے اور وہ تینوں اسکے پیچھے چلتے ہوئے اندر بنے ایک چھوٹے کمرے میں گئے جس میں کچھ سامان اور ساتھ میں ایک سفید کپڑا بچھا ہوا تھا

یہاں تو کوئی نہیں ہے۔۔ وہ فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا
سفید کپڑے میں کوئی لپٹا ہوا ہے جو زندگی سے بے گانہ ہے، جا کر دیکھ لو کہ تم جسکو ڈھونڈ رہے
ہو کہیں وہی تو نہیں ہے۔ فوجی آہستہ سے بولا

وہ مر نہیں سکتی۔۔۔ وہ کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں مر سکتی۔ سفید کپڑے میں کوئی اور ہے صبا نہیں ہے۔۔۔ سبھے
آپ۔۔۔۔۔ وہ ہر یابی انداز میں پچھتے ہوئے واپسی کیلئے مڑا

ارسلان ----- پیچھے سے فوجی نے اسکا نام پکارا
اسکے زہن میں جھماکہ ہوا۔ فوجی اسکا نام کیسے جانتا تھا۔ وہ دوبارہ فوجی کی طرف مڑا لیکن اب کی
بار اسکی نظروں میں ایک وحشت تھی۔۔۔۔۔ ایک ہولناک وحشت۔۔۔

فوجی نے قریب پڑی ایک چھوٹی سی الماری کھولی اور اس کے اندر سے کچھ نکالا۔ یہ میری الماری ہے اور میں یہاں ڈاکٹر ہوں۔ اس الماری میں میں اپنی چیزیں رکھتا ہوں لیکن جب میں اسکا پریشن کر رہا تھا تو اس نے کلائی میں یہ باندھا ہوا تھا۔ مجھے کسی نرس یا سسٹر پر بھروسہ نہیں تھا اس لیے میں نے خود یہ انکی کلائی سے اتارا اور یہاں سنبھال لیا کہ اگر وارث میری موجودگی میں ملا اور میں انہیں دیکھ یا باتو انہیں واپس کر دوں گا اور اگر نہیں ملا تو کسی غریب کو خیرات کر دوں گا۔

فوجی بولتا رہا اور ارسلان پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسکی پتیلی پر پڑے ہوئے اس بریسلٹ کو دیکھتا رہا جو اس نے اپنی شادی کی رات صبا کو تحفے میں دیا تھا اور جس پر چھوٹا چھوٹا

لکھا ہوا تھا اور جسے وہ کبھی بھی نہیں اتارتی تھی۔

اگر زندگی کے کسی مشکل اور سخت وقت میں کسی کی روح پر واز کرتی تو جنید یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ارسلان رضا کی روح اسی لمحے پر واز کر چکی ہوتی۔۔۔ وہ بے حس و حرکت بت بنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کو جنید کو ایسا لگا جیسے زندگی سے اس نے بھی ناٹھ توڑ لیا ہے۔

ارسلان --- اس نے زور سے اسے ہلایا اور وہ ایسے ہڑبڑایا جیسے بھیا نک خواب سے جاگا ہو۔
جنید اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ مرے گی بھی میرے ساتھ ہی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے
بغیر مرے گی بھی نہیں، وہ ایسے کیسے مر سکتی ہے؟؟؟؟ اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلے۔
فوجی کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ سفید کپڑے کی طرف گیا اور ایک طرف سے
ذرا سا کپڑا سر کا دیا۔

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے یہ دیکھو۔۔

اور ارسلان کی نظریں ایک بار پھر ایک ہی نقطے پر جم گئی، اسکی انگلی پر۔۔۔۔۔

انہوں نے یہ انگوٹھی نہیں اتارنے دی۔ جب وہ ہمارے پاس لائی گئی تو کافی حد تک زندگی سے دور تھی لیکن ہم نے اپریشن کیا۔ اس وقت ہم نے زیور نہیں اتارا اور پھر اپریشن کے دوران جب ان کی زندگی نہیں رہی تو اپریشن ٹیبل سے انہیں ہٹانے اور دوسرے زخمی کو لٹانے میں تھوڑا سا وقت لگ گیا۔ جب میرا دھیان گیا تو میں نے انکی کلافٹی سے یہ بریسلٹ اتارا لیکن تب تک انکا جسم سرد ہو چکا تھا اور جیسا کہ انکی روح بند مٹھی کے ساتھ پرواز کر چکی تھی تو یہ ہاتھ ایسے ہی سخت ہو گیا تھا اور میں انگوٹھی نہیں اتار سکا۔

اب آپ انتظام کر لیں انکی ڈیڈ باڈی یہاں سے لے جانے کی۔ میں جا کر اپنے اگلے مریض کے اپریشن کیلئے تیار ہونا ہوں۔ اگر آپ مائلتے تو ہم انہیں ٹرانسفر کر دیتے دوسری کچھ ڈیڈ باڈیز کے ساتھ فوجی جانے لگا۔

سر----- وہ ابھی دروازے میں ہی تھے کہ ارسلان جیسے ہوش میں آگیا اور اسے پکا کر لیا۔
وہ رک گیا۔

مجھے کیسے پہچانا آپ نے؟؟؟؟ اور مجھے یہاں کیسے لے کر آئے۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں

۱۰

مجھے جانے کی جلدی ہے لیکن اتنا بتا دوں کہ استعفیٰ دینے سے بالکل پہلے جب میں اپریشن کیلئے بالکل تیار کھڑا تھا انہوں نے بہت جلدی سے آپکا نام لیا۔ ایک بار نہیں دو بار۔ اور یہ میرے علاوہ کسی نے نہیں سنا۔ پھر جب میں نے باہر آپکے دوست سے آپکا نام سنا تو میں آپکو یہاں لایا۔ وہ جانے کیلئے مڑے۔۔۔۔۔

اور ہاں آپ نے کہا کہ انہوں نے آپکے ساتھ ہی مرنے کا وعدہ کیا تھا تو انہوں نے پورا کیا۔ ابھی میں نے دیکھ لیا ہے کہ اس بریسٹ پر آپکا نام لکھا ہوا ہے اور انگلی میں تو انہوں نے اتارنے ہی نہیں دی۔۔۔۔۔

فوجی تو یہ کہہ کر چلا گیا لیکن ارسلان رضا کی دنیا بالکل ہی ویران کر گیا تھا۔۔۔۔۔
وہ وہی پرہت بنا پتھر آئی ہوئی آنکھوں سے اس بریسٹ اور انگلی کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔
ارسلان اگر آپ نے ایسا کچھ کیا تو میں مر جاؤں گی۔۔۔۔۔ اسے یاد آیا جب وہ دوراتیں پہلے اسے فون پر تنگ کر رہا تھا کہ اسے اسلام آباد میں ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔۔۔۔۔
کیوں میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی کیا؟؟؟ ارسلان پوچھتا تھا۔
زندہ رہنا تو دور کی بات میں تو آپکے بغیر مر بھی نہیں سکتی۔۔۔۔۔ اور اسکے ساتھ وہ بہت ہنسنا تھا۔
زندہ رہنا تو دور کی بات میں تو مر بھی نہیں سکتی آپکے بغیر
اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تمہارے نام کا بریسٹ کلائی پر سجائے اور تمہاری دی ہوئی انگلی پہنے ہی اس نے جان دی ہے

اور اس نے زندگی ہارنے کے بعد بھی آنکھوں میں اتارنے دی
آوازیں اسکے دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔
اسکا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر وہ وہی فرش پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔

ہیلو۔۔۔۔۔۔۔

ہیلو۔۔۔۔۔ میجر حسن علی سپیکینگ۔۔۔۔۔

جی سر۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا

کیپٹن صارم کے گارڈین سے بات ہو سکتی ہے؟؟؟

جی میں بول رہا ہوں بتائیں صارم کہاں ہے؟؟؟ وہ عجلت میں تھے۔ ریحان گاڑی روک چکا تھا
سرا نہیں آپریشن پر بھیجا گیا تھا اور مجھے بہت افسوس ہے کہ ہمارے پاس آپکے لیے اچھی خبر نہیں

-----ہے

کیا مطلب ہے آپکا؟؟؟ انکی آواز اور لہجہ دونوں ہی بہت سخت ہو گیا۔

سفر انص کی انجام دہی میں وہ شہید ہو گئے ہیں؟؟؟

کیا؟؟؟ انہیں لگا آسمان انکے سر پر گر پڑا ہے یا پھر چانک سے دن کی روشنی میں رات

کا اندھیرا چھا گیا ہے۔۔

سراکنی ڈیڈ باڈی آپکے گھر پہنچادی جائے گی اور انہیں فوجی اعزاز کے ساتھ پرچم میں دفنایا جائے

گا۔

فون انکے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔

کیا ہوتا یا؟؟؟ بھیا ٹھیک تو ہیں نا؟؟؟ ریحان بھی تقریباً رونے لگا تھا

وہ ٹھیک نہیں ہے ریحان وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔۔۔ وہ ریحان کو گلے لگا کر دھاڑیں

مار مار کر رونے لگے۔

ریحان ہفتوں کی طرح انکا منہ دیکھتا رہا۔ ابھی صبح تو بھیا نے اسے ڈانٹا تھا دیر سے اٹھنے پر اور صبح

ہی تو اس نے وجہ کے نام پر مسکرانے پر تلک کیا تھا انہیں۔ اور ابھی دو گھنٹے ہی تو گزرے ہیں اور تاپا کہہ

رہے ہیں کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟؟؟

وہ تھوڑی دیر انکے پاس بیٹھی رہی لیکن پھر اپنے دل کی رفتار سے گھبرا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے

کمرے میں گئی تو کسی میکا کی قوت کی طرح سیدھا الماری کے پاس گئی اور وہاں پر نکالا جس میں صارم کے

دیے ہوئے پھول اس نے دو ڈبوں میں جمع کیے تھے۔ مہیمہ جو اسکی اور صارم کی محبت کی گواہ تھی نے ہی

اسے یہ ڈبے دیے تھے۔ ایک میں اس نے وہ رکھے تھے جو صارم نے خالہ کے ہاتھ دیے تھے

اور دوسرے میں وہ جو وہ خود ہر رات دروازے میں سجا کر رکھتا تھا۔ دوسرے ڈبے میں ایک چھوٹا سا نوٹ

بھی تھا جو اس نے پہلے دن لکھا تھا۔۔

ان پھولوں کو دیکھ کر اسکی آنکھیں ایک بار پھر نمکین پانی سے بھر گئیں۔ آنسو اسکی آنکھ سے گرتے

رہے اور جسکے لئے بہائے جا رہے تھے اسی کے دیے ہوئے پھول انہیں جذب کرتے رہے۔

اس نے موبائل کھولا اور اسکے نام کے میسر نکالے۔ پچھلے پندرہ دنوں سے وہ روز رات کو ایک ہی

میج کرنا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ سارے میسر ایک ہی جیسے ہیں لیکن پھر بھی اسنے وہ سب ایک ایک کر کے

کھولے اور انہیں پڑھا۔۔۔

(قنصل شفاہی)

ڈائری کے صفحوں نے اسکی آنکھوں سے گرنے والے آنسو اپنے اندر سمولے تھے۔ اس نے اگلا صفحہ پلٹایا۔

سہ میرے چارہ گر کو نوید ہو، صنف دشمنان کو خیر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
راہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا۔
بھگی آنکھوں سے اس نے اگلا منہ پلٹا۔ اس پر آج سے تین دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔

سے لو اپنا جہاں دنیا والو ہم اس دنیا کو چھوڑ چلے
جور شتے ناٹے جوڑے تھوہر شتے ناٹے چھوڑ چلے
کچھ سکھ کے سنے دیکھ چلے، کچھ دکھ کے سنے جھیل چلے
اقتدیر کی اندھی گردش نے جو کھیل کھلائے کھیل چلے۔
ہر چیز تمہاری لونا دی ہم لے کے نہیں کچھ ساتھ چلے
پھر دوش نہ دینا اے لوگوں ہم دیکھ لو خالی ہاتھ چلے
یہ راہ کیلی کتنی ہے، یاں ساتھ نا کوئی یا ر چلے
اُس پا تو جانے کیا پائیں، اس پا تو سب کچھ ہار چلے
(ساحر لدھانوی)

صارم۔۔۔۔۔ کہاں ہو تم؟؟؟ آ جاؤ پلیز۔۔۔۔۔ اس نے
رندھی ہوئی آواز میں اسے بکا را۔

اس سے آگے صفحہ خالی تھے لیکن اگر کچھ اور لکھا بھی ہوتا تو اسکی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اسکا دل کچھ عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ جانے سٹا عری میں صارم نے کیا بتانے کی کوشش کی تھی۔۔ وہ کافی دیر تک ڈائری ہاتھ میں پکڑے وہیں بیٹھی رہی جب تاپا اور ریحان کی گاڑی پورج میں رکنے کی آواز سنی۔۔

وہ بری طرح بھاگتی ہوئی پورچ میں آئی۔ اسکے پیچھے باقی تینوں عورتیں بھی آگئی۔
 سفیر بھائی کیا ہوا؟؟ صارم کہاں ہے؟؟ زبیدہ انکے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی
 وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ صارم ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔ الفاظ انکے منہ

سے نکلنے میں بہت وقت لے رہے تھے۔

آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں سفیر بھائی۔۔۔ زبیدہ انکے لہجے کی لڑکھڑاہٹ سے کھٹک گئی۔

میں سچ کہہ رہا ہوں زبیدہ۔۔۔۔۔

آپ جھوٹ بول رہے ہیں ابو۔۔۔ انکی بات کو سچ میں ٹوکتے ہوئے وہ تیز لہجے میں بولی۔

اسکے دل نے انکے جھوٹ کو نہیں مانا تھا۔ یہ دل جواتنی دیر سے اتنا بے تاب ہو رہا تھا کسی وجہ کے بغیر تو نہیں تھا۔ جانے یہ محبت کرنے والوں کے دل میں ایسا کونسا آلہ نسب ہوتا ہے جو چٹکی بھانے سے بھی پہلے محبوب کے بارے میں کہے جانے والے الفاظ کو ترازو میں تول کر اسکا فیصلہ بھی سنا دیتا ہے۔ اسکا دل بھی انکے کہے پر ایمان نہیں لایا تھا اور انکے الفاظ کو تول کر فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ سچ نہیں تھے۔

وہ کچھ لمحے ان تینوں کی طرف دیکھتے رہے اور پھر سر جھکا لیا۔۔۔۔۔

کیا ہوا ہے سفیر بھائی؟؟؟ صارم کہاں ہے؟؟؟ انہوں نے ایک بار پھر اپنے الفاظ دہرائے۔

رومی بھپا نہیں رہے امی وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے، بچوں کو بچاتے ہوئے شہید ہو گئے وہ۔

ریحان کے صبر اور ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔۔

وجہ یہ تھیں اپنانے سے پہلے ہی وہ چلے گئے۔۔۔۔۔ وہ روتے ہوئے چیخا۔

زبیدہ کو تو ریحان نے پکڑ لیا تھا لیکن اگر وہ دیوار کا سہارا مان لیتی تو اس کا گرنا یقینی تھا۔۔۔

جور شتے ماطے جوڑے تھوہر شتے ماطے چھوڑ چلے۔۔۔۔۔

سودہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا۔۔۔۔۔

۷۔ رہے گا ساتھ تیرا پیار زندگی بن کر۔۔

سے یہاں بات میری زندگی وفانا کرے

س میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا۔۔۔۔۔

زہن میں چلتی آندھی بہت ہولناک تھی اور وہما زک سی لڑکی جس نے ابھی صرف خواب دیکھنے شروع

کے تھے زمانے کی آندھی کی زد میں آ گئی تھی۔ اسکے دل کے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا کیپٹن صارم شیر علی اسے

ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔۔۔۔۔

اور اسکی زندگی نے واقعی وفا نہیں کی تھی۔

سر مجھے وجہ بھائی سے ملتا ہے۔ میرے پاس انکی ایک امانت ہے جو میں لوٹا نے آیا ہوں لیکن وہ

میں صرف انہیں ہی دے سکتا ہوں۔

آج صام کی موت کو سات دن ہو چکے تھے اور دانیال وجیہ سے ملنے آیا تھا۔ گوکہ وہ جنازے میں بھی آیا تھا اور پھر تقریباً روز ہی آتا رہا تھا لیکن ریحان اور سفیر سے ہی مل پاتا تھا۔ اور ایک بار زبیدہ سے بھی ملا۔ لیکن آج وہ وجیہ سے ملنے آیا تھا۔۔۔

لیکن بیاتم اس سے کیسے ملو گے؟؟؟ سفیر نے پوچھا

اٹکل اگر پردے کی پرالم ہے تو وہ پردہ کر لیں اور دوسری بات یہ کہ صارم صرف میرا دوست نہیں تھا میرا بھائی بھی تھا اس نا طے وجہہ۔ بھابی ساری زندگی میری بھابی رہی تھی اور اٹکل مجھے جو کہنا ہے وہ میں آج کے سامنے ہی کہنا اور دینا چاہتا ہوں۔ اُسکے لہجے میں صارم کیلئے محبت تھی۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے پیٹا۔۔ میں بات کر کے آتا ہوں۔۔ وہ اٹھ گئے

تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور انکے پیچھے وجیہ بھی ڈرامیگ روم میں داخل ہوئی۔ لائٹ گرین کلر کا سوٹ پہنے سر پر دوپٹہ لیے جھکی آنکھوں کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی لیکن بہت زیادہ سوگوار بھی۔ دانیال سلام کرنے کھڑا ہوا اور اس کے سلام کا آہستہ سے جواب دیتے ہوئے وہ بھی ابو کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

انکے درمیان کچھ لمحے خاموشی رہی۔۔۔۔۔ شاید اسلئے کہ وہ سب ہی صارم سے محبت کرتے تھے اور اس وقت وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر صارم کو ہی یاد کر رہے تھے۔۔۔

بھابی جب صارم اور میں آپریشن پر جا رہے تھے تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ دانیال اگر مجھے کچھ ہوا تو تم سے دو چیزیں وجہہ کو دے دینا۔ اس نے ایک لفافہ اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

کیا ہے اس میں؟؟؟ اس نے لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا

کھول کر دیکھ لیں بھابی اس میں ایک صارم کا یونیفارم ہے جو اس نے مجھے آپکو دینے کیلئے کہا اور دوسری اس ڈبی میں ایک انگٹھی ہے جو اس نے آپکے لیے خریدی تھی جب ہم اسلام آباد گئے تھے کچھ دنوں کیلئے۔ اسے وہاں یہ انگٹھی بہت پسند آئی تھی اور اس نے خرید لی کہ شادی کا تحفہ دے گا آپکو۔۔۔ دانیال کی آواز تھوڑی سے بھیگ گئی تھی لیکن وہ ضبط کر رہا تھا

وجہ یہ ہے کہ لفافے سے اس کا پو نیفا رم نکال لیا جو کچھ جگہوں سے جل گیا تھا۔۔

وہ وہی دیکھنے لگی۔۔۔۔۔

بھابی یہ جل اس لیے گیا ہے کہ ایک جگہ دھماکے کے بعد آگ لگ گئی اور اسے پیچھے بچوں کا ایک کلاس روم تھا جس میں موجود بچے نکل نہیں پا رہے تھے۔ صرام آگ میں کود کر چارپانچ بچوں کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوا لیکن اسی اثنا میں وہیں پر دوسرا دھماکہ ہوا اور -----

اس اور سے آگے وہ جانتی تھی۔ خاموش رہی

بھابی میں صارم کا تب سے دوست تھا جب ہم میٹرک میں ایک ہی سکول میں تھے پھر ہم نے ایف ایس سی کی اور پھر ہماری سلیکشن ایک ساتھ ہی اکیڈمی میں ہوئی۔ وہاں بھی چار سال ساتھ رہے اور اسکے بعد میری پوسٹنگ پہلے کھاریاں اور پھر تین سال پہلے یہاں ہوئی اور صارم پچھلے ایک سال سے یہاں پر تھا۔ ہم بہت پرانے دوست تھے۔ اسکے ہاتھ پر ایک جلنے کا نشان تھا اور میں نے کئی بار اس سے پوچھا کہ وہ کس شرارت کا نتیجہ تھا لیکن وہ مجھے صرف یہی بتاتا تھا کہ یہ بچپن کی محبت کی نشانی ہے اور ابھی کچھ وقت پہلے جب میں نے اسے ایک بار پھر مذاق مذاق میں دھمکی دی کہ اب اگر نہیں بتایا کہ کس شرارت کی سزا ملی تھی تو بھابی کو بتا دوں گا تو اس نے بتایا کہ آپ چونکہ اس سے تین سال چھوٹی ہیں اس لیے بچپن میں کسی موقع پر آپ کو بچاتے بچاتے وہ اپنا ہاتھ جلا بیٹھا تھا۔

دانیال بولتا رہا اور وہ صرف سن رہی تھی۔ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھی وہ۔ اسے بھی وہ سب یاد تھا۔۔۔
بھابی تب آپ کو بچاتے بچاتے وہ ہاتھ جلا بیٹھا تھا اور آج بچوں کو بچاتے خود کو جلا بیٹھا۔۔۔ آنسو دانیال کی آنکھوں سے گرے۔۔۔

دانیال بولتا جا رہا تھا اور وجہ کے اندر بہت کچھ چھپا کے سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ جواندہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے باوجود خود پر خول چڑھانے کی کوشش کر رہی تھی ایکدم سے سارا ضبط م ٹوٹ گیا اور گالوں کو وہ بھینگنے سے نہیں روک پائی۔ سر جھکائے اسکے گرنے والے آنسو اسکے گود میں پڑے صارم کے یونیفارم میں ہی جذب ہو رہے تھے۔

وہ آپ سے بہت محبت کرتا تھا بھابی اور اس سے زیادہ آپ کی عزت کرتا تھا۔ اور اسکی محبت بہت پرانی تھی۔ کم از کم میں تو نہیں جانتا اسکی ابتداء کے بارے میں۔۔۔

اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انگلی کی ڈبی کھول کر اس نے انگلی نکالی اور آہستگی سے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔ سفیر اور دانیال حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔

کیا ہوا اگر وہ خود نہیں پہنا سکے۔ اگر زندہ ہوتے تو پندرہ دن بعد وہ خود پہناتے اور چاہتے کہ میں کبھی نا اتاروں۔ میں نے پندرہ دن پہلے خود پہن لی اور اب کبھی نہیں اتاروں گی۔۔۔ آنسوؤں کے سچ اپنی انگلی میں پڑی انگلی دیکھتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اسکی مسکراہٹ سفیر کے دل پر لگ رہی تھی اور بھا۔۔۔ بچے کی یادان کی آنکھوں میں بھی آنسو لے آئی۔

یہ انگلی اسکے آفس کے دراز میں پڑی تھی اور میں جانتا تھا لیکن اس نے جانے سے پہلے مجھے تاکید کر کے بتایا کہ یہ آپ کو دے دوں۔ خدا جانے اسے کیسے آگئی تھی کہ وہ شہید ہونے والا ہے

۔۔۔ وانیال پولا

وجیر۔ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

جور شتے ماطے جوڑے تھوہر شتے ماطے چھوڑ جلیے۔۔۔

خدا جانے اسے کیسے اندازہ تھا کہ۔۔۔۔۔

اور اسکے لیے مزید وہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا، اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

صارم۔۔۔۔۔ کیوں کرتے تھے مجھے اتنا پیار جب جانا ہی تھا تو۔۔۔ اپنی محبت کی اتنی
نشا نیاں نا چھوڑ کر جاتے تو میرے لیے جیسا تھوڑا آسان ہوتا۔ تمہاری اتنی ساری نشا نیوں کے ساتھ میں
زندہ کسے رہوں گی۔۔۔۔۔

۱۔ اپنی پوری زندگی کے ساتھی آنسوؤں کے ساتھ روح کی گہرائی سے آواز آئی۔

سر ہمیں بہت افسوس ہے آپ کے بچے کو بچا نہیں پائے ہم۔۔۔۔۔۔ اور شاہنواز کی قوت سماعت بالکل پرواز کر گئی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ ارد گرد بالکل خاموشی چھا گئی ہے۔۔۔ قبر جیسی خاموشی۔ وہ ایک تک اس شخص کو دیکھتا رہا۔ کیا کہہ رہا تھا وہ شخص؟؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اسے کچھ سنائی دے رہا تھا۔

لیکن پھر اس نے عائشہ کو زمین پر بیٹھتے اور دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا۔ وہ اسے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

وہاں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ڈر گیا تھا۔۔

ہاں وہ ڈر ہی تو گیا تھا۔۔۔ شدید ڈر گیا تھا وہ۔

میجر مشا ہوا زبٹ جوا اپنی بہادری کیلئے اپنے دوستوں میں مشہور تھا آج اپنے بیٹے کی لاش اٹھانے سے ڈر گیا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ معصوم اور بے گناہوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اسی پر فخر کرتا تھا کہ اس نے آج تک کسی بے گناہ کو نقصان نہیں پہنچایا تو اسکے خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔۔۔

لیکن وہ شخص کہا کہہ کر گیا؟؟؟

وہ کہہ رہا تھا کہ کسی نے اسکے شہرہ کی جان لے لی ہے۔۔۔ کسی نے اسے مار دیا ہے۔۔۔۔۔

لیکن ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ وہند دماغ اور کھلی آنکھوں سوچنے لگا۔۔۔

عائشہ زین پر بیٹھی دھاڑیں مار رہی تھی لیکن سنا ہوا زکی آنکھوں میں تو ایک آنسو بھی نہیں تھا۔ ایک بھی نہیں۔۔۔

مٹا ہنواز رولو۔۔۔۔۔ رولو مٹا ہنواز۔۔۔۔۔ ہمارا شہر مر گیا ہے۔۔۔۔۔ عانثہ چیخی۔۔۔۔۔ لیکن وہ
ہنوز ویسا ہی رہا

مٹا ہنواز تم سن رہے ہونا؟؟؟ تم رو کیوں نہیں رہے؟؟؟ ہمارا شہر مر گیا ہے۔ مر گیا ہے
ہمارا شہر۔۔۔۔۔ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے اس کے سینے سے آگئی۔

اچانک اسے لگا کہ اس کے ارد گرد دنیا رواں ہو گئی ہے۔ اسے اپنے ارد گرد پھیلا ہوا شور سنائی دینے
لگا تھا۔ وہ لاشوں کو اٹھائے ہوئے والدین کو دیکھ رہا تھا۔۔۔

اب اسے سمجھ آ گئی تھی کہ عانثہ کیوں دھاریں مار رہی تھی۔ اس کا دل کیا کہ وہ بھی دھاڑیں مارے
لیکن وہ نہیں مار سکا۔۔۔

اس کا شہر۔۔۔۔۔

اس کا سپر مین۔۔۔۔۔

یہ وطن اگر اس کی زندگی مانگتا تو وہ بخوشی دے دیتا۔ اپنی تو اس نے زندگی وطن کے نام ہی لکھ دی
تھی لیکن اس خاک نے تو اس کی زندگی سے بڑھ کر چیز لے لی تھی اس سے۔

اور پھر میجر مٹا ہنواز ہٹ کے گالوں پر بہتے ہوئے دو آنسو گواہی دے رہے تھے کہ مٹا ہنواز جو اپنی
استقامت کیلئے مشہور تھا آج ٹوٹ چکا ہے۔ اس کا شہر قسمت نے نہیں انسانوں نے چھین لیا تھا۔ درندہ
صفت انسانوں نے جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ تو ابھی تک اپنی معصومیت میں ٹوٹے ہوئے
پھولوں تک کو پانی دیتا تھا۔

جانے کس جرم کی پانی ہے سزا یا دہشت۔۔۔

اور پھر مٹا ہنواز کے اندر سے ٹوٹے ہوئے خالی مٹا ہنواز کا دکھ دو آنسوؤں کی صورت نکلا۔

تمام تر تاریکی کے باوجود دور افق سے صبح کا سورج نمودار ہو رہا تھا۔ نتھی مٹی رو پہلی کر نہیں
اندھیرے کا راج ختم کرنے کو بے تاب نظر آ رہی تھیں۔ ابھی انہیں بہت جدوجہد کرنا تھی۔ اندھیرے
نے بالآخر ختم ہو کر رہنا ہے۔ ختم ہو کر رہے گا!

